أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾

(ابراہیم: 24)

جمالِ نقشبند

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

(ابراہیم:24)

(سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ نیریاں شریف)

— تحریر —

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکزِ تحقیق فیصل آباد

کتاب ــــ جمالِ نقشبند

تحریر ــــ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

زیرنگرانی ــــ صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری

ناشر ــــ البغداد پرنٹرز
جامعہ قادریہ رضویہ مصطفیٰ آباد سرگودھا روڈ فیصل آباد، پاکستان Ph: 0092-41-8788807
Mob: 0092-300-8660128
Email: ab_printers007@yahoo.com

سرورق ــــ عدیل الرحمٰن اطہر

کمپوزنگ ــــ سعید احمد

اشاعت ــــ اول 2012

فہرست

فہرست

فہرست

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی زندگی ایک سیل مسلسل ہے جس میں بروز کے کئی مقامات آتے ہیں، حوادث اور وقائع اس سیلِ رواں میں بار بار ارتعاش پیدا کرتے ہیں مگر یہ ارتعاش جلد یا بدیر روانی میں گم ہو جاتے ہیں لیکن بسا اوقات یہ ایسا نقش چھوڑ جاتے ہیں جو دیر پا یادوای ہوتا ہے، علماءِ نفسیات کا کہنا ہے کہ بعض اوقات ایک عمومی سا واقعہ، ایک غیر محسوس حادثہ تغیر ذات کا بنیادی جوہر بن جاتا ہے اور اس کا نقش کسی صورت مدہم نہیں ہوتا۔ اس نقش گری کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض واقعات کا مسلسل صدور بھی نقش برآب ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لمحہ گریزاں، دائمی نقشِ حیات بن جاتا ہے، ہر انسان متضاد کیفیات سے گزرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظہ اُسی کو پناہ دیتا ہے جس کی اثر آفرینی اُسے متاثر کرتی ہے وگرنہ حوادث آندھی کی طرح آتے ہیں اور بگولوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ میرے حافظہ میں بھی ایک لمحہ یوں ثبت ہے کہ گردش ماہ وسال سے بھی اُس کے ثبات میں لرزش نہیں آتی۔

24 مارچ 1979ء کی شام میرے سطحِ ذہن پر ہمیشہ ہی دمکتی رہی ہے، یہ ایک اجتماع کی شام تھی جو ایک عام سے قصبے اور کم معروف بستی رائے ونڈ میں برپا تھی۔ اہل سنت و جماعت کی ایک نمائندہ کانفرس جسے سنی کانفرس کا نام دیا گیا تھا اس بستی میں انعقاد پذیر تھی۔ دار السلام ٹوبہ کی عظیم سنی کانفرس سے حوصلہ پا کر اس کانفرس

انتساب

تصوف کے چشمہ صافی سے فیض یاب
ہونے والے ہر خوش قسمت کے نام

کا اہتمام کیا گیا تھا۔ علماء کرام ،صوفیاء عظام اور نامور اہل دانش کا رُخ رائے ونڈ کی جانب تھا۔ اہل درد وسوز کا ایک نمائندہ اجتماع تھا۔ بہر جانب علم وفضل کے چراغ روشن تھے، عوام تو ایسے مناظر کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ آج اُن کے اندر کا ایقان روشن تھا جو حال کا سہارا بھی تھا اور مستقبل کی امید بھی، لاکھوں کا اجتماع مگر ایک پُروقار نظم، جسے دیکھو سٹیج کی جانب نظریں لگائے ہوئے تھا، مجمع دم بخود تھا اور سب گوش برآواز تھے، مقررین، وطنِ عزیز کے منتخب وجود تھے اور سب کے لبوں پر ملت کا درد تھا۔ مقررین کی کثرت تھی اور وقت محدود تھا مگر سامعین کا خاموش مطالبہ تھا کہ سب کو وقت دیا جائے اسی دم درکش کیفیت میں سٹیج پر کچھ ایسا سماں تھا کہ مقررین کے انتخاب میں مشکل پیش آرہی تھی، کسی سے معذرت چاہی جارہی تھی تو کسی کو وقت کی تنگ نائے کا اسیر بنایا جارہا تھا۔ اچانک سٹیج پر ایک معمولی سا اضطراب نمودار ہوا۔ دور سے احساس ہوا کہ کسی مقرر کو وقت دینے اور دورانیہ کو محصور کرنے کا لمحہ درپیش ہے۔

یہ وقتی کشمکش فرو ہوئی تو آواز بلند ہوئی کہ اب آپ کے سامنے سرزمین کشمیر کے ایک مستند عالم اور ایک جاذب نظر صوفی تشریف لارہے ہیں۔ پیر صدیقی کا تعارف ہوا تو مائک کے سامنے ایک پربہار شخصیت نمودار ہوئی۔ نظروں کو خیرہ کرنے والی شخصیت جس کے قدوقامت سے پروقار ہونے کا احساس بکھرا۔ تاریکی میں مدہم روشنیوں میں نمودار ہونے والے مقرر کا حسن وجمال کسی دوسری روشنی کا محتاج نہ رہا، سب کی نظریں اُس چہرے پر جم گئیں اور سب اس کیفیت کا شکار ہوگئے کہ۔

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن ترے حسن بیاں تک دیکھوں

وقت صرف دس منٹ دیا گیا مگر صاحب جمال لمحوں کو بھی اسیر کر لیتے ہیں اور وقت کی طنابیں تھام لیتے ہیں ہر کوئی محو حیرت تھا کہ کس ''ابوالکلام'' کو اذنِ کلام ملا ہے، ہم لوگ جو اس نام سے نامانوس تھے۔ لفظ لفظ پر توجہ دینے لگے۔ میں ذاتی طور پر سراپا حیرت اور ہمہ تن گوش تھا کہ نحمدہ ونصلی کے پاکیزہ کلمات کان میں پڑے۔ لفظ کیا تھے امرت تھا کہ سماعتوں کو گرما رہا تھا، آواز میں سوز تھا اور کلمات میں سرایت کرتا ہوا جذب، مختصر گفتگو تھی مگر طوالت کی ساری خصوصیات سے مملو تھی، اس قدر اثر آفرین خطبہ کہ سماعت بھی چٹخارے لینے لگی تھی، ہر کلمہ برمحل، ہر جملہ مربوط اور ہر خیال روشنی کا پیغام، اجنبیت کے باوجود اپنائیت کا گداز، پہلی بار سننے کے باوجود طویل مانوسیت کا مظہر کلام، ایک احساس تفاخر پیدا ہوا کہ ہمارے بزرگ ایسے بھی ہیں جن کا لفظ لفظ شمار کرنے کے قابل ہے کسی نے خوب کہا تھا۔

اُوصِیکُمْ اَنْ تَکْتُبُوا اَنْفَاسَهٗ   اِنْ کَانَتِ الْاَنفاسُ مِمَّا تُکْتَبُ

میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ان کے انفاس بھی لکھ لیا کرو، اگر انفاس لکھنے کی استطاعت پاتے ہو۔

دس منٹ کی یہ گفتگو، مقررین کے ہجوم میں کسی خاص التفات کا باعث نہ بن سکتی تھی مگر حیرت ہے کہ ماہ وسال کی محیط گرد بھی اسے دھندلا نہیں سکی، حافظے میں مسند نشین یہ کلمات اب تک حضوری کا احساس دلاتے ہیں اور جب بھی توجہ اس حاشیۂ خیال کی طرف مڑتی ہے تو محفوظ الفاظ لو دینے لگتے ہیں، یہ لمحہ فروزاں بار بار دمک اٹھتا ہے تو وہ منظر حسین سطحِ ذہن پر تیرنے لگتا ہے۔

زمانہ اپنی چال چلتا رہا، کئی سال بیت گئے مگر تازگی کا کیف ہمیشہ طاری رہا
1996ء کا سال تھا۔ میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں شعبہ عربی کا صدر تھا، ایک صبح اپنے دفتر میں معمول کی کارگزاری میں مشغول تھا کہ ایک کرم فرما حاجی بشیر احمد النور پرنٹ والے تشریف لائے، حاجی صاحب سے دیرینہ تعلق تھا مگر وہ کبھی دفتر نہ آئے تھے اسی لئے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہی کہنے لگے کہ کچھ لمحے نکالیے ایک محفل میں چلنا ہے۔ میں نے مصروفیت کی بنا پر معذرت چاہنے کی کوشش کی مگر حاجی صاحب کا اصرار خلافِ معمول تھا۔ اس لئے ساتھ ہولیا، حاجی صاحب ڈسٹرکٹ کونسل فیصل آباد کے آفس کے لان میں لے آئے وہاں لان میں ایک سلیقے سے کرسیاں بچھی تھیں ان پر قطار در قطار ایک خاص قسم کی ٹوپیاں پہنے، جوان، بوڑھے اور چند بچے موجود تھے۔ کرسیوں کے درمیان میں راستہ تھا، جہاں سے حاجی صاحب مجھے لے کر سٹیج تک پہنچے، سٹیج پر سفید چادریں بچھی تھیں اور کھلی جگہ تھی ایک کنارے پر صرف دو کرسیاں تھیں جن میں سے ایک پر ایک بزرگ تشریف فرما تھے برّاق سالباس، پروقار انداز نشست اور چہرے پر جلال و جمال کی پرچھائیاں، پہلی نظر ہی مرعوب کرنے والی تھی میں سٹیج پر گیا تو وہ بزرگ انتہائی تپاک سے بغلگیر ہوئے۔ لباس بھی مہکا ہوا تھا اور خلوص کی بھی مہکار تھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا کہا گیا، چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سیکرٹری نے دعوتِ خطاب دی، میں اس مسحور کن ماحول میں کھڑا ہوا دس منٹ کے قریب گفتگو کی، ماضی کا خوشگوار لمحہ پھر سے تابدار ہو گیا تھا، اندر کا احساس قرب، ظاہری قربت میں ڈھل گیا تھا، ماضی و حال خوشگوار کیف میں گلے مل رہے تھے مختصر سی گفتگو کے بعد واپس کرسی پر گیا، گفتگو حیرتوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ

سامع اوّل کے میلانات و رجحانات سے بے خبری تھی مگر خوشگواری کا ہالہ معاون بنا اور چند کلمات کہہ ڈالے، اب صدر نشین کی باری تھی، مائک سنبھالا اور محو گفتگو ہوئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زبان و ادب کی ساری چاشنی در آئی تھی کوئی لفظ زائد نہ تھا صرف حرف کی حرمت کا احساس تھا ہر کلمہ نصیحت بردوش تھا کلمہ کلمہ مربوط تھا اور ایک مشن پر کاربند رہنے کی نوید سنا رہا تھا۔ احساس ہوا کہ لفظوں کا یہ سحر وقتی نہ تھا۔ مسلسل عمل تھا۔ ماضی و حال ایک ہو رہے تھے۔ مزہ دو آتشہ ہو گیا تھا۔ خطاب مختصر تھا مگر اس اختصار میں بھی تفصیل تھی۔ یہ اثر آفرینی اس خلوص کا مظہر تھی جو صداقت شعاروں کا امتیاز ہوتا ہے۔ حلاوتِ افکار کی چاشنی سے ایسا مرعوب ہوا کہ وقت کا احساس تک نہ رہا۔ ذرا سنبھلا تو اجازت کی درخواست پیش کی مگر نہائت مربیانہ انداز میں ارشاد ہوا کہ کہ چند لمحے اور ٹھہریئے کچھ وقت مانوسیت کی فضا میں گزار لیں تا کہ تعلقات باہمی کی نئی راہیں کھل جائیں۔ خلیفہ طارق جمیل جن سے پہلا تعارف وہیں ہوا تھا، کے مکان پر آنے کا حکم ہوا شائقین کا جھمگٹا تھا، دسترخوان بچھے اور لذت کام و دہن کا اہتمام ہوا، کھانے کے بعد پیر صاحب نے انکشاف کیا کہ آپ کشمیر کی ایک بلند و بالا چوٹی پر ایک عمارت تعمیر کر رہے ہیں جہاں ایک یونیورسٹی بنانا مقصود ہے تعجب ہوا کہ یونیورسٹی اور وہ بھی دور افتادہ پہاڑی پر، خوشگوار خیال محسوس ہوا۔ ایک دل پسند خواہش کا گمان گزرا مگر پیر علاؤالدین صدیقی صاحب نے بھانپ لیا کہ یہ بھی دوسروں کی طرح متردد ہے، کچھ وضاحت نہ کی۔ صرف اتنا کہا کہ ہمارے ہاں ایک درگاہ ہے جو میرے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے وہاں ہر سال عرس کی تین روزہ محفل منعقد ہوتی ہے جس میں قریب و بعید سے ہزار ہا زائرین حاضر ہوتے ہیں۔ پیر صاحب نے نہایت شفقت

سے عرس کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ چند احباب سے مشورہ کیا اور عرس میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے راستہ دشوار گزار تھا۔ پتھروں پر اس طرح چلنے کی عادت نہ تھی مگر ایک اشتیاق دامنگیر تھا ماحول کی اجنبیت بھی نمایاں تھی مگر قدم کہیں نہ رکے۔ اُس پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے جہاں سے درگاہ کو راستہ جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت دور سے دعوت نظارہ دے رہی تھی مگر قرب نظارہ بعد سفر کا ازالہ نہ کر سکا، گاڑی رکی کہ آگے راستہ پیدل چلنے والوں کا تھا۔ پتھروں پر مضطرب قدم پڑتے رہے لڑکھڑائے بھی اور تھکے بھی مگر ولولہ تازہ ہر موڑ پر حوصلہ دیتا رہا۔ آخر وہ منزل آگئی جس کے لئے بے چین تھے۔ اب سامنے وہ عمارت تھی جس کی تعمیری مقصدیت راہ نما تھی۔ سنگ تراشی کا عجوبہ نظر نواز بھی تھا اور دلگداز بھی اس خبر پر حیرت ہوئی کہ اس عمارت کے تمام خدوخال پیر صاحب کے ذوق تعمیر کے مظہر ہیں کہ وہ خود ہی نقشہ نویس تھے خود ہی انجینئر اور خود ہی تعمیر کے نگران۔ یونیورسٹی کی عمارت کے ہر گوشے سے پیر صاحب کی ذات ہویدا ہو رہی تھی۔ یہ بلند وبالا عمارت پیر صاحب کے عزم بلند کی سچی تصویر تھی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یاد آئے کہ وہ مسجد قرطبہ کے نقش ونگار سے معمار مسجد کے ذہنی خدوخال اور قلبی جذبات پڑھ رہے تھے، محسوس ہوا کہ جذبے جوان ہوں تو تراشے ہوئے پتھر سنگ تراش کی حکایت سنانے لگتے ہیں۔ عمارتوں میں جس قدر خلوص مرتسم ہو اُسی قدر زائرین کی عقیدتیں مچلنے لگتی ہیں۔

یوں بے سبب تو کوئی انہیں چومتا نہیں
کچھ تو ہے پتھروں میں خدوخال کی طرح

نیریاں شریف کا سارا چوگردہ کسی میر سپاہ کی داستان سنا رہا ہے۔ شرط صرف یہ

ہے کہ دل فطرت شناس نصیب ہو جائے۔ صاحب مزار خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے پائے ثبات کا کمال بھی دیکھا کہ وہ جب یہاں آئے ہوں گے تو تنہائیاں کاٹتی ہوں گی اب رونقیں دل لبھاتی ہیں۔ مردِ حق شناس کا قدم کتنی آبادیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پاؤں رکھتے ہیں تو سبزے سے کرن پھوٹتی ہے

عرس کی تقریبات کا آغاز ہوا۔ علماء وصوفیاء کا ہجوم تھا، دن ہو یا رات ذکر وفکر کی محفل قائم رہی۔ آخری روز التجاؤں کی قبولیت اور تمناؤں کے بھر آنے کا دن تھا پیر صاحب صدر مجلس تھے۔ صاحبزادگان، لواحقین، عزیز واقرباء کے علاوہ علماء وصوفیاء کی کثرت تھی، خطابات ہو رہے تھے کہ اچانک حکم ہوا کہ میں بھی اس تقریب سعید میں کچھ کہوں۔ کیا کہنا تھا سپاس گزاری کا اظہار کرنا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے اچھلتے ہوئے چشمہ فیض کا ذکر کرنا تھا اور روحانیت کے مرکز سے ملحق علم وفن کی پرورش کا عزم صمیم بیان کرنا تھا۔ گزارشات کے ضمن میں یہ کہہ دیا کہ خواہش ہے کہ کاش یہ تعمیری حسن، حسن سیرت کا نقش دائمی ثابت ہو۔ پیر صاحب جہاں دیدہ وجود رکھتے ہیں۔ لفظوں کی قدر وقیمت سے بھی آگاہ ہیں اور لفظ تراشنے کے جوہر سے بھی بہرہ ور ہیں یہ خواہش جو ماحول کی اثر آفرینی کا لازمی اثر تھی اُن تک پہنچی تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ خواہش کی تکمیل کے لئے اور تعمیر سیرت کے مشن کے لئے ہمیں تعاون کی ضرورت ہے ماحول ایسا روح پرور تھا کہ انکار کی گنجائش ہی نہ ہو سکی۔

پیر صاحب کا عزم جواں نت نئی راہیں تراشتا رہا رابطے استوار ہوتے گئے میلانات کا اشتراک قرب کی منزلیں آسان کرتا گیا۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں

ایک سیرت سیمینار کا پروگرام بنایا گیا وطن عزیز کے نمائندہ مقالہ نگاروں کو دعوت دی
گئی ۔ پیر صاحب کی خدمت میں بھی گزارش کی گئی کہ آپ بھی اس سیرت سیمینار
میں بطور مہمان خصوصی تشریف لائیں۔ بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ آپ نے شرکت
کی حامی بھر لی اور تشریف لائے، سیرت مطہرہ کے حوالے سے ایسی پر مغز اور پر سوز
تقریر کی کہ مقالہ نگار حضرات بھی محو حیرت رہے۔ گفتگو سے سب کو اندازہ ہو گیا کہ اس
جبّہ و قبا میں ایک پیکر علم موجود ہے جس نے علم کو صرف معلومات اکٹھی کرنے کا وسیلہ
نہیں بنایا بلکہ علم کو واردات میں ڈھالا ہے بس پھر کیا تھا رابطے مزید مضبوط ہو گئے، کبھی
کبھی فون آتا تو خوشی ہوتی کہ ایک مرد دانا کی نظر میں آ گئے ہیں 4 مارچ 1998ء کو میں
ریٹائر ہو گیا۔ پروقار تقریب میں تدریسی زندگی کے انتالیس سالہ سفر کو خیر باد کہا، رات
ہوئی کہ فون آیا۔ پیر صاحب لندن سے محو گفتگو تھے، باوقار فراغت پر مبارک باد دی
اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ صبح سے آپ ہمارے ساتھ ہیں ۔عرض کیا فیصلہ کریں گے
جواب تھا کہ فیصلہ ہو چکا، محبت سے فرمانے لگے کہ میرے مشن سے آپ متفق ہیں تو
راہیں جدا کیوں ۔ ہم مل کر علم وعمل کی دنیا میں انقلاب آفریں اقدام کریں گے بس یہ
ہوائی معاہدہ تھا جو فیصل آباد سے نیریاں شریف کے سفر کا محرک بنا، سفر یقیناً دشوار تھا
، پتھروں کی سرزمین بہت سخت جان تھی اس لئے معتبر بھی، بقول پیر صاحب پہاڑوں
کی پسلیوں پر چلنا پڑا ، ابتداء میں سفر، خدشات آشنا رہا مگر رفتہ رفتہ یہ سفر ذوق
آفریں ہو گیا اور ہم نیریاں شریف کے باسی ہو گئے۔

نیریاں شریف کا قیام ایک انوکھا تجربہ تھا، خالی عمارت کو جواں خون سے
گرمانا تھا اور راستوں کو آنے والوں کے لئے ہموار کرنا تھا۔ الحمد للہ سب مراحل

بخیر وخوبی طے ہو گئے ۔ ہائی سکول کی ابتداء ہوئی، چھٹی جماعت کا داخلہ لیا، عام تاثر یہ
تھا کہ اس قدر بلندی پر کون اپنے نونہالوں کو بھیجے گا مگر حیرت ہوئی کہ کثیر تعداد
میں درخواستیں موصول ہوئیں انتخاب کرنا پڑا ٹیسٹ لیا گیا اور ایک سو بیس طلبہ کو داخلہ
دیا گیا پھر انٹر کالج کے لئے تگ و دو ہوئی تاخیر سے مراحل شروع ہوئے تھے مگر سب
طے ہو گئے اور انٹر کالج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ایک سال میں دوسری کامیابی تھی ۔
روزِ اول سے ہی مقصود اصلی یعنی یونیورسٹی ہی اولین ہدف تھا۔ یونیورسٹی کے سلسلے میں
یو۔ جی ۔سی اسلام آباد سے منظوری مشکل مرحلہ تھا مگر بحمد اللہ بہت جلد یہ کام بھی ہو گیا
تو تب پارلیمنٹ کی منظوری درکار تھی خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام مشکلات دم توڑتی
گئیں اور دو سال سے کم عرصے میں یہ مرحلہ آیا کہ محی الدین اسلامی یونیورسٹی نیریاں
شریف آزاد کشمیر ایک چارٹرڈ یونیورسٹی تھی اور پہاڑوں کی چوٹیوں کا جھومر بن کر دعوت
نظارہ دے رہی تھی۔

محی الدین اسلامی یونیورسٹی میڈیکل کالج ایک اور منزل تھی ۔ پیر صاحب کا
عزم ، علالت ونقاہت کے باوجود جوان تھا اس لئے میرپور میں جگہ حاصل کر لی گئی وہ
کس قدر خوشگوار لمحات تھے جب سردی کے موسم میں ، تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے
ماحول میں پیر صاحب ایک قریبی پہاڑی کی چوٹی پر عزم مسلسل کی تصویر بنے بیٹھے
تھے اور ہم لوگ اندھیروں میں تعمیر کے لئے اساسی لائنیں کھینچ رہے تھے، قدرت بڑی
فیاض ہے اُس کا وعدہ ہے کہ وہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتی ، کرم دیکھئے
کہ یہ اڑھی ترچھی لکیریں جلد ہی ایک مسحور کن عمارت کی صورت میں ڈھل چکی تھیں اور
میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دور دراز سے اس دانش گاہ میں حاضر ہونے

کیلئے بے چین تھے یہ تو کشمیر کی حدود میں انجام دیئے جانے والے کارنامے تھے۔ پیر صاحب کی ہمت پاکستان کے ہر قصبے کو احاطہ فیض میں لانے لگی چک بیلی خاں سے لالہ موسیٰ تک، کراچی سے لاہور تک، گجرات سے فیصل آباد تک کون سا علاقہ اس جولاں گاہ کا حصہ نہیں بنا۔

صاحب عزم وجود کی برکات، دائروں میں بند نہیں رہتیں، پیر صاحب کی جواں ہمتی نے بیرون ملک بھی وہ کارنامے انجام دیئے جو خواب محسوس ہوتے تھے ،لندن، برلے، نوٹنگھم اور دیگر برطانوی شہروں تک یہ دست کرم دراز ہوا۔حال ہی میں دو گرلز کالجوں کا قیام سرزمین برطانیہ پر ایک عہد آفریں کارنامہ ہے جس کی وسعتیں پورے برطانیہ کو محیط ہیں۔

یہ سب کارنامے اُس صدق وخلوص کے مظاہر ہیں جو نیریاں شریف میں خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کاشت کیا تھا یہ آستانہ جلد ہی اسلاف کی عظمتوں کا امین اور متقدمین کی برکات کا مرکز بن گیا، یہاں نور علم اس طرح بیدار ہوا جیسا کہ اسلاف کے آستانوں کا امتیاز تھا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ درگاہیں ازدیادِ علم کا دائمی سرچشمہ اور حسن تربیت کا ابدی پیغام ہوتی ہیں، نیریاں شریف نے اس انحطاط آمیز دور میں اسلاف کے دستور کو زندہ کیا ہے۔چند سال نیریاں شریف میں گزارے یہ سال اب بھی میرے سطح ذہن پر اُسی طرح دمک رہے ہیں جیسے کہ وہاں قیام کے دوران روشن تھے، خیال آیا کہ کیوں نہ اُس سلسلہ ہدایت پر کچھ لکھا جائے تا کہ واضح ہوجائے کہ یہ چشمہ فیض کن راستوں سے ہوتا ہوا نیریاں شریف کی پہاڑیوں پر فیض بار ہوا۔

نیریاں شریف کا سلسلہ رشد وہدایت سلسلہ نقشبندیہ سے نسبت رکھتا ہے اور سلسلہ نقشبندیہ کی نسبت اصلی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے آپ نہ صرف یہ کہ خلیفہ اول تھے بلکہ ایمان لانے والوں میں بھی سرفہرست تھے آپ کی زندگی اتباع رسول کریم ﷺ سے عبارت تھی اور آپ کی محبت رسول ﷺ امت کے لئے ہر دور میں روشنی کا مینار ہے۔نیریاں شریف کے کارناموں کے جاننے کے لئے ضروری ہے کہ صوفیاء کے اُس گروہ کا تذکرہ کیا جائے جو نقشبندی مجددی، حبلِ متین سے وابستہ ہیں۔اصل ثابت کے تذکرے کے بعد الی السماء اٹھنے والی شاخوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔اس لئے ہم اپنی گزارشات کی ابتداء تصوف کے حوالے سے کر رہے ہیں پھر سلاسل تصوف کے مختصر تذکرے کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کا قدرے تفصیلی ذکر کریں گے اور آخر میں نیریاں شریف سے پھوٹنے والے چشمہ ہدایت کا بیان کریں گے تا کہ اس سلکِ مروارید کا تعارف بھی ہوجائے اور فیضان کے مظاہر سے قارئین کو آشنائی بھی حاصل ہوجائے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے یہ توفیق عطا فرمائے کہ تذکرہ صالحین کا حق ادا ہوجائے آمین۔

اللھم صل وسلم دائما ابدا علی حبیبک خیر الخلق کلھم

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

فیصل آباد

تصوف

انسان کی تہذیب وتربیت کا کوئی ادارہ اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اُس کے اہداف میں انسانی زندگی کی ہمہ جہتی اصلاح نہ ہو، تاریخ عالم گواہ ہے کہ بہت سی تحریکیں اٹھیں جن کا دعویٰ انسان کی بھلائی اور اُس کے معاشرتی رویوں کی اصلاح تھی مگر جب ان تحریکوں کی ہماہمی ماند پڑی تو انسانیت پہلے سے زیادہ اضطراب کا شکار تھی۔ وقتی مداوا مسلسل انحطاط کا سبب بنا اور ایسی تحریکیں قصہ پارینہ بن کر شعور کی سطح سے اتر گئیں۔ اب اُن کے تذکرے ہیں تو صرف تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے ہیں۔ خالقِ کائنات نے انسان کو یہ حقیقت سمجھادی تھی کہ زوال کیسے آتا ہے۔ اور بقا کیسے حاصل ہوتی ہے فرمایا۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ۔ (الرعد:17)

”پس جو صرف جھاگ ہو وہ رائیگاں چلا جاتا ہے اور جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہو وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔“

واضح اعلان ہے کہ جھاگ کی طرح کتنے بھی ابھرے ہوئے ہو، رائیگاں جاؤ گے کہ یہ انسانیت کے لئے کسی طور پر نفع بخش نہیں ہے۔ اور جو پتھروں میں اتر کر غائب بھی ہوجائے مگر نفع بخش ہو تو زمین میں باقی رہتا ہے۔ پیر کرم شاہ رحمۃ اللہ علیہ اس ارشادِ ربانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

”قرآن حکیم نے چودہ صدیاں پہلے تنازع للبقاء میں بقاء اصلح کا قانون (Servivel of fittest) واضح طور پر بتادیا تھا کہ اس دنیا میں وہی چیز باقی رہے گی جو مفید اور نفع بخش ہوگی اور جب بھی کوئی چیز اپنی افادیت کھو بیٹھے وہ کسی وقت کتنی عزیز اور گراں قدر کیوں نہ ہو اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔۔۔ پھر فرماتے ہیں۔

”یہی حال نظریات کا بھی ہے زندگی کے وہ کسی شعبہ سے متعلق ہوں جب تک وہ مفید نتائج پیدا کرتے رہتے ہیں وہ زندہ وسلامت رہتے ہیں اور جب وہ افادیت سے محروم ہوجاتے ہیں تو انہیں بھلادیا جاتا ہے قوموں اور افراد کے لئے بھی عروج وزوال کا یہی معیار ہے۔ 1

اس معیار پر جب تصوف کے ارتقاء اور وسعت کا جائزہ لیتے ہیں تو تاریخ کا ہر ورق پکار اٹھتا ہے کہ تصوف ہر دور میں خیر کا وسیلہ رہا ہے، عہد رسالت میں ہی اس کا میلان دکھائی دینے لگا تھا جبکہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تو اس کے مظاہر عام ہوگئے تھے مگر صحابیت کا شرف اس قدر رفیع الشان تھا کہ کوئی اور نسبت اس سے بڑھ کر نہ ہوسکتی تھی اس لئے تمام نسبتوں اور لاحقوں سے بڑھ کر شرفِ صحبت ہی کا حوالہ برقرار رہا مگر جلد ہی جب ملت کا کارواں انسانی زندگی کی ہر جہت میں رواں دواں ہوا تو تقسیم کار کا مرحلہ آیا، مقصود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ سے اُسوۂ حسنہ کی تلاش تھا، کسی نے اس وجودِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غار حرا کے تعبد سے آغاز کرتے دیکھا تو تعبد وتحنث کو راہنما بنالیا، کسی نے مسجد نبوی میں تعلیمات کا انہماک دیکھا تو درس وتدریس کو اپنا مقصود بنالیا، کسی نے میدان کارزار میں کفر وباطل کے خلاف نبرد آزما دیکھا تو مجاہدانہ زندگی

گزارنے کو راہ نجات سمجھا۔غرضیکہ وجود ایک تھا اس سے کسب فیض کا جذبہ
رکھنے والے ہر رنگ اور ہر میلان کے افراد تھے اس طرح یہ وجود مکرم مختلف وجودوں
میں منعکس ہوتا چلا گیا۔ایک کی نظر کسی وصف پر پڑی تو دوسرے کی کسی دوسرے
وصف پر، مطلوب سب کا ایک تھا اس طرح رجحانات کے اختلاف کے باوجود یک رنگی
کا سماں رہا، نہ نظریات کا تصادم رونما ہوا اور نہ اساسی اعمال کا تفاوت پیدا ہوا۔علم فقہ
کے متخصصین مسند علم پر جلوہ افروز رہے تو علم تصوف کے شناور احسان کے چشموں سے
پاکیزگی کردار کا فیضان پاتے رہے مگر یہ طریق عمل کی تقسیم امت کے افتراق کا باعث
نہ بنی، فقہ کے امام تصوف کی ضوفشانیوں سے بھی مستنیر رہے اور علم تصوف کے اکابر
علماء فقہ کے حلقوں کے سرگرم خوشہ چین رہے ایک دوسرے سے راہ یابی کے انداز
سیکھے جاتے شریعت کی بالادستی قائم رہی ہر صاحبِ نظر پر واضح تھا کہ یہ دونوں ایک ہی
راہ کے مسافر ہیں اور دونوں کی منزل ایک ہے، کہیں حاضری کا احساس ہے اور
پابندِ آداب رہنے پر اصرار ہے تو کہیں حضوری کا کیف فزوں تر ہے اس لئے آداب
حرزِ جان بن گئے ہیں، شریعت پر عمل ہر مومن کا مقصود ہے کہ یہی راہِ نجات ہے مگر
اعمال کی ادائیگی اُس وقت منزل مراد تک رسائی پاتی ہے جب وہ حضوری کا کیف اور
حاضری کا اعتماد پالیتی ہے احکام کی فرضیت کو تسلیم کرلینا اور اُس کی ادائیگی کو
وظیفہ حیات بنالینا علم فقہ کا ہدف ہے مگر اس میں باطنی گداز کی پرورش اور روحانی سرشاری
کی وقوع پذیری علم تصوف کا مقصود ہے۔اس طرح صاحبانِ نظر جان گئے تھے کہ فقہ
اور تصوف میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔اعمال کی ترتیب وترکیب علم فقہ کا دائرہ کار تھا
تو اعمال کی تہذیب و تنقیح تصوف کا میدان ہے یہ تو ممکن نہیں کہ اعمال ادا ہی نہ ہوں

اور اُن کا کیف پالیا جائے یہ تسلیم کہ دورِ انحطاط میں جب علم کی ہر شاخ خشک ہونے لگی
تو اُس دور میں تصوف کے چشمۂ صافی میں بھی گدلاہٹ کے آثار رونما ہونے لگے،
کچھ دعویداران تصوف روحانیت سے دور ہوگئے اور اس کے سراب میں گم ہوگئے، یہ
بے ہمت اور کاہل لوگ تھے جن کے ہاں اعمال کی ضرورت وحتمیت سے انکار ہونے
لگا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یونانی، ہندی غرضیکہ سب عجمی خیالات نے دراندازی
کا موقعہ پایا اور بہت سے گروہ وجود میں آئے جو صوفیاء کے مقدس قافلے میں شامل
ہونے کا دعویٰ کرتے رہے جس سے ایک حد تک انتشار ذہن وعمل کا اضطراب پیدا ہوا
مگر مقامِ اطمینان ہے کہ صوفیاء باصفا نے اپنے عملی اقدامات سے بلکہ اپنی بیش بہا
نگارشات سے اس فتنہ ملفوف کا سد باب کر دیا انہیں صوفیاء باتمکین کی کاوشوں کا نتیجہ
ہے کہ تصوف آج بھی اپنے رُخِ تاباں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ایک تسلیم شدہ موثر
قوت ہے یہ تسلیم کہ ذہنی الجھاؤ عملی بے راہ روی اور ذاتی رویوں کا ایک سیلاب
امڈ آیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سارا خروش "اصل ثابت" سے پیوستگی کو متزلزل نہ
کرسکا اس اعتماد اور ایقان کا مرکز وہ وجود گرامی تھا جس کا یہ سب فیضان تھا کہ تصوف
کی یہ سب مختلف ندیاں اُسی بحر کرم کا صدقہ ہے۔اُسی شجر طیب کی شاخیں ہیں اسی
لئے تو ہر شاخ اسی سے پیوستگی کا دم بھرتی ہے غور کیجئے یہ شجرہ تصوف کس نسبت کا اعلان
کر رہا ہے معترضین سوال کرتے ہیں کہ شجرہ کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی سند کیا ہے؟ یہ
سوالات یقیناً ہر دور میں وارد ہوتے رہے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس روایت نے نسل در نسل
نسبت کی توانائی کو فروغ دیا ہے، اصل تو ایک ہی ہے اور وہ اس نبی آفاق ﷺ کی
مرکزیت اور اولیت ہے۔اسی نے ان سلاسل کو مربوط رکھا ہے اور اسی تعلق نے راہ

یابی کا سامان بہم کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اس شجر طیب کی شاداب شاخیں قریہ قریہ بستی
بستی لہلہا رہی ہیں اور دور و نزدیک کا کوئی انسان بھی اس شجر رحمت کے فیضان سے محروم
نہیں ہے، ہر شاخ ''اصل ثابت'' کے وجود کا پتہ دیتی ہے، دراصل یہ شاخیں اتصال کا
ذریعہ ہیں کہ سب منزل کا نشان ہیں، اجمیر ہو یا کلیر، ملتان ہو یا لاہور، سرہند ہو یا دہلی
سب مدینہ منورہ کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں۔ یہی ان نشانات کا فریضہ ہے اس
لئے اگر کوئی نشان، مرکز کی طرف راہنمائی نہیں کرتا تو وہ تصوف کے سلک جواہر کا حصہ
نہیں ہے صوفیاء کرام کا یہی کارنامہ ہے کہ وہ سب کو ایک ہی منزل کے سفر پر روانہ
کرتے ہیں اور انسان کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ تصور توحید اس کی
قلب پر یوں جلوہ نما ہو پاتا ہے کہ نظریاتی مبحث، وارداتی عمل بن جاتا ہے۔

تصوف دراصل، داخل کی اصلاح، باطن کی تہذیب اور ظواہر و اعمال کی تربیت
کا کفیل ادارہ ہے، اس کے ذریعے وہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں جو مادی ہما ہمی اور
نفسیاتی میلانات کے دباؤ کی وجہ سے مضمحل ہو جاتی ہیں یہ قوتیں داخل کو توانا اور ظاہر کو
آداب آشنا بناتی ہیں، تصوف کے اعمال، طریق اصلاح اور اندازِ اخذ و ترک کے ذریعے
داخل کا ایقان، اعضاء و جوارح کے اعمال میں منعکس ہوتا ہے جس سے باطن اور ظاہر
میں یک رنگی نمودار ہوتی ہے اور انسان ایک یکسانی کا مظہر قرار پاتا ہے، اس سے وحدت
کو بھی فروغ ملتا ہے اور بہبودِ انسانی کی تحریکوں میں بھی قربت کی نمود ہوتی ہے۔

تصوف کے مخالف گروہوں نے اس طریق حیات پر بہت سے الزامات
لگائے ہیں یہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانی فکر کا تفاوت ایسا مجادلانہ ماحول
پیدا کرتا ہے اس لئے راہ مستقیم کے مسافروں کو ان معاندانہ رویوں کو درخور اعتناء

نہیں سمجھنا چاہیے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ردعمل کا فقدان معترضین کو دلیر بنا دیتا ہے۔
اعتراضات کی نوعیت کچھ یوں ہے کبھی شور مچایا جاتا ہے کہ تصوف کی اساس ہی
غیر اسلامی ہے اس لئے کہ اس کا مصدر غیر عربی اور اس کا ہیولہ یونانی ہے، کبھی یہ طعنہ
دیا جاتا ہے کہ تصوف پر ہندو ویدانت کے اثرات ہیں، کہیں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس
کے ضوابط و معمولات شریعتِ اسلامیہ کی حدود سے خارج ہیں، ان تمام اعتراضات
کے باوجود یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ تصوف اسلامی معاشرے میں فروغ پانے والی
تحریک ہے اس تحریک نے تو پوری ملت اسلامیہ کو متاثر کیا ہے۔ یہ بھی لائق اعتناء
حقیقت ہے کہ اگر تصوف غیر اسلامی تحریک ہوتی تو بڑے بڑے ائمہ مجتہدین جو
حدیث و فقہ کے امام قرار پائے تصوف کے اعمال اور اس سے تعلق پر کیوں فخر محسوس
کرتے رہے اور تصوف کے دامن میں پناہ لیتے رہے۔

تلاشِ احسن کی اس تحریک سے وابستگان کا شمار کر لیجئے۔ شریعت اسلامیہ
کے نامور محقق موجود پائیں گے صوفیاء کا کردار شہادت دے گا کہ اُن کے ہاں
فلاحِ دنیا اور نجاتِ آخرت کا معیار ہمیشہ سے ہی قرآن و سنت کی پاسداری ہے، یہ
تو تسلیم ہے کہ حقائق کی دریافت کا اسلوب قدرے مختلف رہا، یہ فرق تو محدثین
اور مفسرین میں بھی ہے مگر یہ بھی تو غور و فکر کا مقام ہے کہ ان کے ہاں اساس ایمان
کیا ہے؟ اور وہ کس اساس پر اور کس کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ صوفیاء کی
صدیوں کی تاریخ اس کا فیصلہ کر چکی ہے ہاں اگر کم علم لوگ دنیاداروں کی صحبت سے
متاثر ہو کر بھٹک گئے ہیں تو اس کی تردید چاہیے نہ کہ اس کو معیار قرار دے کر الزام
تراشی کی روش اختیار کر لینی چاہیے ایسی غلط روش اور غلط کاری کہاں نہیں ہوتی مگر اس کو

اساس بنا کر اکابر صوفیاء کرام کے کارناموں سے انکار دانش مندی کی روش نہیں ہے
تاریخ تصوف کا ورق ورق شہادت دے رہا ہے کہ صوفیاء کرام نے ہمیشہ ہی اپنے
آپ کو اس پستی سے دور رکھنے کی سعی کی ہے، پھر یہ کہ صوفیاء کے آستانوں سے تعلق
رکھنے والے کون لوگ تھے؟ کیا یہ اصحاب ایمان نہ تھے؟ ذرا تاریخ کے جھروکوں سے
ان صوفیاء کے کردار و سیرت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنے پابند آداب
بزرگ تھے، کیا حضرت داتا گنج بخش ؒ کا مشن اشاعت اسلام نہ تھا؟ برصغیر
کے کتنے لوگ تھے جو بت پرستی چھوڑ کر جادۂ توحید کے راہی بنے؟ کیا حضرت شیخ
عبدالقادر جیلانی ؒ کی تمام مساعی اسلام کی سربلندی کے لئے نہ تھی؟ کیا حضرت
مجدد الف ثانی ؒ کی تمام مساعی اسلام کی اشاعت کے لئے نہ تھی کیا ان سوالوں کا
جواب نفی میں ہو سکتا ہے؟ البتہ اگر عقل خود فریب ہو، خود پسندی کا خمار سرمست کر رہا
ہو اور ملت کی روشن تاریخ سے شخصی میلان کی وجہ سے اغماض نہ ہو تو یہ سب بے سروپا
دعوے کیے جا سکتے ہیں وگرنہ حقائق یہی ہیں کہ یہ نامور صوفیاء نہ صرف یہ کہ دین اسلام
کے سچے پیروکار تھے، دین کی اشاعت کا معتبر حوالہ بھی تھے۔ ان کی راہنمائی سے
عقیدوں کو عقیدتوں کا وقار ملا اور ان کی دستگیری سے اعمال میں حسن عمل کی نمود ہوئی اور
درجہ احسان نصیب ہوا۔

علمی دنیا کی یہ مستند روایت ہے کہ پیش کار سے ہی اُس کی پیشکش کے
بارے میں پوچھا جاتا ہے اور اصطلاحات کے استعمال میں اصطلاح وضع کرنے
والے کو بنیادی حوالہ بنایا جاتا ہے۔ تصوف کیا ہے؟ اس سے مراد کیا ہے؟ اس کی حدود
و قیود کیا ہیں؟ اور اس کے ماننے والوں پر کیا لازم ہے اور وہ کن ضوابط کے پابند

ہیں؟ یہ فیصلہ معاندین نے نہیں بلکہ صوفیاء نے کرنا ہے۔ آیئے نامور صوفیاء سے
دریافت کرتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش ؒ (م ۴۵۶ھ) دنیا کے تصوف کے امام ہیں۔
آپ نے اپنی کتاب کشف المحجوب کا ایک مکمل باب تصوف کے عنوان پر مرتب
کیا ہے۔ تصوف کے کلمہ کی مختلف وضاحتوں کے ساتھ اس مرکزی نقطہ کو مکمل وضاحت
کے ساتھ درج کیا ہے۔ مرکزی نقطہ یہ ہے کہ تصوف ''صفائے قلب'' کے حصول کی
تگ و دو ہے۔ اس وضاحت میں حضرت صدیق اکبر ؓ کا حوالہ دیا ہے فرمایا۔

''حضرت صدیق اکبر ؓ طریقت کے راہنماؤں کے امام ہیں''۔ 2

غور فرمایئے جو صوفی حضرت صدیق اکبر ؓ کو اپنا امام تسلیم کرتا ہو اُس پر
غیر اسلامی نظریات کا پیروکار ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں حضرت امام مالک ؓ کا فیصلہ قول حق ہے فرماتے ہیں۔

''جس نے علم فقہ حاصل کیے بغیر راہِ تصوف اختیار کی وہ زندیق ہوا اور جس
نے علم فقہ حاصل کیا۔ تصوف کے راستے پر نہیں چلا وہ فاسق ہوا جس نے دونوں کو جمع
کیا وہ صحیح مومن ہے۔ 3

حضرت جنید بغدادی ؒ (م 297ھ) فرماتے ہیں۔

ہمارے طریقے کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے اور ہر وہ طریق جو سنت کے
خلاف ہو مردود و باطل ہے۔ 4

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ (م 370ھ) کا ایمان ہے

''جس حقیقت کو شریعت رد فرمائے وہ حقیقت نہیں بے دینی ہے۔'' 5

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م 561ھ) فرماتے ہیں۔

''جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا ایک ہاتھ میں شریعت اور دوسرے ہاتھ میں قرآن مجید نہیں تھامتا اس کی رسائی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک نہیں ہوسکتی۔ 6

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ (م 973ھ) کا فیصلہ یہ ہے۔

''تصوف کیا ہے؟ بس احکام شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ ہے، علم تصوف چشمہٴ شریعت سے نکلی ہوئی نہر ہے''۔ 7

حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م 757ھ) کا فتویٰ یہ کہ

''مشرب پیر حجت نہیں، دلیل کتاب وسنت سے ہونی چاہیے۔'' 8

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م 1034) تو اس حوالے سے معیار ہیں کہ قدم قدم پر شریعت کی پیروی کا درس دیتے ہیں اور محاسبہٴ قیامت میں شریعت کی اولیت کے قائل ہیں آپ کا یہ خیال آپ کے مکتوبات میں جابجا دہرایا گیا ہے آپ کا عقیدہ ہے کہ

''جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے بچنا شریعت کے حکم بجالانے پر منحصر ہے'' 9

پھر فرمایا: ''جو بات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے۔ 10

اکابر صوفیاء کے ہاں اسی قسم کا رویہ ملتا ہے سچ یہ ہے کہ کوئی صوفی احکام ربانی اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انکار وانحراف یا عدم توجہی کا سوچ بھی نہیں سکتا کہ اُسی کا تو مشن ہی یہ ہے کہ امت مسلمہ کو دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کرتا رہے یہ سلسلہ ہر دور میں قائم رہا۔ تصوف کی تعلیمات نے ہر معاشرے پر خیر کے اثرات

مرتب کئے اور اصلاحِ احوال کی تحریک مسلسل اثر آفریں رہی، یہ بھی حقیقت ہے کہ صوفیاء کی ہمہ جہت مساعی اسلامی شریعت کی حدود میں حسنات کے فروغ کا سبب بنی یہ بجا کہ کبھی کبھی خلوت نشینی، معاشرے سے کٹ جانے کی ترغیب دیتی رہی مگر اس کا سدباب بھی ہر دور میں ہوا، رہبانیت معاشرتی الجھاؤ سے بچنے کی ایک صورت رہی اور بعض افراد اس کی طرف مائل بھی ہوئے۔ اس کے اثرات قرنِ اول سے ہی نمودار ہونے لگے تھے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے جذبات نمایاں ہونے لگے تھے۔ دنیا کی آلائشوں سے اجتناب کی خواہش ترکِ دنیا کی ترغیب دینے لگی تھی۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے ایسی ہی خواہش کا اظہار دربارِ رسالت میں فرمایا۔ عرض کیا۔

''یارسول اللہ! میرا دل کہتا ہے میں دنیا چھوڑ دوں، پہاڑوں پر جا کر رہبانیت اختیار کرلوں، زمین پر گھوموں، مال ودولت سے دستبردار ہوجاؤں، بیوی کو طلاق دے دوں، گوشت نہ کھاؤں اور خوشبو نہ لگاؤں''۔

ترکِ دنیا کی اس خواہش کا سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا اور معاشرتی روابط کی استواری کی تلقین کی اس ممانعت کا ہی اثر تھا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذاتی رغبت کے باوجود ایسا نہ کرسکے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ اگر تمہیں خبر ہوجائے کہ مرنے کے بعد تمہارا کیا حشر ہوگا تو تم کھانا پینا چھوڑ دو۔ اصحابِ صفہ کی پوری جماعت اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی لیکن اسلامی تعلیمات کے توازن نے کسی کو بھی حدود سے تجاوز کی راہ نہ دکھائی البتہ یہ ضرور رہا کہ حالات کی بے راہ روی نے بعض بزرگوں کو قدرے عزلت پسند بنادیا مگر یہ ترکِ دنیا سے زیادہ ترکِ معصیت کا میلان تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کے مطابق کہ۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ(سورة الصّٰفّٰت: 99) کا معاملہ تھا یہ
درحقیقت معصیت کدوں سے ہجرت تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عصرِ خیر میں ایسے لمحاتی
ردعمل کے باوجود دین متین کا معاشرتی کردار بھرپور طریقے سے قائم رہا مگر جب
سیاسی ابتری کی وجہ سے دین ودنیا کے میلانات عدم توازن کا شکار ہونے لگے تو بعض
اکابر نے مادی گرسنگی سے ہٹ کر اصلاحِ باطن کے مراکز قائم کرنے پر توجہ دی۔ مقصد
یہ تھا کہ عملی زندگی سے قدرے نفرت کے رویے کوئی بھیانک صورت اختیار نہ کرلیں
اور معاشرتی تقاضے کلیۃً نظرانداز نہ ہوجائیں۔ یہ مراکز زاویوں، خانقاہوں اور عزلت خانوں
کی صورت میں نمودار ہوئے، ان مراکز میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب وحکمت
کے ساتھ تزکیہ نفوس کا بھی اہتمام رہا تا کہ علم ظاہر کا علم باطن سے رابطہ استوار رہے،
اس طرح قوت کے مراکز دوجہتوں میں تقسیم ہوگئے، خلافت راشدہ جو دونوں جہتوں
کی جامع تھی اس جیسی جامعیت مشکل ہونے لگی، بنوامیہ اور بنوعباس کے پاس حکومت
کی باگ دوڑ تھی کہ معاشرتی وحدت قائم تھی مگر باطن کی دنیا ویران ہونے لگی تھی، اس
خلا کو پر کرنے کے لئے سلطنت باطن کی سربراہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور آپ
کے جانشینوں نے سنبھالی، اس طرح عقل کی تہذیب علماء کے ہاتھوں رہی اور دل کی
تنویر صوفیاء کی حفاظت میں رہی ان روحانی مراکز نے ملت کے وجود کو ہمیشہ توانا رکھا۔
سیاسی ابتری کے باوجود روح کے تربیت کدے آباد رہے اور پھر جی اٹھنے کا عزم سوز
دروں کی صورت میں زندہ رہا۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ اس کا بین ثبوت ہے یہ کوئی اجنبی
تحریک یا خارجی عمل نہ تھا اور نہ ہی یہ تحریک کسی دوں ہمتی کی فراریت تھی بلکہ یہ ہمہ
جہت اصلاح، ہمہ پہلو فعالیت اور سربسر اسلامی تعلیمات کی حامل جدوجہد تھی تا کہ

ملت میں قوتِ عمل زندہ رہے اور نظریاتی استحکام کی ترسیخ ہوتی رہے۔
تصوف کے متعدد سلاسل اس کارِ خیر میں پہلو بہ پہلو رواں دواں رہے،
نظروں کے تفاوت کے باوجود نظری انتشار پیدا نہ ہوا۔ تصوف کے جملہ سلاسل
اصلاح وفلاح کے نقیب رہے، محبت کی افزونی، اعتماد کی بالیدگی اور دعوت وارشاد کی
پاکیزگی ہر کہیں قائم رہی، اعمال ووظائف کا تنوع بھی موجود رہا مگر یہ صرف طریق کار
کا اختلاف تھا نظریات کا تصادم نہ تھا حتّٰی کہ قاری، عالم اور صوفی کی تقسیم بھی عملی مظاہر کے
متعدد رخ تھے مگر سلکِ وحدت ہمیشہ ہی استوار رہا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام
سے پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ آپ ایک ممتاز فقیہ تھے حالانکہ آپ ایک باکمال صوفی
بھی تھے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے پیر پیراں کا خیال آتا ہے جبکہ
آپ ممتاز عالم دین بھی تھے ایک حوالے کا معروف ہوجانا دوسرے کی نفی نہیں فرق
صرف یہ تھا کہ صاحبانِ علم جو جانتے تھے صوفیاء باتمکین وہ دیکھتے تھے۔
اس یگانگت پر مداومت کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض کوتاہ بین اس
مشن کی رفعت کا ادراک نہ کرسکے۔ اُن کی ظاہری ہیئت کے باوجود اُن کے اندر
نور یقین کی لو فروزاں نہ ہوسکی بلکہ انہوں نے مادی مفادات اور ذاتی اغراض کے زیر
اثر صوفیاء کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کی لیکن کبھی بہروپ روپ کا تقدس حاصل نہ کر
سکا اس لئے صوفیاء کرام اپنے متعلقین اور عوام الناس کو ہمیشہ ہی ایسے متصوفین سے
باخبر کرتے رہے حتّٰی کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں تک کہنا پڑا۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

ایسا ہر مشن اور ہر تحریک میں ہونا عین قرینِ قیاس ہے کہ انسانی خواہشات دخل اندازی کرتی ہیں مگر یہ اصحاب علم اور ارباب مجاہدہ کا کام ہوتا ہے کہ وہ روشنی کا چراغ روشن رکھیں اور بے راہ رویوں سے متنبہ کرتے رہیں۔ یہ اس ملت اسلامیہ کی خوش قسمتی ہے کہ ہر دور میں علماء حق اور صوفیاء باصفا موجود رہے ہیں اور امت کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں ہر دور میں ایسے صاحبانِ نظر موجود رہے ہیں جو تصوف کی پاکیزگی کی ضمانت رہے۔ ذرا چھٹی صدی ہجری تک کے زمانے پر نظر ڈالئے کہ سلطنتِ عباسیہ اپنا دورِ عروج گزار چکی ہے۔ علاقائی حکمرانوں کا دور دورہ ہے ملت کی وحدت میں انتشار پیدا ہو چکا ہے خیالات پراگندہ ہو رہے ہیں اور اعمال میں جھول آ رہا ہے پھر یونانی افکار شب خون مار رہے ہیں اور مدافعت کی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے، یہ نظریات کے الجھاؤ کا دور تھا عقائد و اعمال میں کہرام پیدا ہو رہا تھا کہ امام غزالی ؒ (م 505ھ) کا تبحر علمی قوم کی راہنمائی کرنے لگا، امام غزالی ؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ تصوف کے بے کنار دھارے کو حدود آشنا کیا، صوفیانہ رویوں کو وقار عطا ہوا۔ پابند آداب بنانے کی یوں سعی کی کہ تصوف من پسند تاویلات اور ہیجان خیز بے یقینی سے نکلا اور ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا۔ تصوف شریعت کے ضوابط میں محفوظ ہوا اور اسلامی تعلیمات اس کی راہنما بنیں، امام غزالی ؒ نے صوفیانہ افکار کی یوں راہنمائی کی کہ یہ خیالات خالصۃً دین متین کے نمائندہ بنے۔ پھر تصوف کا ذوق عام ہوا۔ اور ایک حدود آشنا بہتی ہوئی ندی کی طرح تصوف کا فیضان گھر گھر پر دستک دینے لگا، بہت سے صوفیاء کرام قریہ قریہ اور بستی بستی تصوف کی تعلیمات کی ترویج کرنے لگے۔ اس پھیلاؤ کا اثر یہ بھی

ہوا کہ مختلف سلاسل وجود میں آئے۔ حضرت داتا گنج بخش ؒ نے ایسے متعدد سلاسل کا ذکر کیا ہے۔ خیر کا یہ سفر سلسلہ در سلسلہ جاری رہا اور مرورِ زمانہ سے اس کی شناخت چار نمایاں سلسلوں میں مقید ہو گئی۔ ہر سلسلہ اپنے ذوق کے مطابق مجاہدوں کی دنیا آباد کرنے لگا اور تصوف کا بحرِ کرم فیضان کی نہروں کی صورت ہر دل کو سیراب کرنے لگا۔

ابو ہاشم کوفی ؒ (م 151ھ) سے صوفی کا لقب معروف ہوا حضرت خواجہ حسن بصری ؒ (م 110ھ) اس قافلۂ خیر کے امام قرار پائے کہ شریعت و طریقت کا ایسا سنگھم بنے کہ علماء و صوفیاء آپ کے در پر حاضری دیتے رہے۔ حضرت مالک بن دینار (م 128ھ) حضرت حبیب عجمی ؒ (م 160ھ) حضرت داؤ طائی ؒ (م 165ھ) حضرت شفیق بلخی ؒ (م 194ھ) پھر تو ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا جس میں بڑے بڑے اکابر کے نام قرطاس دوام پر رقم ہوئے ان میں چند ایک کے نام درج کئے جاتے ہیں تاکہ وسعتوں کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت خواجہ معروف کرخی ؒ (م 240ھ) حضرت حاتم اصم ؒ (م 237ھ) حضرت خواجہ سری سقطی ؒ (م 253ھ) حضرت خواجہ بایزید بسطامی ؒ (م 261ھ) جو شیخ الطائفہ بھی کہلائے، حضرت سھل تستری (م 283ھ) اور دنیائے تصوف کے صاحب علم و حکمت حضرت خواجہ جنید بغدادی ؒ (م 297ھ) اور خواجہ ممشاد علو دنیوری ؒ (م 298ھ) حضرت منصور حلاج ؒ (م 309ھ) جن کے دعویٰ انا الحق کی وجہ سے دنیائے تصوف میں ایک ہیجان برپا ہوا۔ حضرت ابو اسحق شامی ؒ (م 329ھ) جن سے سلسلہ چشتیہ کو شناخت ملی، پھر حضرت ابو القاسم القشیری ؒ (م 465ھ) آپ نہ صرف یہ کہ نامور صوفی تھے

بلکہ تصوف کے حوالے سے ایک معتبر تالیف رسالہ القشیریہ کے مولف بھی ہیں یہ سلسلہ رشد وہدایت مسلسل چلتا رہا اگرچہ بعض ادوار میں نمایاں شخصیات کی کمی محسوس کی گئی۔

حضرت داتا گنج بخش علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ (م 465ھ) پانچویں صدی ہجری کے وہ نامور بزرگ ہیں جو ترک وطن کرکے برصغیر آ گئے اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا خطۂ لاہور آج بھی ان کی نسبت سے سرفراز ہے۔ برصغیر میں داتا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات ہر دور میں یاد رکھی جائیں گی کہ آپ ایک صاحب علم صوفی تھے جو شریعت کے رموز سے بھی آگاہ تھے اور طریقت کی منزلوں سے بھی باخبر تھے داتا رحمۃ اللہ علیہ ایسا وجود ہیں جو بات کہنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں اور لفظوں کی حرمت سے بھی آشنا ہیں کشف المحجوب تصوف کی امھات الکتب میں سے ایک ایسی راہنما کتاب ہے جو ہر صاحب ایمان کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔حق یہ ہے کہ یہ کتاب مرشدِ ہجویر کے فیضان کا خوانِ نعمت ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م 515ھ) چھٹی صدی ہجری جو زوال کی صدی تھی میں مینارہ نور بن کر نمودار ہوئے۔ ریب وشک کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور امت کو پھر سے روحانی توانائی عطا کی۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ جب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے رخصت ہو رہے تھے تو انہیں دنوں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م561ھ) بغداد میں داخل ہو رہے تھے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی بلند رفعت شخصیت نے ملت اسلامیہ کی اصلاح، عقائد کی تہذیب اور اعمال کی راستی کا وہ تاریخی کردار انجام دیا جس کے اثرات پوری امت نے محسوس کئے اور آج صدیوں بعد بھی محسوس کئے جا رہے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ یہ قافلہ خیر مسلسل جادہ پیما رہا۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (م 627ھ) حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م 632ھ) جو سلسلہ سہروردیہ کے امام

قرار پائے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م 633ھ) جو سلسلہ چشتیہ کے برصغیر میں موسس تسلیم کیے گئے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م 633ھ) حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م 664ھ) حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ۔ (م 672ھ) جو ایسی مثنوی کے مصنف ہیں جس کو اہل نظر ہست قران در زبان پہلوی کا مقام دیتے ہیں جو حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی مرشد شمار ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ (م 673ھ) حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (م 678ھ) حضرت علاؤالدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ۔ (م 689ھ) حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ (م 692ھ) جو سلسلہ نقشبندیہ کے امام برحق ہیں۔ یہ دنیائے تصوف کے وہ امام ہیں جن کی منزلت ہر دور میں قائم رہی، یہی دور مسعود تھا جب تصوف کو مختلف سلاسل کی پہچان حاصل ہوئی اور تصوف کے مسائل ہر خانقاہ میں زیر بحث آئے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ وجوۃ الوجود اسی دور میں خانقاہوں اور زاویوں کی زینت بنا، صوفیانہ مسائل پر مناظرانہ روش عام ہوئی مگر یہ بھی یاد رہے کہ نظریات کے اختلاف کے باوجود شریعت مطہرہ کے احکام واسرار سب کے پیش نظر رہے اور جذب وکیف کے مظاہر بھی حدود آشنا رہے سلاسل تصوف کو کسی نامور کی نسبت سے شناخت ملی۔ شیخ ابواسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ سے چشتیہ سلسلہ معروف ہو چکا تھا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ قادریہ کا تشخص قائم ہوا حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے سہروردی نسبت قائم ہوئی تو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندیہ نے نسبت پائی۔ اسی طرح یہ چار سلاسل تصوف معروف ومقبول ہوئے اگرچہ بعد میں ان کی متعدد شاخیں بھی نمایاں ہوئیں۔ انفرادیت کو قائم

رکھنے کے لئے وظائف کا تنوع بھی پیدا ہوا حتّٰی کہ لباس تک میں شناخت قائم کر دی گئی مگر باہمی چشمک پیدا نہ ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے بعد کے ادوار میں اختلاف کا رویہ اس قدر مستحکم ہوا کہ علماء کی طرح صوفیاء کے بھی گروہ پیدا ہو گئے، سابقین کا انداز خلافت بھی مدتوں قائم رہا کہ خلافت صلاحیت کی بنیاد پر تھی مگر دورِ انحطاط میں صلاحیت پر اعتماد کمزور ہو گیا اور خاندانی پیوستگی نے فعال کردار انجام دینا شروع کر دیا۔

ان بعض قباحتوں کے باوجود تصوف کا یہ چشمۂ صافی فیض رساں رہا۔ اور متعدد صوفیاء کرام اس فیض کی کفالت کرتے رہے، ان اکابر کے بعد جن نامور صوفیاء نے برصغیر میں تقسیم حسنات کا مشن جاری رکھا ان میں دنیائے تصوف کے درخشندہ نام شامل ہیں مثلاً

حضرت بوعلی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م 724ھ) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (م 724ھ) حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م 787ھ) حضرت سید علی الھمدانی رحمۃ اللہ علیہ (م 783ھ) حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ (م 785ھ) کے نام نمایاں تر ہیں۔

ان کے بعد حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ (م 808ھ) حضرت خواجہ گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ (م 825ھ) کی خدماتِ تصوف بڑی اثر آفریں رہیں اسی دور میں حضرت مولانا عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ (م 900ھ) کے افکار ونظریات برصغیر کے تصوف کو متاثر کرتے رہے ان کے ذکر سے برصغیر کے علماء وصوفیاء کو گہری دلچسپی رہی۔ یوں محسوس ہوتا رہا کہ آپ برصغیر سے ہی متعلق ہیں۔ پھر خواجہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (م 924ھ) کا نام نمایاں ہے آپ کے بعض ملفوظات اہل علم کے ہاں مجادلوں کی بھی بنیاد بنے۔ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م 979ھ) حضرت سید موسیٰ پاک شہید رحمۃ اللہ علیہ (م 985ھ) جو

برصغیر کے عظیم محدث حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد تھے اور حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م 1142ھ) کا شہرہ عام ہوا۔ خاندانِ قادریہ کا ایک معتبر نام حضرت شاہ ابوالمعالی قادری رحمۃ اللہ علیہ (م 1024ھ) کا ہے جن کا مرقد اہل لاہور کے لئے بے پناہ کشش کا باعث ہے۔

نقشبندیہ بزرگوں میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م 1012ھ) کے بعد ان کے مرید باصفا حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م 1024ھ) کی رفعت شان کا تو سب کو اعتراف ہے آپ کا اسم گرامی اس دور کا سب سے بلند تر حوالہ ہے ایسا وجود جس سے زاویے ہی آباد نہیں ہوئے۔ مسند علم وفضل کو بھی وقار حاصل ہوا ایسا مرشد کامل جس کی ہیبت شہنشاہوں کو بھی لرزاتی رہی۔ آپکے علاوہ اس دور میں حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ (م 1045ھ) اور حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ (م 1079ھ) کا دبدبہ علمی ہر ایک سے خراج محبت وصول کرتا رہا۔ حضرت شاہ نعمت اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ جن کی پیشن گوئیاں ہر دور میں اہل دانش سے خراج وصول کرتی رہیں برصغیر کی فضاؤں میں اپنے پنجابی کلام سے دلوں کی تاروں کو لرزا دینے والے حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ (م 1103ھ) کے فیضان کا شہرہ بھی رہا۔

تصوف کی بساط وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی گئی۔ حضرت مولانا فخر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے چشتیہ سلسلہ خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ تک آیا پھر وہاں سے تونسہ شریف، سیال شریف گولڑہ شریف اور کئی دیگر آستانے آباد ہوئے۔ حضرت خواجہ نور محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ نقشبندیہ یوں پھیلا کہ علی پور سیداں، آلو بہار اور مکھڈ کے علاوہ کئی تربیت کدے آباد ہوئے حضرت مولانا شیر محمد شرق پوری رحمۃ اللہ علیہ سے کرماں والا اور کیلیاں والا آباد ہوئے اس طرح یہ سلسلہ رشد آج تک جاری ہے تقویم عقائد اور

صیانتِ کردار کے یہ مراکز پھیلتے جا رہے ہیں یہ بھی سچ ہے کہ انحطاط کا عمل بھی جاری ہے مگر یہ بھی حق ہے کہ اب بھی امیدیں انہیں آستانوں سے لگی ہوئی ہیں۔

غرضیکہ اصلاح کا یہ مشن آغازِ اسلام سے جاری ہوا اور اب تک کسی نہ کسی صورت فعال ہے یہ اعتراض کہ تصوف پر یونانی اثرات پڑے ہیں؟ ویدانت نے دخل اندازی کی ہے اور عجمی خیالات بعض آستانوں پر شب خون مارتے رہے ہیں کسی سراسیمگی کا سبب نہیں بننا چاہیے غور کیجئے ایسے بداثرات کہاں نہیں ہوتے؟ احادیث کے مجموعوں میں اگر انسانی ہاتھوں کا کارستانی مفادات کے سایوں میں اثر انداز ہوئی ہے تو کیا اس کی بنیاد پر سارا مجموعہ احادیث رد کردیا جائے اگر اس رویے کی پذیرائی ہوتی رہی تو کوئی نظریہ یا کوئی مبحث نہ بچے گا۔ حقائق کی دنیا میں باطل کی دسیسہ کاری کہاں نہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ علماء راسخین اس ملاوٹ کی نشاندہی کریں تاکہ عقائد واعمال کی طہارت قائم رہے۔ تصوف کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے صوفیاء کرام پرواجب ہے کہ وہ اپنے کردار وسیرت کی روشنی میں ان باطل نظریات کا رد پیش کریں اور تصوف کے چشمہ، صافی کو دنیاداری کے تعفن سے محفوظ کرلیں۔ ضرورت ہے کہ ان مراکز کو دین کی تنویر سے روشن تر رکھا جائے، صوفیاء پر لازم ہے کہ وہ خانقاہی نظام کو حالات کے جبر سے فرار کی پناہ گاہیں نہ بنائیں بلکہ ان میں تعمیر ملت کی جدوجہد کا آغاز کریں اور اسلاف کے نور یقین سے مادیت کے اندھیروں کا ازالہ کریں۔

الحمدللہ یہ کام سست رفتاری سے ہی سہی اب بھی جاری ہے ہمارا موضوع اسی سلسلہ ہدایت کی ایک معتبر شاخ نقشبندیہ کا تذکرہ ہے۔ مناسب ہوگا کہ کچھ گزارشات نقشبندی سلسلہ تصوف کے حوالے سے پیش کر دی جائیں تاکہ نقشبندی طریقِ فکر واضح ہو سکے۔

حوالہ جات

1 ضیاء القرآن جلد دوم ص: 483
2 کشف المحجوب، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ باب سوم تصوف
3 تحصیل التصوف فی معرفۃ الفقہ والتصوف شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص 2
4 ایضاً ص 6
5 عوارف المعارف شیخ شہاب الدین سہروردی ج 1 ص 139
6 فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانی ص 906
7 الطبقات الکبریٰ شیخ عبدالوہاب شعرانی ص 4
8 تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق احمد نظامی جلد اول ص 58
9 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب 48
10 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب 184

سلسلۂ تصوف نقشبندیہ

سلسلۂ تصوف کی ابتداء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقِ دعوت سے ہی ہوگئی تھی ہر صحابی رشد وہدایت کا وسیلہ تھا اور ہر ایک سے لاتعداد لوگ فیض پا رہے تھے مگر جو اندازِ فیض مسلسل جاری رہا اُسی کی نسبت معروف ہوئی، گردشِ زمانہ نے جن سلاسل کو دوام بخشا اُن میں سے کئی ایک تاریخ کا حصہ بنے، ان قافلہ ہائے خیر میں سے نسبتیں بقائے دوام کی حقدار قرار پائیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ایک شاخ تہذیب وصیانت کی ترویج کا ذریعہ بنی تو تین معروف شاخیں تربیت عوام کے مقاصد کی برآوری کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہوئیں، یہ چاروں شاخیں نقشبندیہ، چشتیہ قادریہ اور سہروردیہ کے ناموں سے آج تک معروف ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ تصوف کا سلسلہ ہدایت ان چاروں میں محصور ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف سلسلے چلے بعض آج تک موجود ہیں جبکہ بعض مرورِ زمانہ سے اپنا تشخص قائم نہ رکھ سکے مثلاً

حضرت احمد الرفاعی (م 1182ء) سے منسوب سلسلہ رفاعیہ

حضرت احمد یسوی (م 1166ء) سے منسوب سلسلہ یسویہ

حضرت نجم الدین کبریٰ (م 1221ء) سے منسوب سلسلہ کبرویہ

حضرت احمد البدوی (م 1276ء) سے منسوب سلسلہ بدویہ جس کے آثار ان دنوں بھی ملتے ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی (م 1273ء) سے سلسلہ مولویہ کا اجراء ہوا جو آج

تک دنیا کے بعض حصوں میں خصوصاً ترکی میں موجود ہے۔

ایک اور سلسلہ جو ماضی ایسا شکوہ تو نہیں رکھتا مگر اب تک قائم ہے اور ایک خاص طریق فکر وعمل کا داعی ہے یورپین ممالک میں اس کا فیض پوری قوت سے جاری ہے یہ سلسلہ حضرت ابوالحسن الشاذلی رحمۃ اللہ علیہ (م 1258ء) سے منسوب ہے اور تصوف کے ہر سلسلہ کے متعلقین میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

برصغیر میں جب اسلام آیا تو مختلف سلاسل تصوف بھی ساتھ آئے اور برصغیر کے ماورائیت پسند معاشرے میں خوب اشاعت پذیر ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کا معاشرہ روحانیت کے کسی نہ کسی تصور سے مرعوب تھا، ماورائیت نے مقامی آبادی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، جدلیت پسندی کے میلان نے ہر آنے والے مذہبی گروہ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی اور بہت مرتبہ کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ اسلام کی آمد پر بھی یہ حربہ آزمایا جا رہا تھا، مقامی شعور یقین رکھتا تھا کہ وہ اس مرتبہ بھی کامیاب ہوجائے گا مگر تاریخ ہند گواہ ہے کہ نہ یہاں ہندومت کی ماورائیت ورغلا سکی اور نہ جدلیت پسند بے راہ کرسکی، اس کا بنیادی سبب تو دین اسلام کی حقانیت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی وہ تابنا کی تھی جو ہر سازش کو ناکام بنارہی تھی۔ اس معاندانہ طرزِعمل اور ان فاتحانہ نتائج میں اُن صوفیاء کا بھی کردار اہم ہے جنہوں نے اس جدلیت کا پردہ چاک کیا اور ماورائیت کے تاروپور کو یوں بکھیرا کہ وہ دینِ اسلام کی روحانیت کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اس فکری جہاد میں بہت سے صوفیاء نے فعّال کردار انجام دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلسلہ ہائے تصوف دفاعِ اسلام اور ترویجِ اسلام کے جہاد میں شریک ہوئے۔ برصغیر میں مغلیہ دور کا وقائع نگار ابوالفضل اس حوالے

سے متعدد سلسلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اُس نے لکھا کہ برصغیر میں مختلف سلسلہ ہائے تصوف رواج پذیر تھے مثلاً۔

حبیبیاں، طیفوریاں، کرخیاں، سقطیاں، جنیدیاں، گازرونیاں، طوسیاں، فردوسیاں، سہروردیاں، زیدیاں، عباسیاں، ادھمیاں، ہبیریاں، چشتیاں۔1

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر کی مقامی یلغار جو ویدانت کے نام سے حملہ آور تھی، صوفیاء اس کی تباہ کاریوں کو بھانپ گئے تھے اس لئے ہر سمت اور ہر طریق سے جوابی حملہ ہوا، اس ردِّعمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی حقانیت محفوظ رہی اور اسلام کی صیانت برقرار رہی، یہ یلغار صرف برصغیر تک محدود نہ تھی پورے عالم اسلام پر اسی طرح کے حملے تھے۔ حفاظتِ دین کا فریضہ علماء کے ساتھ صوفیاء نے بھی ادا کیا اور دین پوری سالمیت کے ساتھ آج بھی سربلند اور سرخرو ہے۔ اس سلسلے میں جن چار سلاسل اولیاء نے ہمہ جہتی کارنامہ انجام دیا اور بھرپور جدوجہد کی اُن کے نام ہیں۔

سلسلہ چشتیہ

سلسلہ قادریہ

سلسلہ سہروردیہ

سلسلہ نقشبندیہ

ہمارا موضوع سخن چونکہ سلسلہ نقشبندیہ ہے اس لئے اسی سلسلے پر اپنی تحریر کو مرکوز رکھتے ہیں۔

1۔ نقشبندیہ وہ سلسلہ تصوف ہے جس کی نسبت اطاعت حضرت صدیق اکبرؓ کے واسطے سے حضور اکرم ﷺ تک ہے اس سلسلہ کو یہ منفرد شرف

حاصل ہے کہ تمام سلاسل تصوف میں یہ واحد سلسلہ ہے جو حضرت ابوبکرؓ سے انتساب رکھتا ہے۔ اسی لئے مشائخ نقشبندیہ اس واسطے پر فخر بھی کرتے ہیں اور اسے اپنا خصوصی امتیاز بھی گردانتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس دقیق مسئلہ پر نہائت احتیاط مگر پروقار انداز سے بحث کی ہے۔ انبیاء سابقین علیہم السلام سے مناسبتِ طبع رکھنے کے حوالے سے حضرت صدیق اکبرؓ کی نسبت کا میلان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بتایا ہے اور حضرت علیؓ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مناسبت کا ذکر کیا ہے اور اکثر سلسلہ ہائے ولایت کا حضرت علیؓ سے منسوب ہونے کو اسی نسبت کی وجہ قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔

''چونکہ حضرت عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں اس لئے نبوت کی جانب سے ولایت کی طرف ان میں غالب ہے حضرت امیرؓ میں بھی اس مناسبت کے باعث ولایت کی طرف غالب ہے۔''2

پھر اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہیں کہ کسی حالت اور کسی مرتبے میں ولایت نبوت سے افضل ہے۔ اس پر آپ کا تبصرہ ہے۔

''اور جنہوں نے کہا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے وہ اربابِ سکر اور اولیائے غیر مرجوع میں سے ہیں۔ جن کو کمالاتِ نبوت سے زیادہ حصہ حاصل نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ

''فقیر نے اپنے بعض رسالوں میں تحقیق کی ہے کہ نبوت ولایت سے افضل ہے اگرچہ اسی نبی کی، ولایت ہو اور یہی حق ہے اور جس نے اس کے خلاف کہا وہ مقامِ نبوت کے کمالات سے جاہل ہے''۔3

اس بنیاد پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ

"اولیاء کے تمام سلسلوں کے درمیان سلسلہ عالیہ نقشبندیہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ پس صحو کی نسبت ان میں غائب ہوگی اور ان کی دعوت اتمّ ہوگی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کمالات ان پر ظاہر ہوں گے"۔ 4

اس کا سبب بھی ایک مکتوب میں بیان کرتے ہیں۔ فرمایا

"اے برادر اس طریق کے سرحلقہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں جو انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد تحقیقی طور پر تمام بنی آدم سے افضل ہیں اور اسی اعتبار سے اس طریق کے بزرگ واروں کی عبارتوں میں آیا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ ان کی نسبت جس سے مراد حضور اور آگاہی ہے بعینہٖ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسبت اور حضور ہے"۔ 5

یہ تو نقشبندی بزرگوں کی رائے تھی جن کے امام حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

فرمایا: "ہمارا طریقہ سب طریقوں سے اقرب ہے" 6

یہ سب دعوے شکر و امتنان کے رویے ہیں ہر مرید کو اپنے طریقے کی نسبت پر فخر ہونا چاہیے کہ سب سلاسل اُس "اصل ثابت" تک رسائی کے وسیلے ہیں۔ کسی کو دعویٰ ہے کہ اُس کا راستہ زیادہ موصل ہے تو کسی کو اپنے طریقے کی نسبتوں کی استواری پر یقین ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ نسبتوں پر مکمل اعتماد اور ان سلاسل سے مضبوط پیوستگی ہی جادۂ مستقیم پر رواں دواں رہنے کی نوید ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کی نسبت عظیم ہے اور ان کے سرحلقہ وہ وجودِ گرامی ہے جس کی افضلیت و اکملیت پر تو تمام

امت کو اتفاق ہے ان کی نسبت روحانی کی یکتائی پر کاملین سلسلہ تصوف کو اعتماد ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر صوفیاء میں سے بہت رفیع الشان بزرگ ہیں جن کی علمی فضیلت اور عملی سبقت بھی سب پر عیاں ہیں فرماتے ہیں۔

"حق وصداقت کی راہ میں اگر تم صوفی بننا چاہو تو جان لو کہ صوفی ہونا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی صفت ہے۔ 7

پھر فرماتے ہیں کہ

"صفائے باطن کے لئے کچھ اصول وفروع ہیں ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو فانی سے خالی کرلے اور فرع یہ ہے کہ مکروفریب سے بھرپور دنیا سے دل کو خالی کردے یہ دونوں صفتیں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہیں اس لئے آپ طریقت کے رہنماؤں کے امام ہیں کہ آپ کا قلب مبارک اغیار سے خالی تھا"۔ 8

اس کی تائید کے لئے اُن واقعات کی طرف اشارہ کیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے وقت پیش آئے کہ اک کہرام بپا ہوا۔ ہر کوئی بے کل تھا حتّٰی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تلوار لے کر سامنے آئے کہ جس نے بھی کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوگیا میں اس کا سر قلم کردوں گا۔ اسی ہیجان خیز لمحات میں طمانیت کا روپ جس نے عطا کیا وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے، وہی واقف اسرار قرار پائے اور وہی مضطرب لمحوں میں قیادت کے اہل ٹھہرے۔ پھر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور واقعہ کا حوالہ دیا فرماتے ہیں۔

"حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دوسری شان کہ آپکا قلب مبارک دنیائے غدار سے خالی تھا، اس کی کیفیت یہ ہے کہ آپ کے پاس جتنا مال ومنال اور غلام و بردے

وغیرہ تھے سب راہ خدا میں دے کر ایک کمبل اوڑھ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو گئے
اُس وقت حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''اے صدیق تم نے اپنے گھر والوں کے لئے
کیا چھوڑا، عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ جب بندہ کا دل دنیاوی صفات سے
آزاد ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیاوی کدورتوں سے اُسے پاک وصاف کر دیتا ہے یہ
تمام صفتیں صوفی صادق کی ہیں''۔ 9

نقشبندیہ اسی اعزاز نسبت کو اپنا سرمایہ تصوف سمجھتے ہیں اور جس طرح حضرت
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا حتّٰی کہ احکام رسول ﷺ پر
خلوص ومحبت سے عمل پیرا ہونا اپنا وظیفہ حیات بنالیا، اسی اتباع کو اپنے لئے وجہ نجات
گردانتے ہیں۔

نقشبندیہ بزرگ اپنے سلسلے کے اعزازات کو باعث فخر بھی سمجھتے ہیں
اور واجب اتباع بھی، اُن کے اعزازات کی فہرست طویل ہے مثلاً اُن کا ارشاد ہے کہ
نقشبندی نسبت کا امتیاز یہ ہے کہ

وہ نسبت صدیقی رکھتی ہے جو ہمہ تن اطاعت شعار اور ہمہ جہت متبع ہونے کا
پیغام ہے۔

اُن کے ہاں اتباع رسالت ہی معیار نجات ہے ہر وہ عمل جو شریعت مطہرہ
سے انحراف کا نشان قرار پائے روکے جانے کے قابل ہے۔

اسی بنا پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ

وہ طریقہ جو اسبق، اوفق اور اسلم اور احکم، اصدق، اولیٰ، اجمل وارفع
اور اکمل ہے وہ طریقہ نقشبندیہ ہے۔ 10

مشائخ نقشبندیہ اس نسبت صدیقی پر فخر کرتے ہیں اور اپنے سلسلے کی صیانت ورفعت
کا اسی نسبت کو سبب گردانتے ہیں اس نسبت کا یہ فیضان سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ اتباع
سنت کے لئے بڑا گرم جوش ہے۔

اتباعِ سنت:

صوفیاءِ نقشبند کے ہاں شریعت ہی نجات کا ذریعہ ہے اس لئے اتباع شریعت
ہر مسلمان پر لازم ہے خواہ وہ پیر ہو یا مرید، وہ صوفیاء جو شریعت کو ریاضت کی ابتدائی
منزل خیال کرتے ہیں اور اصحاب طریقت ہونے پر فخر کرتے ہیں کہ وہ شریعت کے
حصار سے نکل گئے ہیں نقشبندیوں کے ہاں لائق التفات نہیں ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ
شریعت ہی تمام کمالات کی جامع اور آخروی نجات کی کفیل ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے
مکتوبات میں شریعت کی سرفرازی پر بہت زور دیا ہے اور شریعت سے انحراف
کو گمراہی کہا ہے۔ چند اقتباسات دیکھئے فرماتے ہیں۔

''طریق صوفیاء پر سلوک کرنے سے مقصود یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ کا جو
ایمان کی حقیقت ہیں زیادہ یقین حاصل ہو جائے اور فقہی احکام کے ادا کرنے میں
آسانی میسر ہو''۔ 11

''شریعت کے تین جزو ہیں علم وعمل واخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو متحقق
نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت حاصل ہو گئی تو گویا حق تعالیٰ کی
رضامندی حاصل ہو گئی۔

''پس طریقت وحقیقت دونوں شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی

تکمیل کے لئے شریعت کے خادم ہیں''۔ 12

اس پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ اکثر دعویدار تصوف، شریعت کے کمالات کو نہیں سمجھتے تو بھلا وہ طریقت وحقیقت کا کیا پتہ لگا سکتے ہیں فرمایا یہ لوگ۔

''شریعت کو پوست خیال کرتے ہیں اور حقیقت کو مغز جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ 13

اس وضاحت اور تفصیل کے بعد یہ کہہ کر متنبہ بھی کیا گیا کہ نجات کا دارومدار شریعت کی پیروی میں ہے اور محاسبہ اس پاسداری شریعت کا ہوگا۔ فرمایا۔

''جو بات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے۔ احوال ومواجید اور علوم ومعارف اور ارشادات ورموز اگر اس متابعت کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہتر اور زہے قسمت ورنہ سوائے خرابی اور استدراج کے کچھ نہیں۔''14۔

مزید فرمایا۔

''کل قیامت کے روز شریعت کی بات پوچھیں گے اور تصوف کی بابت کچھ نہ پوچھیں گے جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے بچنا شریعت کے حکم بجالانے پر منحصر ہے۔''15

اور آخری فیصلہ جو انتہا کی حد ہے اور نہایت جرأت کا مظاہرہ ہے۔ یہ ہے کہ

''پس صوفیاء کا جو کلام علماء اہل سنت وجماعت کے اقوال کے موافق ہے وہ قبول ہے اور جو ان اقوال کے مخالف ہے وہ مردود ونا مقبول ہے''۔ 16

اس لئے ناصحانہ انداز میں باخبر کرتے ہیں کہ صوفیاء کو ہوائے نفسانی سے کنارہ کش رہنا چاہیے اس کا طریقہ بتایا۔

''پس نفسانی خواہشوں کا دور ہونا احکام شرعی کے بجالانے پر وابستہ ہے جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور تر ہوگا کیونکہ نفس پر شریعت کے اوامر ونواہی کے بجالانے سے زیادہ دشوار کوئی چیز نہیں ہے اور صاحب شریعت کی پیروی کے سوا کسی چیز میں اس کی خرابی متصور نہیں ہے وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کریں وہ معتبر نہیں ہیں''۔ 17

نقشبندیہ کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اُن کے ہاں شریعت تمام کمالات واعزازات کی اساس ہے۔

نقشبندی طریق سلوک میں مجاہدوں اور ریاضتوں کا سارا انحصار شریعت کے حوالے سے ہے۔ وہی مجاہدہ معتبر ہے جس میں سنت رسول اکرم ﷺ کی پاسداری ہو مگر اس سے یہ قیاس کر لینا بھی خلافِ حقیقت ہے کہ عبادات واعمال، اورظائف ومجاہدات سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے بلکہ اُن کے ہاں تو شریعت کی روح کے مطابق اعمال پر دوام اختیار کیا جاتا ہے اس لئے رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل ہوتا ہے۔

3۔ عزیمت:

نقشبندیہ مشائخ کے ہاں شریعت کی پاسداری پر اصرار اُن کے رویوں میں اعمال کی کثرت اور ہر عمل میں استقامت کا محرک ہے۔ تصوف اپنے تمام تر مظاہر

میں متابعت کے اساسی نقطہ پر مرکوز رہتا ہے اعمال ہی وہ ذرائع ہیں جو روحانی ترقیوں کا ذریعہ ہیں اس لئے مشائخ نقشبند ہر حال میں عمل کی مداومت پر زور دیتے ہیں عمل بھی ایسا جس کا رشتہ اتباع رسول اکرم ﷺ سے جڑا ہوا ہو، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں بڑے واضح ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

"بزرگی سنت کی تابعداری پر وابستہ اور زیادتی شریعت کی بجا آوری پر منحصر ہے مثلاً دوپہر کا سونا جو اس تابعداری کے باعث واقع ہو کروڑ کروڑ شب بیداریوں سے جو اس تابعداری کے موافق نہ ہوں اولیٰ وافضل ہے اور ایسے ہی عید الفطر کے دن کا کھانا جس کا شریعت نے حکم دیا ہے خلاف شریعت دائمی روزہ رکھنے سے بہتر ہے، شارع رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر چیتل کا دینا اپنی خواہش سے سونے کا پہاڑ خرچ کرنے سے بزرگ تر ہے۔ 18

اعمال کی بجا آوری میں عزیمت کی راہ چلنا نقشبندی بزرگوں کے ہاں بلند تر کردار کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے شریعت نے متبعین کے مراتب اور اُن کی ہمت کا خیال رکھا ہے اور بعض اعمال میں سہولت کی خاطر رخصت عطا فرمائی ہے یہ شریعت کا معاشرتی حسن ہے اور انسان دوستی کا رویہ ہے مگر اہل عزم ان رخصتوں پر یقین رکھنے کے باوجود کوشش کرتے ہیں کہ رخصت کے بجائے عزیمت پر کاربند رہیں اور اعمال کی رفعتوں کو اپنائیں۔ نقشبندی صوفیاء کے ہاں احکام کی بجا آوری شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہے یہ نہیں کہ منصوص رخصت کو نہ اپنائیں مثلاً صلوٰۃ قصر ایک سہولت ہے مگر اس پر نص قطعی موجود ہے اس لئے سفر میں صاحبانِ عزیمت بھی قصر ہی کرتے ہیں۔ عبادات کی ادائیگی میں فراوانی ذوق سنت سے ہٹنے کی ترغیب نہیں دیتی اس التزام کی

موجودگی میں عزیمت کا ہر عمل صوفیاء نقشبند کا امتیازی نشان ہے اس حوالے سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"میرے سعادت مند بھائی، طریقہ علیہ نقشبندیہ قدس سرھم کے بزرگوں نے سنت سنیہ کو لازم پکڑا ہے اور عزیمت پر عمل اختیار کیا ہے، اگر اس التزام اور اختیار کے ساتھ ان کو احوال ومواجید سے مشرف کریں تو ان کو نعمت عظیم جانتے ہیں اور اگر احوال ومواجید اُن کو بخشیں اور اس التزام اور اختیار میں فتور معلوم کریں تو ان احوال کو پسند نہیں کرتے اور ان مواجید کو نہیں چاہتے۔ 19

4۔ اندراج النھایۃ فی البدایۃ:

بزرگانِ نقشبندیہ کا یہ اعتماد کہ راہ سلوک میں جہاں دیگر سلاسل اپنے سلوک کی آخری منزل میں پہنچتے ہیں اُن کے لئے وہ منزلِ ابتدا ہوتی ہے۔ عموی راہ سلوک کا مسافر ریاضت اور مجاہدے سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ تزکیہ کی منزل پالے اس کے لئے شیخ اپنے برادرانِ طریقت کو سخت محنت کا درس دیتا ہے۔ مختلف قسم کے مجاہدوں سے گزارتا ہے مگر نقشبندی سالک بہت جلد مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور اتنے مجاہدوں سے نہیں گزرتا، اسے عالم خلق اور عالم امر سے تعبیر کیا جاتا ہے دوسرے سلاسل کی ابتداء عالم خلق سے ہے جبکہ نقشبندی بزرگ عالم امر سے ابتداء کرنا اپنا امتیاز بتاتے ہیں، اس امتیازی خصوصیت کے حصول کا ذریعہ اُس دعا کو گردانتے ہیں جو حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے کہ آپ نے بارگاہِ صمدیت میں یہ دعا کی تھی کہ انہیں وہ طریقہ عطا فرمایا جائے جو اقرب الی المقصود یعنی مقصود تک رسائی کے لئے

قریب ترین ہو۔ دعا کی قبولیت نے آپ کو سلوک پر جذبہ کی تقدیم کا انعام دیا گیا
سلوک محنت وریاضت سے سفر طے کرتا ہے اور جذبہ شوق ومحبت میں یوں ڈوب
جاتا ہے کہ منزل سامنے آجاتی ہے۔ پس یہی امتیاز حضراتِ نقشبندیہ کے ہاں معتبر ہے،
یہ امتیاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوا کہ وہ پہلی حاضری ہی میں وہاں پہنچ گئے
جہاں امت کے دیگر افراد ریاضت اور مجاہدوں کی کثرت کے باوجود نہیں پہنچ سکتے، یہ
نسبتِ صدیقی کا فیضان ہے کہ سیر الی اللہ کی سب منزلیں یکبارگی طے کرلیں اور ثبوت
واستشہاد کی تنگناؤں سے بھی نہیں گزرے، اسی حوالے سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
کا ارشاد ہے کہ

"طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے مشائخ قدس سرہم نے برخلاف دوسرے سلسلوں
کے مشائخ کے اس سیر کی ابتداء عالم امر سے اختیار کی ہے اور عالم خلق بھی اسی سیر کے
ضمن میں طے کرلیتے ہیں، اسی واسطے طریقہ نقشبندیہ سب طریقوں سے اقرب ہے
یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی نہایت اس کی ابتداء میں مندرج ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ان بزرگوں کا طریقہ یعنہ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا طریق
ہے کیونکہ اصحاب کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حضرت سید البشر ﷺ کی پہلی ہی صحبت
میں انتہاء کی۔ ابتداء میں درج ہونے کے طریق پر وہ کچھ حاصل ہوجاتا تھا جو امت کے
کامل اولیاء کو انتہاء میں بھی حاصل ہونا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے
قاتل وحشی جو ایک ہی دفعہ حضرت خیر البشر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے
خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے جو سب تابعین سے بہتر ہیں کئی درجے افضل ہیں۔

عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا
عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ گردوغبار جو رسول اللہ ﷺ کے
ساتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں پڑا تھا عمر بن عبدالعزیز سے کئی گنا
بہتر ہے۔ 20

اسی افضلیت کا مدار صحبت پر ہے سالک اپنے پیر سے صحبت کی بدولت
عظمتوں کا راہی ہوتا ہے اسلئے اس کی تاکید بہت ہے مگر یہاں بھی حضرات نقشبند
حفظِ مراتب کو ہر اُن ملحوظ رکھتے ہیں یہی اُن کا شرف ہے مثلاً حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ حضرت
خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ ہمارا طریقہ صحبت ہے اصحاب
کرام رضی اللہ عنہم حضرت خیر البشر علی الصلوٰۃ والسلام کی صحبت ہی کی بدولت تمام اولیاء امت میں
سے افضل ہیں، کوئی ولی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا اگرچہ اویس قرنی (رحمۃ اللہ علیہ) ہی ہوں۔"21

معروف اصطلاحات:

نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں نے اپنے راہ سلوک کی وضاحت کے لئے چند
اصطلاحات وضع کی ہیں جو اس طریقے کی پہچان ہیں یہ کل گیارہ ہیں جن میں سے
آٹھ اساسی ہیں جو حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہیں اور تین بعد
میں وضع ہوئیں جو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہیں۔ اس طرح یہ
گیارہ اصطلاحات نقشبندیت کی شناخت ہیں اصطلاحات یہ ہیں چونکہ یہ کلمات اُس دور
میں ترتیب پائے جبکہ عالم اسلام پر فارسی زبان کی پذیرائی عام تھی اس لئے افادہ عوام

کے لئے راہنما اصول بھی اس زبان میں مرتب ہوئے۔

1۔ ہوش در دم:

یہ زندگی کے ہر سانس کی حفاظت کی مشق ہے کہ سانس اندر آ رہا ہو یا خارج ہو رہا ہے کسی صورت بھی غفلت طاری نہ ہو ہمیشہ باخبری رہے تا کہ ایک ایک سانس حضوری کی سرفرازی سے مزین ہو خواجگان نقشبند کے ہاں اس آنے جانے والے ''دم'' کی پاسداری سالک کے لئے ازبس ضروری ہے۔

2۔ نظر برقدم:

زندگی کے معمولات میں یوں مشغول رہنا کہ نظر قدم پر رہے یعنی نظر نیچے رہے جھکی جھکی رہے، اس سے یہ بھی مراد ہے کہ نظر ادھر اُدھر بھٹکی نہ رہے اپنے قدموں پر جمی رہے اس سے نظر کی پراگندگی دور ہوگی اور تکبر وانانیت کی کیفیت پیدا نہ ہوگی، غرور وتکبر سے چلنے والے کی نظر اٹھی رہتی ہے اس لئے ارشاد ہوا۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (سورۃ الاسراء 51)

اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔

کہ یہ عجز کے خلاف ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ آگے بڑھنے کی ہمت ہی پیدا نہ ہو اور ہمیشہ نظر قدم پر ہی رہے کہ نظر کا مقصود بھی قدم ہی ہو جائے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عمدہ وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

''نظر برقدم سے مراد یہ نہیں کہ نظر قدم سے تجاوز نہ کرے اور قدم سے زیادہ بلندی کی خواہش نہ کرے کیونکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ نظر قدم سے

بلندی کی طرف چڑھے اور قدم کو اپنا ردیف بنائے کیونکہ بلندی کے زینوں پر پہلے نظر چڑھتی ہے اس کے بعد قدم صعود کرتا ہے اور جب قدم مرتبہ نظر میں پہنچتا ہے نظر اس کے اوپر کے زینہ پر آ جاتی ہے اور قدم بھی اس کی معیت میں اس زینہ پر چڑھ آتا ہے بعد ازاں نظر پھر اس مقام سے ترقی کرے علی ھذا القیاس۔ 22

ہوش در دم اگر اندر کے تفرقہ کو دور کرتا ہے تو نظر برقدم باہر کے تفرقہ کو ختم کر دیتا ہے اس طرح ہر قسم کا تفرقہ دور ہو جاتا ہے اور قلب ونظر پر اسرار وحدت رکھتے ہیں۔

3۔ سفر در وطن:

یہ باطن کا سفر ہے کہ انسان ان صفات سے علیحدگی اختیار کرتا ہے جو نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اُن صفات تک رسائی پاتا ہے جو محمود صفات ہوتی ہے مثلاً وہ بخل، حسد، غیبت، غصہ وعناد اور تکبر وہوائے انسانی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور صبر وتحمل، شکر وتوکل، امید ورجاء اور عجز وانکساری کو اپنا لیتا ہے، اس جانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے واضح اشارہ کیا تھا فرمایا۔

''جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذائقہ پا لیا تو اُس پروردگار نے اسے طلب دنیا سے بے نیاز کر دیا۔ 23

اسی منصبِ بلند کے حوالے سے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے متنبہ کیا تھا فرماتے ہیں۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں

ایں خیال است محال است وجنوں

یہ لطیفہ دراصل رذائل سے روک کر فضائل کی طرف راہنمائی کا نام

ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اسے سیر النفس کا نام دیتے ہیں۔

4۔ خلوت درانجمن:

خلوت درانجمن سے مراد یہ ہے کہ انسان سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی سب سے الگ رہے۔ دل کی وابستگی ہر لحہ وجود مطلق کے ساتھ رہے اگرچہ بظاہر وہ کاروبار حیات میں مشغول نظر آئے۔ قرآن مجید میں ایسے ہی افراد کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورۃ النور: 37)

کہ ایسے بندے بھی ہیں کہ نہ تجارت اور نہ کسی قسم کی خرید وفروخت انہیں ذکر الٰہی سے غافل کرتی ہے سمجھا دیا گیا کہ وہ تجارت کرتے ہیں، خرید وفروخت میں مشغول رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے یہی خلوت درانجن ہے اس کا عمدہ نقشہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کھینچا تھا۔

دل بہ یارو دست بکار۔24

مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ

''خلوت درانجمن کا مطلب یہ ہے کہ بندہ ظاہر میں خلق کے ساتھ مگر باطن میں حق کے ساتھ ہو۔25

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''جب سفر در وطن میسر آجاتا ہے تو انجمن میں بھی خلوت خانہ وطن میں سفر کرتا ہے اور آفاق کا تفرقہ انفس کے حجرہ میں راہ نہیں پاتا۔26

مگر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ایک بالغ نظر ہادی کی حیثیت سے خلق سے تعلقات کو بالکل رد نہیں کرتے اس لئے فرماتے ہیں۔

''بعض اوقات ظاہری تفرقہ سے چارہ نہیں ہوتا تاکہ خلق کے حقوق ادا ہوں پس تفرقہ ظاہر بھی بعض اوقات اچھا ہوتا ہے لیکن تفرقہ باطن کسی وقت بھی اچھا نہیں کیونکہ یہ خالص حق تعالیٰ کے لئے ہے، پس عبادت کے تین حصے حق تعالیٰ کے لئے مسلم ہوں گے، باطن سب کا سب اور ظاہر کا نصف حصہ اور ظاہر کا دوسرا حصہ خلق کے حقوق ادا کرنے کے لئے رہا چونکہ ان حقوق کے ادا کرنے میں بھی حق تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری ہے اس لئے ظاہر کا دوسرا نصف بھی حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔27

5۔ یاد کرد:

اس سے مراد دائمی ذکر ہے کہ سالک ہر لحہ ذکر حق میں مشغول رہے یہ مشغولیت کا طریقہ مشائخ کی طبع اور تجربے کی بنیاد پر ہے کہ شیخ کیسے سالک کو ذکر میں مشغول رکھتا ہے۔ وہ کبھی ذکر اسم ذات کی تلقین کرتا ہے اور نفی واثبات کی مشق کراتا ہے مقصود صرف یہ ہے کہ سالک ہر لحہ حضوری ذات کے تصور میں گم رہے اور غفلت کا کوئی لحہ نہ آئے، ذکر مقصود بالذات نہیں ہوتا یہ قرب کے احساس کے لئے محرک بنتا ہے اور دفع غفلت کا وسیلہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''جو دم غافل وہ دم کافر'' اس سے بھی یہی مراد ہے۔

6۔ بازگشت:

بازگشت سے مراد ذکر کی کثرت میں غرور نفس نہ آجائے بلکہ مناجات کو بھی

معمول بنائے اور چند بار ذکر مثلاً تین بار یا پانچ بار ذکر کرنے کے بعد عجز کے ساتھ مناجات
کرلے تاکہ کثرت ذکر خمار کا باعث نہ بن جائے، یاد رہے کہ ذکر وفکر میں خود پرستی سے
بچنا لازم ہے کہ بعض اوقات ذکر مغرور کر دیتا ہے کہ سالک دوسروں سے بدتر ہوگیا
ہے اس لئے بار بار عجز کا اظہار کرے۔خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"ہرچہ دیدہ شد، شنیدہ، شد، دانستہ شود آں ہمہ غیر است بحقیقت کلمہ 'لا' نفی
آن باید کرد۔28

یعنی جو کچھ دیکھا جائے، سنا جائے اور جانا جائے یہ سب کچھ غیر ہے کلمہ طیبہ
کے لا سے سب کی نفی کرتے رہنا چاہیے اور یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ

"الٰہی مقصود من توئی و رضائے تو مرا محبت و معرفت خود بدہ" 29

"الٰہی میرا مقصود تو اور تیری رضا ہے مجھ کو اپنی محبت و معرفت عطا فرما"

7۔ نگہداشت:

نگرانی کرتے رہنے کو نظر میں رکھنا، راہ حق کے مسافر کے لئے خطرہ اس صورت
میں پیدا ہوتا ہے کہ اُس میں باطل خیالات بے یقینی کے داعیات اور نفس کے وسوسے
پیدا ہونے لگتے ہیں یہ شیطانی شب خون ہوتے ہیں، ان کو نگاہ میں رکھنا اور ان کا سد باب
کرتے رہنا سالک کے لئے ازبس ضروری ہے، یہ نگہداشت کبھی تو ذاتی کاوش سے ممکن
ہوجاتی ہے اور کبھی ردعمل کی اتنی قوت پیدا نہیں ہوتی اس لئے کسی راہنما کی ضرورت ہوتی
ہے یہ راہنما مرشد ہوتا ہے جو مختلف وظائف اور مسلسل ذکر سے ان وسوسوں کو دور کر دیتا ہے
اس لئے کسی سالک کو بھی اپنے آپ پر بھروسہ کرکے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے۔

8۔ یادداشت:

یادداشت سے مراد ہمہ وقت معرفتِ الٰہی ہے کہ کوئی لمحہ بھی ہو، اللہ تعالیٰ
کے وجود کا احساس قائم رہے، خالق کو ہر لمحہ موجود پائے کہ زندگی کی کوئی ساعت بھی
اُس کے بغیر ممکن نہیں، آسانیاں ہوں یا مشکلات پروردگار کی یاد اور تصور حضوری کا
یقین رہے، یہ کیفیت مبتدیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ریاضت سے اس مرتبہ کو
پالیں اور منتہیوں کے لئے بھی لازم ہے کہ کہیں موجودگی کے احساس سے غافل نہ
ہوجائیں۔اس کی انتہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں
کہ اگر انسان کو ایک ہزار برس عمر مل جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ماسویٰ یاد نہ آئے یہی
یادداشت ہے۔30

یہ اصطلاحات حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب دی ہوئی ہیں
جن کی حیثیت سالک کے سلوک میں بنیادی ہے، ان پر عمل کی آسانی اور ترسیخ کے
لئے خواجہ نقشبند حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے تین کا اضافہ فرمایا وہ یہ ہیں۔

9۔ وقوفِ زمانی:

اپنے حال میں ہر لمحہ باخبری کا مظاہرہ کرنا کہ انقطاع حال کی کوئی مخفی سے مخفی
صورت بھی پیدا نہ ہو یہ گاہے بگاہے باخبری کی مشق ہے اس لئے اسے محاسبہ بھی کہا
جاتا ہے کہ وقفوں کے بعد اپنے آپ کا اور اپنی حالت کا محاسبہ کرتا رہے، حَاسِبُوْا قَبْلَ
اَنْ تُحَاسَبُوْا قبل اس کے تمہارا احساب لیا جائے اپنا محاسبہ کرتے رہا کرو، کا فرمان اس
کی اہمیت واضح کرتا ہے۔سالک کو چاہیے کہ گاہے بگاہے اس محاسبہ کی مشق سے اپنے

آپ کوگزارے کہ اس سے استقامت پر استواری رہتی ہے اور دائمی سلامتی کی نوید ملتی رہے۔

10۔ وقوفِ عددی:

باخبری کی مشق کرتے ہوئے طاق عدد کو زیادہ ملحوظ رکھنا کہ یہ پسندیدہ طریقہ ہے۔طاق کتنا ہونا چاہیے یہ مناسب ہے کہ مرشد برحق اپنے تجربے سے سالک کی صلاحیتوں کا اندازہ کرے اور اُس کے لئے کوئی طاق عدد مقرر فرمادے۔

11۔ وقوفِ قلبی:

یہ قلب کی باخبری ہے اور یہ تصوف کی اساس ہے کہ دل کسی صورت غفلت کا شکار نہ ہو۔اس لئے مشائخ نقشبند علیھم الرحمۃ وقوفِ قلبی کو تمام اذکار سے معتبر جانتے ہیں۔ذاکر زبان سے ذکر کرے مگر اُس کی توجہ کا مرکز دل ہو کہ وہاں اس ذکر کا ردِعمل کیا ہے؟ ذکر کی ہر ضرب دل پر پڑے تا کہ دل میں کسی صورت غیابت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، ذکر انفاس بھی اس لئے ہوتا ہے اس لئے صوفیاء کی دعاؤں کا مرکز قلب کی راستی اور حضوری ہوتا ہے۔

بادشاہا جرم مارا درگذاشت ما گناہگاریم تو آمرزگار

بے گناہ نہ گذشت برما ساعتے باحضور دل نہ کردم طاعتے

وہی اطاعت مقبولیت کی سند پاتی ہے جس میں حضور قلب کی استقامت ہو، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی صورت کا ذکر کیا تھا۔

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

صوفیاء کرام کی ساری کاوش اسی قلبی حضوری کے لئے ہوتی ہے کہ دل کی دنیا توحید مست ہوجائے اور دنیاوی خواہشات اور نفسانی میلانات کے سارے بت ٹوٹ جائیں وگرنہ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے

وقوف قلبی اسی بت خانے کو توڑنے اور دل میں شمع توحید جلانے کی کوشش ہے اگر اس میں کامیابی ہوجائے تو سالک ہر قسم کے وسوسوں سے پاک ہوجاتا ہے اور اس کا ذکر وفکر خالصۃً توحید مست ہوجاتا ہے۔

اس مقام بلند تک پہنچنے کے لئے مشائخ نقشبندیہ نے چند مراحل تجویز کیے ہیں یہ مراحل وسیلہ ہیں اس مقصود تک پہنچنے کا جو تصوف کی ساری تگ ودو کی روح ہیں یہ دراصل روحانی ارتقاء تک رسائی کے لئے مشق کے طور پر کام آتے ہیں تا کہ سیر الی اللہ میں استقامت رہے اور باطل تصورات سے حفاظت رہے مراحل یہ ہیں۔

1۔ رابطہ شیخ:

شیخ جو طریقت کے میدان کا راہ یاب ہے سالک کے لئے راہنما بھی ہے۔محافظ بھی اور محرّک بھی، سالک کے لئے لازم ہے کہ اس سفر میں کسی بااعتماد راہبر کی پیروی اختیار کرے، اس کا حکم تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی موجود ہے کہ اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ کا خوف طاری رکھو اور۔

وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ۔ (سورۃ التوبہ:119)

ترجمہ: اور صادقین کے ساتھ رہو۔

صدیقین اسی گروہ کے امام ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے انعام نازل ہوتے رہے ہیں۔

یہ معیت کس طرح کی ہونا چاہیے۔ابتداء میں تو ظاہری صحبت درکار ہوتی ہے کہ حاضری دربار سے ہی رابطے مستحکم ہوتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب یہ شرفِ صحبت حاصل ہوا تو وہ تمام متقین وصالحین بلکہ اولیاء کرام کے بھی امام بن گئے کہ کوئی اور شرف اس شرف سے بڑھ کر نہ رہا۔اس لئے سالک پر لازم ہے کہ کاملین کی صحبت اختیار کرنے اور خصوصیت سے اپنے شیخ کے حضور حاضر رہنے کو لازم بنائے۔اس صحبت میں جتنا دوام ہوگا اتنا ہی نفع بخش ہوگا اگر مسلسل صحبت حاصل نہ ہو سکے تو پھر بھی گاہے بگاہے حاضری کو معمول بنائے کہ یہاں تو صورتِ حال یہ ہے۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

یہ اس لئے ہے کہ اولیاء خدائی صفات کے حامل ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں اور بندگی نے ہی ان کو یہ شرف عطا کیا ہے،اس لئے حضرت ابو یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کی صحبت اختیار کرو ہاں اگر اس کی طاقت نہ رکھتے ہو تو ایسوں کی صحبت اختیار کرو جنہیں اللہ تعالیٰ کی صحبت میسر ہے۔31

اسی لئے خود پروردگار نے راہنمائی فرما دی تھی کہ

أُولٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (سورۃ الانعام: 43)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے پس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

صحبت ایک ایسی کیمیا گری ہے کہ انسان جوں جوں مشاہدہ کرتا جاتا ہے اسی طرح ہونے کی تحریک پاتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ صحبت ذریعہ ہے مقصود نہیں،سفر مشکل بھی ہے،دشوار بھی ہے اور جان لیوا بھی ہے اس لئے مسافر کی سہولت کے لئے یہ راہنمائی مہیا کر دی گئی ہے،مطلوب تک رسائی کے ذریعے کو مطلوب خیال کر لینا کوتاہی فکر ہے مطلوب یہ ہے کہ دربار رسالت تک رسائی ہو شیخ کا کام یہ ہے کہ وہ سالک کو سفر میں ثابت قدمی کی تربیت دے اور پھر حاضر دربار کر دے،مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اسی لئے شریعت کی پاسداری کو مقصود برحق قرار دیتے ہیں اور اس لئے مرشد کامل کے لئے بھی اس مقصود کا راز داں بننا لازم سمجھتے ہیں ہر وہ حکم یا مطالبہ جو شریعت کے مطابق نہ ہو رد کرتے ہیں کہ سلوک کی راہ یابی سنت کی متابعت کے ساتھ ہی ہے اور قیامت میں نجات کا وسیلہ بھی یہی ہے وہاں اسی حوالے سے سوال ہوگا،نقشبندیہ کے ہاں شیخ،کامیاب راہبر ہے جو خود منزل سے آشنا ہے اور دوسروں کے لئے اسی کامیابی کے لئے کوشاں رہتا ہے۔شیخ ہو یا مرید مطلوب دونوں کا پاسداری شریعت ہے اور جو شیخ اس روش سے ہٹ جاتا ہے وہ لائق اقتداء نہیں رہتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ رابطہ شیخ پر کاربند ہونے کے لئے شیخ کی کن صفات کو پیش نظر رکھا جائے تا کہ اس کے ساتھ رابطہ مضبوط کر لیا جائے اس سلسلے میں چند شرائط کا خیال رہنا چاہیے۔

شیخ ایسا ہو کہ واقعی شیخ ہونے کا مستحق ہو،اُس کے افکار واعمال اس قدر مجلی ہوں کہ راہنمائی کا حق ادا کر سکیں۔اس کے لئے چند لازمی اوصاف درکار ہیں مثلاً

(ا) شیخ علم شریعت میں کامل دسترس رکھتا ہو،حلال وحرام کی پہچان بڑی واضح ہو

فرائض وسنن کے علاوہ نوافل پر بھی مداومت رکھتا ہو، یعنی ایک عالم ہو جس سے شریعت کے مسائل دریافت کئے جاسکتے ہوں کہ علم بنیادی شرط ہے، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے تو صرف اُس بنیاد پر خلافت عطا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ علم میں خاطر خواہ دسترس نہیں ہے یہ شرف اس لئے ہے کہ متوسلین نے اُسی سے راہ سلوک کی مشکلات کا حل تلاش کرنا ہے قرآن مجید میں اس جانب صاف اشارہ ہے کہ۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (سورۃ النحل: 43)

ترجمہ: پس پوچھ لو اہل ذکر سے اگر تم نہیں جانتے ہو

آیت کریمہ اہل ذکر سے سوال کرنے کی تاکید کر رہی ہے حالانکہ بنیاد یہ تھی کہ اگر تم نہیں جانتے تو نہ جاننے والوں کو جاننے والوں سے وضاحت چاہنی چاہیے مگر اہل علم کے بجائے اہل ذکر ارشاد ہوا یہ اس لئے کہ علم تو معلومات کی فراہمی کا نام ہے مگر اہل ذکر سے وہ عالم مراد ہیں جن کا علم معلومات سے بڑھ کر واردات بن چکا ہو۔

(ب)۔ شیخ کا دوسرا وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ صرف صاحب علم ہی نہ ہو۔ علم پر عمل کرنے والا بھی ہو اور اُس کا عمل سنتِ رسول ﷺ کی اتباع میں ہو کہ قبولیت صرف ایسے عمل کو ہی حاصل ہے اور ایسے ہی عمل کو حجت قرار دیا گیا ہے، خلاف شریعت ہر عمل باطل ہے اور لائق اجر وہی عمل ہے جو سنت کی پیروی میں ہے حکم الٰہی یہی ہے کہ

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔ (سورۃ لقمان: 15)

ترجمہ: اور اتباع کرو اُس کے راستے کی جو میری جانب جھکا ہوا ہو۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منازلِ تصوف تک رسائی اُسی کو حاصل ہے جو سنت کی ہر ادا کی پاسداری کرے یہاں تک فرمایا۔

''بزرگی سنت کی تابعداری پر وابستہ اور زیادتی شریعت کی بجا آوری پر منحصر ہے مثلاً دوپہر کا سونا جو اس تابعداری کے باعث واقع ہو کروڑ کروڑ شب بیداری سے جو اس تابعداری کے موافق نہ ہو اولیٰ اور افضل ہے''۔ 32

(ج)۔ شیخ کے اعمال ریاضت کا عکس ہوں اور اس کے مجاہدے علم معرفت کے زیر سایہ ہوں، عقائد اور اعمال میں کوئی جھول نہ ہو، للھیت اُس کے ہر عمل کی اساس ہو اور دنیاداری سے رغبت نہ ہو غرضیکہ شیخ کا وجود علم شریعت اور علم حقیقت سے آراستہ ہو۔

(د)۔ شیخ طریقت کسی ایسے سلسلے سے پیوستہ ہو جو شریعت کی پاسداری کا تسلسل رکھتا ہو اُس کا رابطہ راہ یاب شیخ سے ہو اور وہ ایسی فرع کا امین ہو جو اصل ثابت سے متصل ہو پھر اُس کا فیضان بھی عام ہو اور ہمہ وقت ہو، کوئی مصلحت یا کوئی مجبوری اُس کی استقامت میں خلل نہ ڈالے غرضیکہ کامل شیخ شریعت اور ہمہ تن فیض رساں ہو۔

ان تمام صفات کا جامع بیان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے القول الجمیل میں کچھ اس طرح درج کیا ہے۔

(i) کتاب وسنت کا علم رکھتا ہو یعنی اس قدر ضرور ہو کہ تفسیر مدرک تفسیر جلالین۔ مشکوٰۃ المصابیح اور مشارق الانوار کسی عالم سے بالتحقیق پڑھ چکا ہو، خود بھی شریعت پر عمل پیرا ہو اور اپنے مرید کی بھی راہنمائی کر سکے، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ۔

كل طريقة ردته الشريعة فهو زندقة

ہر وہ طریقت جسے شریعت رد کر دے وہ الحاد ہے۔

(ii)۔ تقویٰ وعدالت پر کاربند ہو۔ کبیرہ گناہوں سے پرہیز رکھتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ ہو مدت تک علماء صالحین کی صحبت میں رہا ہو اور اُن سے ادب سیکھا ہو۔

(iii)۔ دنیا سے مجتنب ہو آخرت کا طلب گار ہو اور اُن اذکار کا پابند ہو جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(iv)۔ شریعت کے مطابق عمل کی تلقین کرتا ہو اور خلاف شرع باتوں سے روکتا ہو اس معاملے میں کسی قسم کی تلون مزاجی کا شکار نہ ہو۔

(v)۔ کسی مرشد کامل کا تربیت یافتہ ہو، کسی سلسلہ طریقت سے اجازتِ ارشاد حاصل کر چکا ہو۔

(vi)۔ رزق حلال کا طلب گار ہو مشتبہ رزق سے بچنے والا ہو اور قناعت پسند ہو۔

(vii)۔ کسب حلال کے لئے اپنے پیشے پر عمل پیرا ہو۔

(viii)۔ کرامات کو تصوف یا ولایت کی شرط نہ سمجھتا ہو۔33

ان خصائص کا حامل کوئی بزرگ مل جائے تو اُس سے تعلق قائم کر لینا چاہیے اور پھر آداب شیخ کا ہر لحہ خیال رکھنا چاہیے خواہ مخواہ شک کا اظہار نہ کرے۔ سوال کی کثرت سے بچے اور اتباعِ شیخ پر عمل پیرا رہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اطاعتِ شیخ لازم ہے جب تک اطاعت شیخ، اطاعتِ رسول ﷺ کا پرتو رہے کہ اصل اطاعت رسول کریم ﷺ کی ہے۔ تضاد کے موقعوں پر یہ اعتماد رکھے کہ قولِ پیغمبر ﷺ حجت ہے قولِ شیخ نہیں، نقشبندیہ طریق فکر میں اس اساسی یقین کو راسخ کیا جاتا ہے کہ شریعت کی پیروی ہی راہِ نجات ہے۔

2۔ ذکر:

طریقہ نقشبندیہ کا دوسرا جوہر ذکر ہے جس سے اعمال میں شائستگی اور باطن

میں نور پیدا ہوتا ہے۔ ذکر ایک ایسی دولت ہے جس سے منتشر خیالی اور بے راہ روی کی اصلاح ہوتی ہے۔ ذکر پر مداومت پر قرآن مجید اور فرمودات رسول اکرم ﷺ میں بہت زور دیا گیا ہے۔ حکماً بھی ارشاد ہوا، مقامِ مدح میں بھی ذکر ہوا اور نتائج کے اعتبار سے بھی وضاحت کی گئی مثلاً صیغہ امر میں ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾ (الاحزاب: 41۔42)

"یعنی اے ایمان لانے والو اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو اور صبح و شام اُس کی تسبیح کیا کرو۔

کبھی ذکر کرنے پر مداومت کے اثرات کا بھی ذکر فرمایا گیا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل: 8)

کہ اپنے رب کے نام سے ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اُس کے ہو جاؤ۔

ذکر مسلسل اور ذکر کی کیفیت کا دوام "تبتل" یعنی سب سے کٹ کر اُس کے ہو جانے کی تمہید ہے کبھی اہل ذکر کی ثابت قدمی کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ (النور: 37)

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت انہیں ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرتے ہیں۔

یہ ذکر کا عملاً فائدہ ہے کہ اصحاب ذکر کو دنیا کی کوئی طلب، خواہش یا تمنا غافل نہیں کر سکتی۔ ذاکر ہمہ وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے اور ذکر اُس کے وجود پر یوں سایہ فگن رہتا ہے کہ کوئی دنیاوی خواہش راستہ نہیں روکتی، انسان کی یہی طمانیت

ہے جو ذکر کی بدولت اُسے حاصل ہوتی ہے اسی لئے فرمایا گیا۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد:28)

''خبردار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی دل اطمینان پوتے ہیں۔

دل جو مرکز خواہشات ہے، ہر دم بھٹکتا رہتا ہے، اضطراب اس کا شیوہ ہے اس کو مطمئن رکھنا ہے تو ذکر کی کثرت چاہیے کہ یہی قلبی امراض کے لئے نسخہ شفا ہے۔

مشائخ نقشبند ذکر الٰہی کو ہی سب سے بڑا وظیفہ سمجھتے ہیں ہر سلسلہ طریقت کچھ مخصوص کلمات کا ورد کراتا ہے تاکہ دل متوجہ رہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سلسلہ اپنے ذکر اور وظائف میں سلسلہ طریقت کے بانی یا اس سلسلے کے جس وجود سے شناخت قائم ہے اُس کا ذکر، اوراد و وظائف میں شامل کرتا ہے اور فریاد رسی کا ذریعہ بناتا ہے مگر سلسلہ نقشبندیہ ذکر کے تمام مدارج میں صرف ذکر الٰہی کو ہی مرکز توجہ بناتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقشبندی بزرگوں نے اپنے ذکر کو شامل ذکر کرنے کا کبھی ارشاد نہیں فرمایا اس لئے ذکر خفی نقشبندیہ کا عموماً طریقہ عمل رہا کہ دل بغیر کسی ظاہری آہنگ کے ذکر میں مشغول رہے، اس سلسلے کا طرہ امتیاز کلمۃ الجلالہ یعنی ''اللہ'' کا ذکر ہے، یہی اُن کے نزدیک وقوفِ قلبی ہے اس کی اس قدر مشق کرائی جاتی ہے کہ سانس اندر جائے تو اللہ اور باہر نکلے تو اللہ، یعنی یہ اسم ذات سالک کے ہر سانس کا وظیفہ بن جائے، اللہ، اللہ اس طرح دائمی وظیفہ حیات بن جاتا ہے اور یقین ہونے لگتا ہے کہ۔

بعد مُردن پکارے گا میرا لہو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

خالصۃً اسم ذات کے ذکر کے ساتھ کلمہ طیبہ کا ذکر بھی نقشبندیوں کا معمول

ہے، یہ ذکر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے لا الٰہ اور الا اللہ۔ اسے ذکر نفی واثبات بھی کہتے ہیں کہ لاسب سے کٹ جانے اور ہر تعلق سے نفی کا پیغام بنتا ہے اور الا اللہ کی ضرب دل پر پڑے تو دل اقرار کی لذت سے آشنا ہوتا ہے یہ ذکر جس قدر دوہرایا جائے گا اُسی قدر توحید کا ایقان مضبوط ہوگا اس پیہم وظیفے سے ہر عمل ذکر کے حصار میں آجائے گا عمل کوئی بھی ہو ذکر کی حلاوت قائم رہے گی اور ذاکر ہر دم ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے گا اگرچہ بظاہر وہ کوئی اور عمل بھی کر رہا ہو۔

3۔ مراقبہ:

مراقبہ کا مصدر راقب سے ہے جس کا معنی کسی کی حفاظت کرنا ہے اسی سے رقیب ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ پروردگار سب کی حفاظت فرماتا ہے، مراقبہ بھی ایسی حفاظت ہے جو قلب ونظر کو ہر شنویت سے بچالیتی ہے ہر غلط خیال، ہر غلط عمل اور ہر نادرست سوچ سے حفاظت کا اہتمام مراقبہ ہے۔ سالک جو محسوس کرتا ہے کہ اُس کی نیک خواہشات اور نیک ارادوں کے باوجود شیطانی قوتیں حملہ آور رہتی ہیں تو وہ اپنے شیخ سے حفاظت کے ذریعہ کا طالب ہوتا ہے اس پر شیخ اُسے مراقبے کی تلقین کرتا ہے اور اس کے رموز سمجھاتا ہے اور طریقہ بتاتا ہے یہ تبتل کی عملی شکل ہے اور غار حرا کی خلوتوں کی فیض بخشی ہے مراقبہ کی کثرت سالک کو یک نظری اور یک عملی کے جوہر سے آشنا کرتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ غیر ذات کے دائرے سے نکل کر حصار خیر میں آجاتا ہے پھر مراقبہ ظاہری طور پر جاری نہ بھی ہو تو مراقبہ کی کیفیت طاری رہتی ہے سالک ہمہ وقت حضوری کے کیف سے سرشار رہتا ہے اور حاضری دربار کی مستی اُس پر چھائی رہتی ہے مگر یہ ضرور یاد رہے کہ مراقبہ شعور وفکر کو غیریت سے اپنی پناہ لے

لیتا ہے مگر سالک کو ترکِ دنیا کی ترغیب نہیں دیتا، سالک کی حالت یہ ہوتی ہے۔

"رہتا ہے سب کے درمیاں سب سے الگ"

مراقب کے لئے اس کا اسوۂ حسنہ نبی اکرم ﷺ کی خلوت گزینی ہے کہ غارِ حراء میں سب سے کٹ کر بھی رہے مگر وہاں بھی سوچتے سب کے لئے رہے اور جب غارِ حراء کو چھوڑا تو اک جہان تازہ پیدا کر دیا، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

مشائخ نقشبند اپنے سالکین کو ذکر کے انداز بھی سمجھاتے ہیں اور مراقبے کی ترتیب و انداز کی بھی مشق کراتے ہیں یہ سلسلہ تصوف ایک منفرد شان رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے معاشرتی انقلاب پیدا ہوتے رہے ہیں اور اصلاحِ قوم کے سامان ہوئے ہیں۔ اس سلسلے پر کئی دور آئے، حالات بدلے، علاقائی ماحول تبدیل ہوا مگر اس طرزِ تصوف کے اساسی حوالے ہمیشہ سے ہی ایک جیسے رہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ مختلف ادوار میں متعدد ناموں سے معروف ہوا مگر روح ایک ہی رہی مثلاً کبھی یہ طریقہ، سلسلہ خواجگان کے نام سے معروف ہوا تو کبھی سلسلہ نقشبندیہ کے نام سے پکارا گیا اور پھر کبھی سلسلہ مجددیہ اس کی پہچان بنی۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے اس نسبت تصوف کو بہت شہرت حاصل ہوئی حتّٰکہ برصغیر کی تاریخ عزیمت کا سب سے بڑا حوالہ قرار پایا۔ ان گنت شاخیں نکلیں اور نسبت شیخ سے مختلف ناموں سے موسوم ہوئیں۔ برصغیر کا قریہ قریہ اس سلسلہ فیض سے متمتع ہوا اور اشاعت خیر کے کئی در کھلے۔ ہم عموماً برصغیر کے نقشبندی صوفیاء سے ہی مانوس ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلہ رشد برصغیر کے باہر بھی نمایاں تھا

اور نمایاں ہے ترکستان سے لے کر ماوراء والنہر کے علاقوں تک، حرمین سے لے کر انڈونیشیا تک، روس کے زیر نگین شہروں سے کردستان تک یہ سلسلہ مروارید مسلسل پھیلتا گیا اور دین اسلام کی سطوت کا نشان قرار پایا تاریخ عزیمت گواہ ہے کہ مزاحمت کی ہر مسلم تحریک میں یہ سلسلہ نمایاں کردار ادا کرتا رہا، برصغیر میں احیاء اسلام اور صیانتِ عقیدہ کی جدوجہد کی امامت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو ہی حاصل رہی روسی مقبوضات میں امام شامل کی تحریک کی بازگشت تو اب تک سنی جا رہی ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ ایک تحریک دعوت ہی نہ تھی یہ نفاذ شریعت کی ایک طاقت ور تحریک بھی تھی تبلیغ کا مشن بھی ان اکابر کے پیش نظر تھا اور کافرانہ رویوں کی اصلاح بھی انہیں مطلوب تھی۔ مناسب ہوگا کہ نقشبندیت کے شجر کا ایک جائزہ لے لیا جائے کہ اس شجر طیب کی لاتعداد شاخیں نکلیں اور متعدد علاقوں پر سایہ فگن رہیں، ہمارا مطلوب ان تمام شاخوں کا احاطہ کرنا نہیں کہ یہ ایک عظیم دائرہ معارف کا تقاضا کرتا ہے۔ اختصار اور اشارات کے تحت اُس شاخ سربلند کا تذکرہ مقصود ہے جو مختلف نسبتوں سے پھیلتی ہوئی نیریاں شریف کے مرکز خیر تک پہنچی۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ ان سالکان باصفا کا ذکر پوری صحت اور عقیدت سے کیا جا سکے، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے سے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین

حوالہ جات

1 ابوالفضل، آئین اکبری حصہ دوم ص208

2 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب251

3 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب251

4 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب251

5 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب221

6 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب221

7 کشف المحجوب باب تصوف ص74

8 کشف المحجوب باب تصوف ص74

9 کشف المحجوب باب تصوف ص15_16

10 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب 290

11 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب 207

12 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب26

13 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب 40

14 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب184

15 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب48

16 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب289

17 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب221

18 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب114

19 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب226

20 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب58

21 مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب:69

22 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب295

23 شرح القول الجمیل ص96

24 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص68

25 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص69

26 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب295

27 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب295

28 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص70

29 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص69

30 انوار لاثانی کامل حسب ارشاد پیر ظفر اقبال شاہ ص73

31 حوالہ مذکورہ ص: 80

32 مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب114

33 جواہر نقشبندیہ ص48 تا50

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ

(ابراہیم :24)

کائنات ارضی وسماوی پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر مظہر کسی اصل ثابت کی نشاندہی کر رہا ہے۔ انسان اسی اصل ثابت کی تلاش میں ازل سے سرگرداں ہے، یہی اساس ہے اُس کلمہ طیبہ کی جس کی قرآن مجید میں شجرہ طیبہ سے مثال دی گئی ہے۔ شجرہ طیبہ کی بنیادی صفات کا بھی ذکر کر دیا گیا تاکہ اس تک رسائی کا راستہ آسان ہو جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾ (ابراہیم :24-25)

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی کیسے مثال بیان کی ہے کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی اصل بڑی مضبوط واستوار ہے اور جس کی شاخ آسمان تک ہے وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے ایسی ہی مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ خوب یاد رکھیں۔

ان ارشادات سے واضح ہوا کہ کلمہ طیبہ کی بہار آفرینی، شجرہ طیبہ کی مثال ہے، جس طرح شجر طیب، پاک اور عمدہ زمین میں کاشت ہوتا ہے اسی طرح کلمہ طیبہ پاک اور باصلاحیت دل میں کاشت ہوتا ہے جیسے شجر طیب تازہ پانی اور قوت بخش بیج

سے نشوونما پاتا ہے اسی طرح کلمہ طیبہ خالص عقیدوں اور پاکیزہ جذبوں کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ جس طرح مضبوط اساس والا شجر آندھیوں اور طوفانوں میں بھی جما رہتا ہے اسی طرح اصل ثابت رکھنے والا کلمہ، شرک وکفر کی آندھیوں میں بھی سلامت رہتا ہے، زمیندار جب خالص جذبوں سے کاشت کرتا ہے اور پوری محنت کے ساتھ زمین کو پیداوار کے لئے تیار کر لیتا ہے تو آزمایا ہوا خالص بیج کاشت کر دیتا ہے۔ وہ بڑا ہی پرامید ہوتا ہے کہ اس کی محنت کا پھل نکلے گا اور محنت بارآور ہوگی مگر جب کبھی ایسا نہ ہو، مایوسی ڈیرے ڈال لے تو زمیندار مضطرب ہو جاتا ہے۔ سوچتا ہے کہ کیا زمین میں کوئی نقص رہ گیا کہ یہ روئیدگی کے لئے تیار نہ تھی یا کیا یہ شور ہوگئی ہے کہ نمو کی صورت نظر نہیں آتی وہ اسی خلجان کے ازالے کے لئے ماہر ارضیات سے رابطہ کرتا ہے لیکن اگر زمین میں کوئی نقص دریافت نہ ہو تو وہ بیج کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور بیج کے ماہرین کے ہاں دستک دیتا ہے تاکہ اس کی قوت نمو کا اندازہ ہو جائے یہی حال دل کی سرزمین پر کلمۂ طیبہ کاشت کرنے والے کا ہوتا ہے وہ کبھی قلب کی خرابیوں کے ماہرین کے ہاں حاضر ہوتا ہے کہ کہیں سرزمین دل ہی بداعمالیوں کے تعفن کی وجہ سے شور نہ ہو چکی ہو تو کبھی کاشت کئے گئے عقیدہ کی صیانت کا اندازہ لگانے کے لئے ماہرین عقائد کے ہاں حاضری دیتا ہے ایسا نہ ہو کہ بیج ہی غلط کاشت ہو گیا ہو کہیں توحید کی بجائے شرک نہ بو دیا گیا ہو۔ کلمہ طیبہ کی حفاظت کے لئے یہی دو طرح کے ماہرین ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ ایک گروہ علماء کا ہے جو عقائد کے پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر کہیں خرابی ہو تو ازالے کی قوت رکھتا ہے دوسرا گروہ صوفیاء کا ہے جو قلب کی طہارت کا سامان کرتا ہے یہ دونوں گروہ پاسداری کرتے رہیں تو

شجرِ ایمان ہر لحظہ پھل دیتا ہے امت مسلمہ انہی گروہوں کی پناہ میں رہے تو شجرِ طیب کی بہاریں عام ہوتی ہیں۔

مزید ارشاد ہوا کہ شجرِ طیّب کے دو مظہر ہوتے ہیں ایک یہ کہ اس کی اصل ثابت رہے دوسرے یہ کہ اس کی شاخیں آسمان گیر ہوں اور ساری انسانیت کو اپنے دامنِ خیر میں لینے کی صلاحیت رکھتی ہوں اور یہ کہ ان کا پھل سدا بہار اور وسعت پذیر ہو۔ یہ امت مسلمہ کی خوش قسمتی ہے کہ یہ ہر جانب سے محفوظ ہے۔ اس کے ایمان کی اساس اصل ثابت پر ہے۔ وہ اصل جو رحمت تمام بھی ہے اور عقیدہ توحید کا ترجمان بھی رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک، شجر اسلام کی اساس ہے کہ

اَلْاِسْلَامُ یَدُوْرُ حَوْلَ الْمُصْطَفٰی ﷺ

اسلام ہے ہی اس منبع اسلام کی ذات کے گرد گھومنے کا نام۔ ہر جانب سے اُنہیں دیکھنے اور لحہ ان کو مرکز بنانے کو ایمان کہتے ہیں اس مرکزیت پر اعتماد ہو جائے تو شجر اسلام خوب پھلتا پھلتا ہے پھر اس کی شاخیں پورے جہان کو اپنے سایے میں لے لیتی ہیں سلسلہ ہائے تصوف کی بنیاد یہی مرکز ہے، صوفیاء کرام اس یقین کے ساتھ مرکز سے پیوستہ رہتے ہیں کہ کہیں انقطاع نہیں آتا، پھر اُن کی کیفیت جڑی ہوئی شاخوں کی مانند ہوتی ہے، تاریخ کا مطالعہ واضح کر رہا ہے کہ ان شاخوں کو مرکز سے بیگانہ کرنے کی سعی بھی کی جاتی رہی متوازی دین ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا رہا مگر یہ سلسلہ خیر استوار ہی رہا اور پھیلتا ہی رہا۔ کوئی عہد یا کوئی علاقہ اس ثمر بار شاخ سے محروم نہ رہا میدان اس مہکار سے عطر بیز ہوئے تو پہاڑ اس کی رنگینیوں سے جنت نشان بنے۔

برصغیر بھی ان توانا نسبتوں سے رشکِ گلزار بنا حتّٰی کہ حکیم الامت علامہ اقبال

مرحوم بھی پکار اٹھے کہ۔

خاکِ پنجاب از دم او زندہ گشت　　صبحِ ما از مہر او تابندہ گشت

صوفیاء کرام کا ہر سلسلہ اسی نسبت نبوت سے عطر بار ہے، صوفیاء سمجھتے ہیں کہ اس نسبت کے بغیر سب لادینی اور گمراہی ہے، اسی مرکز ایمان کی خاکِ پا سرمۂ بصیرت ہے اور جلائے ایمان ہے کہ بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ۔

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرا است　　کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

نقشبندیہ سلسلہ تصوف تو اس سلسلے میں خصوص کا حامل ہے مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک تصوف کی تمام تب و تاب اسی مہر درخشاں کی خیرات ہے آیئے اس سلسلے کی مختلف کڑیاں شمار کریں تا کہ اس وسعت پذیر مہک سے مشام جاں کو مہکا سکیں۔

1۔ سرورِ کائنات رحمۃ العالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ

مرکز ایمان وسعادت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تخلیق کائنات کا مطلع اول بھی ہیں کہ آپ کی ذات گرامی وجہ تخلیق بھی ہے حسن کائنات کی بہار اولین بھی آپ ہیں اور کنزِ مخفی ذات کے عرفان کا مستقل حوالہ بھی آپ ہیں۔ امام اولین بھی آپ ہیں اور مقتدائے آخرین بھی آپ ہیں وہ وجود مکرم جس کے ہونے سے نبض ہستی رواں ہوئی اور حیات کو تابانی ملی، علم ودانش کی معراج یہ ہے کہ وہ اس وجہ کائنات کا شعور پالے، مراقبوں اور مجاہدوں کا حاصل بھی یہ ہے کہ وہ ذاتِ احمدی تک رسائی پالیں، انبیاء کرام علیہم السلام کا سارا سلسلہ اسی وجودِ پاک کی شناخت کا ذریعہ بنا، یہ سب راستے کے پڑاؤ تھے، نشانِ منزل آپ تھے، منزل تو یہی وجود تھا، یہی وجہ ہے کہ ہدایت کے ہر پیغام برنے آپ کا تذکرہ کیا اور پھیلتی ہوئی انسانیت کو آپ کی تلاش کا راز سمجھایا۔ صرف انسان ہی نہیں کائنات کا ذرہ ذرہ اسی جستجو میں سرگرداں رہا کہ وہ وجود مکرم کب عیاں ہوگا گردشِ لیل ونہار کی کروٹیں اسی تلاش میں تھیں اور انسان کی ہدایت کے نمائندے اسی جانب اشارے کررہے تھے یہ جستجو جوں جوں طویل ہوتی گئی پیمانہ صبر لبریز ہوتا گیا۔ آخراس جستجو کو کنارہ مل گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے برملا یہ نوید جانفزا سنادی کہ اب سفر مکمل ہوا چاہتا ہے جستجو اختتام کو پہنچنے والی ہے آنے والا اب آیا ہی چاہتا ہے اور سراپا احمد بن کر آرہا ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ

مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۶ (الصف:6)

"یاد کرو کہ جب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے کہا، اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے آئی اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا پس وہ رسول سب نشانیاں لئے آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ کھلا جادو ہے۔

اس آیت کریمہ میں چند حقائق واضح کردیئے گئے مثلاً

ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ رسالت کا تھا ابنیت یعنی بیٹا ہونے کا نہ تھا۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل ہی کی طرف رسول تھے۔

تیسرے یہ کہ آپ سلسلہ نبوت کے ایک رکن تھے اس لئے سابقہ انبیاء خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت جو تورات کی صورت میں تھی کی تصدیق کرنے والے تھے، یہ سلسلہ ترسیل کا حسن ہے کہ کوئی رسول کسی دوسرے رسول کی نہ تکذیب کرتا ہے اور نہ اُس کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے وگرنہ عام داعی تو دوسروں کی تردید پر اپنی دعوت کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔

چوتھے کہ آپ ایک رسول کے تشریف لانے کی خوشخبری سنارہے ہیں۔ بڑے واضح انداز میں کہہ دیا کہ آنے والے رسول کا نام احمد ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف ایک رسول آئے گا۔ اس طرح بشارت کے ساتھ سلسلہ نبوت کی تکمیل کا بھی اعلان کردیا گیا اور فرمادیا کہ اب آمد صرف احمد نامی رسول کی ہوگی۔ یہ الگ بات کہ آپ کے ماننے والوں نے اس آنے والے کی ہزاروں نشانیاں بھی

دیکھیں مگر انکار کرتے رہے اور واضح معجزات کو جادو کہتے رہے۔

یہ اعلان صاف بتا رہا ہے کہ اب وہ آنے والا ہے جو لمحہ تخلیق سے اب تک حمد سرا رہا ہے، وہ اب بھی حمد کرتا ہوا آئے گا اس مسلسل حمد سرائی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود محمد (ﷺ) کہلائے گا۔ اس بشارت کے بعد کائنات کے ہر مظہر کی نظر میں آنے والے پر مرکوز ہوگئیں۔ سب اس انتظار میں محو ہوگئے کہ وہ لمحہ مسعود کب آئے گا یہ یقین بھی تھا کہ وہ لمحہ آیا ہی چاہتا ہے آنے سے پہلے اپنی رحمتوں اور برکتوں کا اظہار بھی تو کرنا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابرہہ یمن کا حکمران اپنی طاقت کا خمار تخریب کا زعم لئے آمڈ آیا۔ یلغار کرنے والا سوچتا تھا کہ ایک گھر ہی تو ہے جس کا گرانا اتنی قوت والے لشکر سے کیونکر مشکل ہوگا۔ وہ ایک عمارت مسمار کرنے آ رہا تھا۔ چند گھرانوں کے ایک معبد کا گرانا دشوار کیوں تھا مگر ایک نادیدہ خوف اُسے ایک بڑے لشکر کی تیاری پر اُکسا رہا تھا۔ چھپا ہوا خوف ہر قدم پر عیاں ہو رہا تھا مگر جب اُس گھر کی خیرات پر پلنے والے گھر کا حصار ہی چھوڑ گئے حتّٰی کہ اپنے گھروں کو بھی بے آباد کر گئے تو جرأت بڑھی، ایک بوڑھا سردار کچھ متردد نظر آیا، صرف اپنے مال مویشی کا طلب گار رہوا تو ابرہہ نخوت کا مجسمہ بن گیا۔ وہ مرد بزرگ کعبہ کو چھوڑ کر نہیں گیا بلکہ اس کی حفاظت کی تدبیر کرنے لگا۔ صرف ایک ہی تدبیر کے کارگر ہونے کا یقین لئے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا اور اپنے ساتھ اُس بہو کو لے گیا جو اپنے بطنِ اطہر میں کارسازِ جہاں کو اٹھائے ہوئے تھی، اُس آنے والے کی دہائی دی گئی۔ حیرت یہ ہے کہ جس کی پناہ مانگی جا رہی تھی وہ تو ابھی شکمِ مادر میں تھا مگر قدرت کو یہ پکار پسند آگئی کہ سردارِ مکہ نے آنے والے درِ یتیم کی شناخت کا حق ادا کر دیا تھا، یہ شناخت ہی کام آئی، یہی پہچان حفاظت کا وسیلہ

بنی کتنا خوش قسمت تھا سردارِ مکہ جو اُسے پہچان رہا ہے جو ابھی ہویدا نہ ہوا تھا مگر کس قدر بدبخت ہوں گے وہ لوگ جو دیکھ بھی لیں گے مگر انکار کریں گے۔ سعادت اسی شناخت سے جڑی ہوئی تھی۔ وہی ہوا جس کی امید لگائی گئی تھی۔ قدرت کہہ رہی تھی اے سردار جس کا تو نے واسطہ دیا ہے وہ تو اب آنے والا ہے۔ وہ تو ابھی شکم مادر میں بھی نہ آئے تھے کہ اولوالعزم رسولوں کا سہارا بنتے رہے تھے۔ آدم علیہ السلام ہوں یا نوح علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام ہوں یا موسیٰ علیہ السلام ذرا دیکھو تو سہی کہ اس آنے والے نے کس کس کی دستگیری کی ہے۔ اب تو وہ ظہور کے سفر پر ہے جسمِ اطہر کے ساتھ ہے تو اب حفاظت کیوں نہ ہوگی۔ اب تو کعبہ کے پاسبان کی آمد آمد ہے۔ اب کعبہ کو کون گرا سکتا ہے۔ اب تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگار دائمی پناہ میں آنے والی ہے۔ سمجھا دیا گیا کہ ابھی تو آنا ہے تو اس قدر برکتیں آمڈ آئی ہیں جب ظہور قدسی ہوگا تو دیکھنا کس قدر رحمتیں محیط ہو جائیں گی۔

ظلم و جبر میں جکڑی ہوئی انسانیت ہی کسی مسیحا کی تلاش میں نہ تھی تمام مظاہر قدرت بھی رحمتِ تمام ﷺ کی راہ تک رہے تھے جب وہ ساعتِ ہمایوں آئی تو ابابیل ہی گروہ در گروہ آمڈ نہ آئے تھے ہر جہنم کدہ لرز اٹھا تھا۔ بدی کے رسیا اور برائی کی پرورش کرنے والے ہی نہ کانپے تھے بت بھی تھرا اُٹھے تھے رحمتوں کی برسات تھی اور کرم کا دور دورہ تھا پھر کیا ہوا۔

بصد انداز یکتائی بغایت شانِ زیبائی
امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

قدرت کا اہتمام دیکھئے کہ ایک امین نے آنا تھا تو گود بھی آمنہ کی تیار کی گئی

امن کا کفیل وجود ظہور فرما رہا تھا اس لئے ہر اکڑی ہوئی گردن خم ہوئی اور ہر پُرغرور وجود خاکستر ہوا۔ ذرا آمد کا منظر دیکھئے کہ خاتم المرسلین ﷺ کس شان سے آئے اور قدرت نے اُن کی تشریف آوری کا کیا اہتمام کیا۔ آیئے ظہور قدسی کے نورانی لمحات کا شمار کریں۔

ولادتِ نورِ مجسم ﷺ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس وقت صحرائے عرب میں لے آئے تھے جبکہ آپ ابھی اپنی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی گود میں تھے۔ خلیل اللہ علیہ السلام کا یہ سفر حکمِ الٰہی کی تعمیل میں تھا ورنہ کون اپنے فرزندِ ارجمند کو ریت کے دھندلکوں کی نذر کرتا ہے یہ بھی نہیں کہ اس مقام کی کیفیات سے کوئی بے خبری تھی ہمہ جہت شعور تھا اسی لئے تو تعمیل ارشاد کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراهيم:37)

''اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی اولاد کو ایسی وادی میں بسا دیا ہے جہاں زراعت کی کوئی صورت نہیں مگر یہ تیرے حرمت والے گھر کے پاس ہے''۔

واضح کر دیا گیا کہ زراعت کے قابل وادی نہیں ہے۔ زمین یہاں بسنے والے بیٹے اور اُس کی ماں کو خوراک کے لئے کچھ نہ دے گی مگر اطاعت شعاروں کا طریق زیست ہر حال میں اطاعت ہوتا ہے کس قدر خوش قسمت تھی یہ بے آب و گیاہ وادی جس کی آبادکاری کی خشت اول ہی رحمتوں کے نزول پر رکھی گئی تھی زمزم کا چشمہ

برکات کے نزول کی تمہید بنا، یہ سلسلہ نسل اس قدر بلند مرتبت قرار پایا کہ اسکا سارا انحصار خالقِ کائنات کی رحمتوں پر رہا، یہ ایک آزمائش بھی تھی مگر اس سے بڑھ کر آنے والے رحمتِ عالمین (ﷺ) کے وجود مسعود کی رحمتوں کی تمہید تھی یہ نسل جب کعبۃ اللہ کی تعمیر ہوگئی تو اُس کے جوار میں پروان چڑھنے لگی، حضرت اسماعیل علیہ السلام وادی کے پہلے مکین قرار پائے۔ انہیں کی معاونت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی بنیاد اٹھائی۔ یہ ایسا گھر تعمیر ہوا جس میں دو معصوموں کے علاوہ کسی اور کا کوئی کردار نہ تھا، ایک وہ عظیم المرتبت صاحب خلّت رسول جس کی زندگی کی ایک صدی اطاعت و فرماں برداری کے ہالوں میں گزری تھی۔ آزمائش کی کون سی صورت تھی جو درپیش نہ ہوئی۔ مگر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے عملاً اپنی معصومیت ثابت کردی تھی اور ایک وہ نونہال جو اپنی معصومیت کی دہلیز پر کھڑا تھا دو معصوم ہاتھوں نے اس گھر کی تعمیر کی تھی۔ قرآن مجید نے جب اس کا حوالہ دیا تو صراحتً دو اور صرف دو کی موجودگی کا اعلان کیا ارشاد ہوا۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ

(البقرة:27)

''اور یاد کرو وہ منظر کہ جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام۔

صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی ذکر نہیں کیا۔ شریک اساس حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بھی واضح ذکر کر دیا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ بس دو ہی تھے تیسرا کوئی نہ تھا۔

کعبۃ اللہ تعمیر ہو گیا، نسل آدم علیہ السلام کو اس گھر کی مرکزیت کا پیغام دے دیا۔

گیا اور ساتھ ہی ایک آنے والے رسول گرامی علیہ الصلاۃ السلام کی آمد کی خوشخبری سنادی گئی، حیرت ہوتی ہے کہ یہ صرف دعا نہ تھی۔ قبولیت کی نوید بھی تھی کہ آنے والے رسول ﷺ کے مناصبِ نبوت بھی واضح کئے جارہے تھے۔ تلاوت آیات، تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیہ نفوس، کس قدر باخبری کا اعلان تھا کہ جب اس دُعا کی قبولیت کی گھڑی آگئی تو ربّ کریم نے اس لمحہ کو اپنا احسان بتایا اور انہیں مناصب کی حاملیت کا اعلان فرمایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ظاہر ہوئے تھے یوں یہ سلسلہ نسل دعاؤں کے جھرمٹ میں آگے بڑھا۔ بظاہر یہ دعا صرف ایک وجود کے لئے تھی مگر رحمتوں کا یہ سارا سلسلہ فیض یاب ہوا۔ نسل در نسل، حالات کی معاندت اور جبر کے باوجود یہ سلسلہ عقیدہ وعمل کی طہارت کا نشان رہا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانیوں کا صدقہ ساری نسل پناہ ربانی میں رہی، کم وبیش چالیس پشتوں تک یہ سلسلہ نسب کی پاکیزگی کے سایوں میں پھیلتا رہا تو حضرت عدنان کا وجود سامنے آیا، پھر تونسل پر تاریخ کی ایسی واضح روشنی پڑی کہ ہر ہر حلقہ زنجیر تابدار ہوتا گیا۔ خود نبی اکرم ﷺ نے اکیس پشتوں تک کو بیان کیا اور ان کی طہارت کی تصدیق فرمائی۔

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا فرماتے تھے۔

ان اللہ عزوجل اصطفی کنانہ من ولد اسماعیل علی الصلاۃ والسلام واصطفی قریشا من کنانۃ واصطفی من قریش بنی ھاشم اصطفانی من بنی ھاشم۔ 1

"بے شک اللہ عزوجل نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو

منتخب کیا اور کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنوہاشم کو اور بنوہاشم سے مجھ کو انتخاب فرمایا۔"

تاریخ عرب کا مطالعہ بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے حتّٰی کہ سخت ترین مخالف بھی نسب کی عظمتوں کی شہادت دیتے تھے جیسا کہ دربار ہرقل شاہ روم میں ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے ذونسب ہونا تسلیم کیا حالانکہ آپ اُس وقت اسلام نہ لائے تھے اور انتہائی معاندانہ رویہ رکھتے تھے۔

خاندان کی عظمت کی یہ بھی واضح دلیل ہے کہ اس کا نسل در نسل ہر فرد معاشرے کا سربرآوردہ فرد رہا معاشرتی منزلت اور سماجی رفعت اس خاندان کا ہمیشہ سے ہی اختصاص رہا۔ اسلام آباء اجداد پر تفاخر کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا مگر آباء واجداد کی شرافت اور پاکدامنی کو ضرور ملحوظ رکھتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اپنے خاندان کے بعض اوصاف بیان فرمائے بلکہ آپ کا شجرہ نسب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں معروف تھا، صحیح بخاری میں سلسلہ نسب یوں ہے۔

محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانۃ بن خزیمۃ بن مدرکۃ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ 2

یہ خاندان مکہ مکرمہ اور اس کے حوالی میں مقیم رہا۔ کعبہ مشرفہ کی تولیت بھی زیادہ تر اسی خاندان کے پاس رہی اس لئے اس کے افراد کو ایک مذہبی تقدس بھی حاصل رہا۔ تاریخِ اسلام اور کتب انساب نے ہر ایک فرد کے حالات بیان کئے ہیں جو یہ دلیل ہے کہ خاندان ہمیشہ سے ہی معزز تھا اور عجب بات یہ ہے کہ اس اعزاز کا اُن کو احساس بھی تھا، خاندان کعبۃ اللہ کے سایوں میں پھلتا پھولتا رہا تا نکہ حضرت

عبدالمطلب جو حضور اکرم ﷺ کے دادا محترم تھے تک یہ سلسلہ پہنچا، یہ حضرت عبدالمطلب ہی تھے جنہوں نے زمزم کا کنواں پھر سے کھودا حالانکہ اُس کا نشان تک مٹ چکا تھا اور مکہ مکرمہ کا کوئی فرد اس محنت پر مائل نہ تھا کہ یہ اُن کے نزدیک لاحاصل کام تھا مگر حضرت عبدالمطلب کا عزم صمیم ایک روحانی کیف کے ساتھ سرگرم عمل رہا اور آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یہ دائمی خیرات پھر سے فیض رساں ہوگئی۔ حضرت عبدالمطلب کو خالقِ کائنات نے بارہ صاحبزادے عطا کئے تھے جو اُن کے دست و بازو تھے مگر ایک خوش کن خواب کی بنا پر آپ اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ کو اس خواب کی تعبیر سمجھتے تھے اور اپنی نسل کی عظمتوں کا نشان گردانتے تھے مگر جب عین جوانی میں شادی کے چند ماہ بعد ہی ان کا ایک سفر کے دوران انتقال ہوگیا اور وہ مکہ مکرمہ سے دور یثرب کی ایک بستی میں محوِ خواب ہوگئے تو بوڑھے باپ کو انتہائی صدمہ ہوا وہ دلفگار ہوگئے اور اب اُن کی دعاؤں کا محور دہ پوتا بن گیا جو ابھی شکم مادر میں تھا تاریخ انسانی حیرت زدہ ہے کہ اتنی اولاد کے باوجود مرکز تمنا وہ وجود کیسے ہوگیا جو ابھی ہویدا بھی نہ ہوا تھا دادا کی صبح و مساء دعا اُسی یوم مسعود کے لئے تھی حتّٰی کہ وہ مرکز دعا ظہور پذیر ہوگا آخر وہ لمحہ سعادت آگیا کہ طواف کعبہ کرتے ہوئے بشارت مل گئی۔

اچانک صبح کی پہلی کرن ہنستی ہوئی آئی
مبارک باد بن کر یہ خبر دادا کو پہنچائی
کہ قسمت نے تری سوکھی ہوئی ڈالی ہری کردی
تیری بیوہ بہو کی گود اپنے نور سے بھردی

12 ربیع الاول کی صبح ابھی طلوع ہوا چاہتی تھی کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کا مکان

سراپا نور بن گیا کون کون استقبال کو آ گیا تھا روایات کی اک قطار ہے، اپنے آئے تھے مکہ مکرمہ کی رشتہ دار خواتین بھی تھیں جو وضعِ حمل میں معاون بنیں مگر وہاں تو عجب معاملہ تھا وہ بھی آگئیں جو صدیوں سے محو خاک تھیں کیوں نہ آتیں کہ یہ مولود مکرم تو سب کے لئے مجسم رحمت بن کر آیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے لے کر حضرت ہاجرہ علیہا السلام حضرت مریم علیہا السلام کے لئے بھی باعث فخر تھا۔ وقت کی سرحدیں ٹوٹ گئی تھیں اور ماضی و حال ایک ہوگئے تھے زمانے کی تنگ نائے ہی نہ ٹوٹی تھی، مکان کی حد بندی بھی مٹ گئی تھی، مکہ مکرمہ کے ایک گھر سے حجابات کے سارے پردے اٹھا دیئے گئے تھے۔ حضرت الشفاء رضی اللہ عنہا جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ ہیں اُن پر سعادت اس قدر نازاں ہے کہ رسول رحمت ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری کی مشاہدہ ہیں کس قدر خوش قسمت تھیں وہ آنکھیں جو سب سے پہلے نور رسالت سے منور ہوئیں یہ صرف ایک احساس ہی نہ تھا بالفعل اظہار تھا فرماتی ہیں کہ جب آپ ﷺ عالم ظاہر میں تشریف لائے تو مشرق و مغرب چمک اٹھا۔ میری نظر اسی طرح نور آشنا ہوئی کہ میں نے اُسی چھوٹے سے گھر کے ایک کمرے میں ہوتے ہوئے بھی شام کے محلات دیکھ لئے، سلام ہے اُن نظروں پر جو سب سے پہلے رُخ تاباں کے نور سے منور ہوگئیں۔

رضاعت:

حضرت عبدالمطلب کی پیرانہ سالی میں مرحوم بیٹے کی نسل میں دریتیم (ﷺ) کا ظہور سارے گھرانے کے لئے بے پایاں مسرتوں کا اعلان تھا۔ ہر طرف سے

مبارک باد کی صدا اٹھ رہی تھی۔ یہ خبر مولد مبارک سے یوں خاندان کے ہر فرد تک پہنچی کہ لمحوں میں پورے مکہ کی فضا مہک اٹھی۔ ہر فرد نے اس راحت افزا خبر کو دوسروں تک پہنچانا ضروری سمجھا ابولہب کی کنیز ثویبہ نے یہ خوش کن خبر ابولہب کو دی تو برادر زادے کی ولادت پر وہ بھی مسحور ہو گیا اور لونڈی کو آزاد کرنے کا علان کر دیا، اگرچہ بعد میں ابولہب بدترین دشمن ثابت ہوا مگر اس عمل خیر کا اجر اُسے قبر میں بھی نفع بخش رہا ساتویں روز عقیقہ بھی ہوا۔ دعوت عام تھی کہ خوشی ہی بے انتہا تھی، دادا محترم نے "محمد" نام رکھا اگرچہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے احمد بتایا تھا، عمومی حیرت ہوئی کہ یہ نام خالصۃً عربی نام ہونے کے باوجود نایاب تھا، دادا محترم سے اس نام کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا۔

أَرَدْتُ أَنْ يَحْمَدَهُ اللهُ فِي السَّمَاءِ وَيَحْمَدَهُ النَّاسُ فِي الْأَرْضِ۔ 3

"میرا مقصد یہ ہے کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ اس کی تعریف کرے اور زمین میں لوگ اس کی ثناء کریں"۔

تعجب ہے کہ یہ الفاظ تو دادا کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر دادا اپنے چہیتے پوتے کے لئے ایسی ہی تمنا رکھتا ہے مگر تاریخ شاہد ہے کہ یہ قدرت کا فیصلہ تھا جو دادا کی زبان سے سنایا جا رہا تھا پس پھر کیا تھا ہر لمحہ مدح وثناء کی ڈالیاں لئے ہی حاضر ہوا اور قیامت تک یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ تاریخ انسانی بھی اسی لمحے کے انتظار میں تھی، کائنات سراپا جستجو میں تھی کہ وہ لمحہ مسعود کب آئے گا کہ تاریخ کی ہمہ جہت نظر اُسی وجہ کائنات پر ٹھہر جائے گی ہر آنے والا لمحہ اس کی صداقت کا شاہد بن کر آئے گا۔

رضاعت کے دورانیہ کے ابتدائی چھ سات روز حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے یہ فریضہ انجام دیا، اور چند روز حضرت ثویبہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہ خدمت ادا کی مگر قدرت سے اس منصب کی اصل کفالت حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کو تفویض ہوئی تھی، عرب کے معاشرتی دستور کے مطابق صحرا نشین صاحبِ اولاد خواتین شہروں کا رُخ کرتی تھیں کہ کفالت کے لئے نومولود بچے حاصل کریں تا کہ اُن کی رضاعت کے عوض مالی مفاد حاصل کر سکیں کہا جاتا ہے کہ سال میں دوبار ایسی خواہش مند خواتین مکہ مکرمہ میں بھی آتی تھیں، چنانچہ اس سال بھی آئیں، ان خواتین میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں جو اپنے شوہر کے ہمراہ کسی خوشحال خاندان کے بچے کی تلاش میں تھیں مگر سواری کی نارسائی کے باعث تاخیر کا شکار ہوئیں اور قدرے مایوس ہو گئیں۔ یتیمی کی خبر خوشگوار اثر نہ چھوڑتی تھی، مگر یہ نارسائی کس قدر خوش بختی کا پیغام بنی کہ حضرت عبدالمطلب تک آ گئی، مالی فوائد کی کمی کا بھی احساس تھا مگر کلیۃً محرومی کا بھی ملال تھا، حضرت عبدالمطلب نے نام اور قبیلہ پوچھا تو کہا حلیمہ سعدیہ نام ہے اور سعد قبیلہ ہے۔ برکات سے آشنا دادا نے کہا کہ تو میرے پوتے کے لئے مناسب ہے کہ پوتا انتہائی بابرکت ہے اور تجھ میں بھی حلیمی اور سعادت کے اوصاف موجود ہیں۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ رضاعت کی ذمہ داری ایسی نیک خصال بدوی خاتون کے سپرد کر دی جائے۔ شوہر سے مشورہ ہوا اُس نے بھی خالی لوٹنے کے بجائے اسی نومولود کی رضاعت پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہنے لگا، اسے ہی لے لو، شاید رب کائنات اسی کے حوالے سے ہماری پریشانیاں دور کر دے، خواہش قبولیت کے حصار میں تھی فیصلے کے مطابق حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے نورِ مجسم کو حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا گود لیا ہی

تھا کہ رحمتوں کی پناہ حاصل ہوگئی واپس لوٹی تو وہ اونٹنی جو چلنے سے بھی عاجز تھی ایک سبک خرام اونٹنی کی طرح بھاگ اٹھی۔ ساتھ آنے والی حیرت سے پوچھتی تھیں کہ کیا اونٹنی بدل لی ہے جواب تھا نہیں وہی تو ہے اور اونٹنی کا منہ دکھا دکھا کر اعتماد دلا رہی تھیں احساس ہو چلا تھا کہ سواری نہیں سوار بدلا ہے۔ بنوسعد کے علاقے میں دوسال رضاعت کا دورانیہ برکات کے نزول کا زمانہ تھا۔ وہاں یہ بابرکت وجود حلیمہ رضی اللہ عنہا کے لئے ہر آسائش کا سبب بنا۔ بکریاں چرانے میں والد کا معاون بنا تو خشک سالی کے باوجود خوراک کی کمی نہ ہوئی، اسی دوران میں شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا، جس سے کفالت کرنے والا خاندان کچھ گھبرایا بھی مگر حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی پر کیف تسلی نے حوصلہ بڑھائے رکھا۔ رضاعت کی مدّت کے بعد بھی بنوسعد میں قیام رہا۔ تقریباً پانچ سال نبی اکرم ﷺ نے حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گزارے اور پھر مکہ مکرمہ واپس اپنی والدہ ماجدہ کے پاس آگئے، سال پھر وہاں اپنے خاندان میں گزارے تو والدہ ماجدہ نے یثرب کے سفر کا ارادہ کیا۔ سفر کا محرک کون سا ارادہ تھا اس میں قدرے اختلاف ہے مگر راجح قول یہی ہے کہ والدہ ماجدہ حضور اکرم ﷺ کو اپنے شوہر اور آپ کے والد ماجد کی قبر پر لے کر گئی تھیں۔

نبی اکرم ﷺ کے والد گرامی حضرت عبداللہ اپنی شادی کے چند ماہ بعد ہی تجارت کی غرض سے ملک شام گئے تھے، واپسی پر یثرب سے گزرے تو وہاں علیل ہوگئے اور سفر مناسب نہ سمجھتے ہوئے وہاں ہی ٹھہر گئے، قافلہ واپس آگیا تو آپ کا یثرب میں ہی انتقال ہوگیا اور دار النابغہ میں دفن کر دیئے گئے بوڑھے باپ کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور بیوہ بہو پر شفقت بڑھ گئی، دادا کی اسی سراپا محبت کے سایوں میں

ولادت ہوئی اور رضاعت کے دن گزرے، حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا یثرب آئیں تو بنوعدی بن النجار کے ہاں قیام کیا جن سے خاندانی نسبت بھی تھی ایک ماہ کے قریب قیام رہا واپس آرہی تھیں کہ بیمار ہوگئیں اور ابواء کے مقام پر انتقال فرماگئیں۔ نبی اکرم ﷺ ام ایمن کے ساتھ مکہ مکرمہ واپس آئے اور دو سال دادا کی کفالت میں رہے۔ اُن کی وفات پر سرپرستی کی ذمہ داری چچا حضرت ابوطالب کو تفویض ہوئی۔ اُن کے ساتھ آپ ﷺ نے ایک طویل عرصہ گزارا، سفر بھی کئے اور معاشرتی زندگی کے کئی روپ بھی دیکھے حتّٰی کہ نبوت کا اعلان بھی اُن کی زندگی میں ہی ہوا۔

مکہ مکرمہ میں حضور اکرم ﷺ نے ایک باوقار زندگی گزاری۔ مکہ مکرمہ کے ماحول میں متعدد نظریاتی اور عملی قباحتیں جنم لے چکی تھیں بت پرستی عام تھی حقوق کی پامالی روزمرہ تھی مگر آپ ﷺ کی حیات مبارکہ اس مسموم فضا میں بھی عطر بیز رہی اور معصومیت کا مرقع رہی تجارتی سرگرمیاں مکہ مکرمہ کے ماحول میں قریش کا ذریعہ روزگار تھیں آپ ﷺ بھی ان میں حصہ لیتے رہے۔

حلف الفضول:

عربوں کی زندگی میں چار مہینے حرمت والے تھے کہ ان میں کسی قسم کی جنگ اور تصادم عرب رواج کے مطابق ممنوع تھا۔ تین مہینے مسلسل تھے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم محسوس ہوتا ہے کہ یہ مہینے ایام حج میں معاشرتی ٹھہراؤ کے لئے مقرر ہوئے تھے مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ قریش کے قبائل اور قبیلہ قیس کے درمیان ایک ناپسندیدہ جنگ انہیں مہینوں میں لڑی گئی اس لئے حرب فجار کہلائی۔ اس جنگ نے

معتدل ذہنوں پر بڑا منفی اثر ڈالا چنانچہ برسرِ پیکار گروہوں میں بھی اس پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوا۔ یہ جنگ ایک اہم سماجی پیش رفت کا سبب بنی اور حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی تحریک پر عبداللہ بن جدعان ایک سردار کے ہاں چند نیک نفس افراد کا اجتماع ہوا اور ایک معاشرتی تحفظ کا معاہدہ طے پایا۔ چونکہ اس معاہدے کے اہم شرکاء کے نام فضل سے شروع ہوتے تھے اس لئے یہ معاہدہ ''حلف الفضول'' کے نام سے معروف ہوا اس معاہدے میں نبی اکرم ﷺ اپنے قبیلے کو حق پر سمجھتے ہوئے شریک ہوئے مگر عملاً جنگ میں حصہ نہ لیا تھا اس معاہدے کی افادیت کا آپ بہت بعد بھی ذکر کرتے رہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی:

نبی اکرم ﷺ کی ظاہری عمر مبارک کے پچیس سال مکمل ہونے کو تھے کہ تجارت کے انہماک کی خبر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تک بھی گئی جو مکہ مکرمہ کی نامور اور قابلِ اعتماد خاتون تھیں اور تجارتی سرگرمیوں میں بہت نیک نام تھیں۔ دو مرتبہ اُن کی شادی ہو چکی تھی مگر اب بیوہ تھیں اور دونوں سابقہ شوہروں سے اولاد بھی رکھتی تھیں۔ مکہ مکرمہ اور عرب کے اکثر نمایاں فرد اُن سے شادی کے متمنی تھے کہ اُس ماحول میں آپ کی شہرت نہایت درجہ پاکدامن خاتون کی تھی اسی لئے طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے عملی باخبری کے لئے ہی آپ ﷺ کو اپنی تجارت میں عملی شراکت کی دعوت دی، چنانچہ حضور اکرم ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامانِ تجارت لے کر ملک شام کی طرف گئے اس سفرِ تجارت میں میسرہ نامی غلام بھی ساتھ تھا، شام

میں سامان بسہولت فروخت ہو گیا، واپس لوٹے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ تجارت کے حوالے سے میسرہ سے معلومات حاصل کئیں، میسرہ نے طریق تجارت اور انداز فروخت کا نہایت احترام سے تذکرہ کیا۔ بس اب کیا تھا خواہش زبان پر آ گئی، اپنی ایک رازدار نفیسہ کے ذریعے نامہ و پیغام ہوا اور دونوں خاندانوں کے بزرگوں کی رضامندی سے نکاح ہوا۔ اس وقت عمر مبارک پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چالیس سال کی تھیں۔ آنے والی نسلوں کو عمر کے حوالے سے فیصلہ کرنے کی بجائے عقل و شعور اور کردار و سیرت کی روشنی میں فیصلے کرنے کا ایک لائق تقلید اسوۂ قائم ہوا۔ حضرت ابوطالب نے خطبہ نکاح پڑھا جس میں اپنے خاندان کی شرافت اور معاشرتی برتری کا حوالہ دیا، نبی اکرم ﷺ کی رفعت و منزلت کا حوالہ بڑا نمایاں طور پر دیا گیا۔

اِنَّ ابْنَ اَخِیْ هٰذا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللهِ (ﷺ) لَا یُوْزَنُ بِرَجُلٍ اِلَّا رَجَحَ بِهٖ۔[4]

''بے شک یہ میرا بھتیجا محمد بن عبداللہ (ﷺ) ہے، اس کا کسی بھی آدمی سے مقابلہ کیا جائے تو یہ اُس سے بھاری ہوگا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ سب سامعین کی سماعتیں اس رفعتِ شان کی خاموش گواہی دے رہی تھیں اس رشتہ کی استواری کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی توجہ پہلے سے بھی زیادہ حسنات کی ترویج اور مشق کی طرف بڑھ گئی۔ دنیا بھر کے انسانوں کو سمجھا دیا گیا کہ عائلی ذمہ داریاں کسی صورت بھی معاشرتی رویوں میں لاتعلقی کا موجب نہیں بنتیں، تاریخ گواہ ہے کہ بعد کا کردار اور بھی زیادہ نکھر کر سامنے آیا اور پورے ماحول پر اثر انداز ہونے لگا۔

حجراسود کی تنصیب:

کعبۃ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے وقت سے ہی مرکز عبادت قرار پایا تھا نہ صرف یہ کہ اہل مکہ یعنی قریش ہی اس کی تعمیر وتزئین کے ذمہ دار گردانے جاتے تھے سارے عرب کی نگاہیں بھی اسی گھر کے لئے جھکی جھکی رہتی تھیں۔ مرور ایام سے اور کچھ موسمی حالات کی وجہ سے کعبۃ اللہ کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا گیا۔ رسول اکرم ﷺ بھی قریش کے دیگر افراد کے ساتھ شریکِ تعمیر ہوئے۔ پتھر لاتے اور مناسب جگہ نصب کرتے۔ یہ اہل مکہ کے لئے مشکل مرحلہ تھا کہ اُن کی معیشت رزق حلال پر انحصار نہ رکھتی تھی مگر یہاں انہوں نے خلوص دل سے رزق حلال کی قید لگائی تھی۔ ظاہر ہے ایسا رزق کمیاب تھا اس لئے اس کی تکمیل میں متعدد مشکلات تھیں مگر ارادہ پختہ تھا اس لئے تعمیر مکمل ہوگئی اور حجر اسود کی تنصیب کا مرحلہ آ گیا، اس پر اختلاف ہوا کہ یہ اعزاز ہر قبیلے کی خواہش کا مقصود تھا، باہمی اختلاف اس قدر بڑھا کہ اسکے حصول کے لئے تلواریں بے نیام ہونے لگیں، صورتِ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بزرگوں نے مشورہ دیا کہ اس کا فیصلہ یوں کرلیا جائے کہ سحر کے وقت جو سب سے پہلے بابِ شیبہ سے حرم میں داخل ہو، وہی اس نزاع کا فیصلہ کرنے کا مجاز ٹھہرے، سب انتظار میں بیٹھ گئے مگر تمنائی نظروں نے کیا دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے حرم میں داخل ہوئے، دیکھنا تھا کہ سب پکار اٹھے۔

ھٰذَا الْاَمِیْنُ، رَضِیْنَا، ھٰذَا مُحَمَّدٌ۔ [5]

''یہی تو امن دہندہ ہے ہم سب اس پر راضی ہوئے۔ یہ تو محمد (ﷺ) ہیں''

رَضِیْنَا ' کا آوازہ اس لئے بلند ہوا کہ وہ سب آپ کی اخلاقی قوت اور فیصلہ کن رویے کو جانتے تھے، چنانچہ جو وہ سمجھتے تھے وہی ہوا، چادر بچھائی گئی۔ حجر اسود اُس پر رکھا گیا۔ سب قبائل کے نمائندوں نے اطراف کو پکڑا اور اٹھایا۔ اپنی جگہ کے قریب پہنچا تو خود رسول اکرم ﷺ نے حجر اسود اٹھایا اور مقرر جگہ پر رکھ دیا یوں جھگڑا ٹل گیا اور اہل مکہ پر پھر ایک مرتبہ قوت فیصلہ کی متانت واضح ہوگئی یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت اہل مکہ کی تربیت کر رہی تھی اور درِ رحمت کے قریب آنے کے اشارے دے رہی تھی۔

آنحضرت ﷺ ایک احترام کے ہالے میں مکہ مکرمہ میں زندگی گزار رہے تھے، ہر طرف سے سپاس گزاری کے جذبات اُمڈ رہے تھے، باوجود یکہ آپ نے کبھی اہل مکہ کی طرح بت کے سامنے نہ تو سجدہ کیا اور نہ ہی بتوں کو احترام کی نظر سے دیکھا، اخلاق وکردار میں بھی اکثر اہل مکہ کے ہمنوا نہ تھے، صادق وامین کے القاب آپ کی مکی زندگی کے درخشاں حوالے ہیں۔ کیا عظمت تھی کہ وہ لوگ امین کہہ کر پکار رہے تھے جو امانت کے تقاضوں کو بھول چکے تھے، تعجب ہے کہ وہ ہمعصر آپ کی صداقت کے شاہد تھے جنہیں شاید صداقت شعاری کی عادت نہ رہی تھی، اخلاق وکردار کی پاکیزگی اور عظمت یوں مانی گئی کہ پورے جاہلی دور میں کسی جانب سے بھی کوئی حرف اعتراض سنائی نہ دیا، ماحول میں احترام کی فضا تھی مگر قلب اطہر ماحول کی سنگینی سے بیزار تھا اور خلوت کدے تلاش کرتا تھا، ایسا ہی ایک خلوت خانہ غارِ حراء تھی جہاں نبی اکرم ﷺ کئی کئی دن تنہا گزارتے تھے اور عبادت گزاری اور عرفانِ نفس کے کیف سے سرشار رہتے تھے۔

ابتداءِ وحی:

خلوت گزینی کی عادت پختہ ہوتی جا رہی تھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس میلانِ طبع سے آشنا تھیں اس لئے کئی کئی روز کا سامان خورد و نوش تیار کر دیتی تھیں۔ وفا شعار بیوی کو تنہائی کا درد تو محسوس ہوتا ہوگا مگر انہیں حضور اکرم ﷺ کی مسلسل غیابت پر کسی قسم کا اعتراض نہ تھا، یہ باہمی اعتماد کی وہ منزل تھی جو رفیقہ حیات کو سیرت کی شہادت سے حاصل ہو چکی تھی ایک دن ایسا ہی تعبد و تحنّث کا سماں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ سے خطاب کیا کہ ''اِقرأ'' پڑھیے آپ نے اسی متانت سے جواب دیا۔ ''مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ'' میں تو قاری نہیں ہوں یعنی پڑھنے والا نہیں، جبرئیل علیہ السلام نے جسم رسالت کو اپنے ساتھ پوری شدت سے بھینچا اور پھر سوال کیا جواب حسب سابق تھا، تین مرتبہ یہ عمل ہوا اور ہر بار ''میں پڑھنے والا نہیں'' ہی جواب تھا مگر چوتھی مرتبہ جبرئیل علیہ السلام کے پڑھنے کا مطالبہ قدرے مختلف تھا۔ عرض کیا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ (العلق:1)

پڑھیے اُس اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔

مسلسل چار آیات پڑھی گئیں اور نبی اکرم ﷺ مسلسل آیات پڑھتے گئے، کلامِ الٰہی سے باخبری کی حد یہ تھی کہ جب بھی قرآن شروع ہوا پڑھنا شروع کر دیا اس انعام ربانی کے بعد گھر واپس آئے تو ایک لرزہ طاری تھا کہ کس قدر بڑی ذمہ داری تفویض ہوگئی ہے۔ ''زَمِّلُوْنِی'' حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو کہ عطائے ربانی کے کیف سے تسکین پاؤں، صحیح بخاری میں کیف بدء الوحی

کے باب میں ساری کیفیت تفصیلاً بیان ہوئی ہے جس میں ورقہ بن نوفل کے ہاں جانے کا بھی تذکرہ ہے اور رسالت کی مشکلات کا بھی اظہار ہے، اس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو جواب دیا وہ سیرت نگاری کا تمہیدی بیان ہے۔ فرمانے لگیں آپ اس پر پریشانی میں کیوں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ [6]

''ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی بے آبرو نہیں کرے گا، آپ تو بے شک صلہ رحمی کرتے ہیں اور دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محروموں کے لئے کماتے ہیں یعنی اُن کی خاطر مال دیتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی خاطر آنے والی مصیبتوں پر مدد کرتے ہیں''۔

یہ پانچ فضائل سیرت رسول ﷺ کے وہ اساسی حوالے ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے اور بعد کے سیرت نگار کے لئے راہنما قرار پائے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان واضح کر رہا ہے کہ آپ کا مشاہدہ کس قدر گہرا تھا اور قابل قدر تھا، یہ نزول وحی کی ابتداء تھی جو معتبر روایات اور نصِ قرآنی کے مطابق رمضان المبارک میں ہوئی۔ پھر کچھ عرصہ کے لئے وحی کی آمد رکی رہی آثار ظاہر ہوتے رہے مگر تسلسل وحی کی ابتداء سورۃ المدثر سے ہوئی جس میں تبلیغ کا واضح حکم آگیا کہ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② (المدثر:1)

''اے چادر اوڑھنے والے اٹھئے اور لوگوں کو ڈرائیے۔

یوں کہہ سکتے ہیں کہ اقرا سے نزول قرآن کی ابتداء ہوئی تو سورۃ المدثر سے

تبلیغ کا حکم ملا۔

آغاز قرب رکھنے والوں سے ہوا درِ تسلیم پر سب سے پہلے آنے والوں میں سرفہرست تو حضرت خدیجہ ؓ ہیں جو رازدارِ کردار وسیرت تھیں ، حضرت ابوبکر صدیق ؓ اہل مکہ میں سے سب سے زیادہ قریب تھے انہیں بھی پہلا اعلان ہی درصداقت وتصدیق پر لے آیا۔ حضرت علی ؓ سایہ رحمت میں پلے تھے اس لئے وہ اولین ایمان لانے والوں میں نمایاں رہے۔ حضرت زید بن حارثہ ؓ خدمت گار تھے اور واقفِ حال تھے انہوں نے بھی قبولیت کا شرف حاصل کرلیا۔ یوں یہ قافلہ رشد وہدایت رواں دواں ہوا۔ حضرت صدیق اکبر ؓ مکہ مکرمہ کی سوسائٹی میں بلند منزلت تھے اس لئے ان کی مساعی بھی بہت بارآور ہوئی۔ آپ کو تبلیغ سے۔

حضرت عثمان بن عفان ؓ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ

حضرت زبیر بن القوام ؓ

حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ

حضرت طلحہ بن عبیداللہ ؓ

دائرہ یقین وایمان میں آئے یہ پانچوں اصحاب ، عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں پھر مسلسل تبلیغ سے اسلام لانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اہل مکہ کے بعض صالح طبیعت کے حامل افراد مسلمان ہوئے تو غلاموں کی ایک بڑی تعداد بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوتی گئی۔

اسلام قبول کرنے والوں کا یہ اضافہ سردارانِ قریش کو پسند نہ تھا اسلئے مخالفت

کی ایک آندھی اٹھی جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ؓ اور حضرت عمر بن الخطاب ؓ تین روز کے وقفے سے اسلام لے آئے تو مسلمانوں کو اک گونہ اعتماد حاصل ہوگیا مگر ان کے اسلام لانے سے مخالفت میں بھی شدت آگئی، معاشی طور پر پس ماندہ افراد اور معاشرتی حوالوں سے چھوٹے لوگ قریش مکہ کے ظلم کا سخت نشانہ بنے ، برسرِ میدان اذیتیں دی جاتیں اور کھلے عام نشانہ ستم بنائے جاتے ، حالات لگاتار ناقابل برداشت ہوتے جارہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس سارے ظلم وبربریت کا مشاہدہ کررہے تھے۔ اطاعت شعاروں کا یقین تو متزلزل نہ ہورہا تھا مگر جفاکاری حد سے بڑھ رہی تھی اس پر نبی اکرم ﷺ نے ہجرت حبشہ کی اجازت مرحمت فرمادی۔ ہادی اعظم ﷺ کا استقلال دیکھئے کہ اپنے جانثاروں کو جائے حفاظت کی طرف چلے جانے کا حکم دے دیا مگر خود مکہ مکرمہ ہی میں رہے، یہ اسوۂ تھا بعد میں آنے والے راہنماؤں کے لئے کہ انہیں میدان جفا سے پیچھے نہیں ہٹنا ہے جب تک ساتھیوں کا کوئی فرد بھی ستم کدے میں موجود ہے پانچ سن نبوی میں ہجرت حبشہ ہوئی۔ ابتداء میں گیارہ اصحاب اور چار صحابیات حبشہ منتقل ہوئے بعد میں تعداد بڑھتی گئی اور تقریباً تراسی ہوگئی اہل محبت کے لئے یہ پرسکون دن تھے۔ نجاشی شاہ حبش نیک دل بادشاہ تھا۔ نصرانی تھا مگر حق کی بات سننے پر مائل تھا حضرت جعفر طیار ؓ کی دربار میں تقریر جو اسلام کے بنیادی احکام کی عکاس تھی کارگر ثابت ہوئی اور قریش مکہ کا وفد جو ان مسلمانوں کو اہل مکہ کا باغی قرار دینے پر زور لگا رہا تھا ناکام ہوا اس وفدِ قریش کے سرخیل حضرت عمرو بن العاص تھے جو اُس وقت تک اسلام نہ لائے تھے۔ ہجرت حبشہ عافیت کا ایک بہتر وسیلہ ثابت ہوئی مگر جو باقی رہ گئے تھے وہ مزید ظلم کا نشانہ بنے ، قریش مکہ اسی پر جز بز

تھے کہ اتنا ظلم بھی اشاعتِ اسلام کی راہ کی رکاوٹ نہیں بن سکا، بالآخر انہوں نے معاشرتی وسماجی مقاطعہ کا فیصلہ کیا، مسلمان شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور ہوگئے۔ بائیکاٹ کا ایک ظالمانہ فیصلہ ہوا اور تحریر کعبۃ اللہ میں آویزاں کردی گئی۔ تین سال کا یہ محاصرہ ہمتوں کو مسمار کرنے کے لئے کافی ہوسکتا تھا اگر رحمت عالمین ﷺ کی بصیرت آفروز راہنمائی نصیب نہ ہوتی۔ اہل مکہ کے نزدیک یہ انتہائی اقدام تھا مگر مسلمانوں کے حوصلوں کے سامنے پاور ہوا ثابت ہوا۔ مسلمان اسی جبری بندش میں بھی ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے ارادوں پر فتح عطا فرمائی۔

ظلم وستم کی داستان طویل ہوتی جارہی تھی کہ ملت اسلامیہ کو دوصدمے برداشت کرنے پڑے، حضرت ابوطالب جو آنحضرت ﷺ کی آٹھ سال کی عمر میں کفالت کے ذمہ دار گردانے گئے تھے چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ حفاظت رسول ﷺ کا فریضہ نبھاتے رہے، اس قدر باوقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے کہ ان کی موجودگی میں کفر کو آخری حد تک جانے سے جھجک ہی رہی۔ شعب ابی طالب سے آزادی نصیب ہوئی ہی تھی کہ آپ کا وقت اجل آگیا، یہ ایک صدمہ تھا جو ہر کسی نے محسوس کیا، ابھی اس جانکاہ صدمے سے سنبھلے ہی نہ تھے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ یہ صدمے پر صدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کے لئے بھی اور سارے مسلمان گروہ کے لئے بھی انتہائی دکھ کی بات تھی اس لئے اس سال کو عام الحزن شمار کیا جاتا ہے اب تو حضرت ابوطالب کی شخصیت کا حصار بھی باقی نہ تھا اور کاشانہ رسالت بھی تنہائیوں کا شکار ہوگیا تھا اس لئے قریش مکہ کو موقع ملا کہ ظلم کی آخری حد تک جائیں مگر رسول اللہ ﷺ کا عزم جوان اور ارادے مستحکم تھے۔

آنحضرت ﷺ اپنے مشن کی اشاعت کا عزم لئے طائف تشریف لے گئے خیال تھا کہ یہ خوش حال لوگوں کی بستی ہے، تجربے کی بھی فراوانی ہے، حق وصداقت کی باتیں اثرانداز ہوں گی، صرف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لئے پیدل ہی طائف روانہ ہوگئے وہاں پہنچ کر پیغامِ حق سنایا مگر یہاں کا تو مزاج ہی انوکھا تھا، طائف کے سرداروں نے ہتک آمیز سلوک کیا۔ طنز کے تیر چلائے اور اوباش لڑکوں کو پیچھے لگادیا، پتھر مارے گئے آوازے کسے گئے، بہت کوشش کی مگر نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا اس لئے واپس لوٹ آئے، رسول اللہ ﷺ زخمی تھے خون آلود تھے مگر معاندین بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے، حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا، عرض کیا کہ ان لوگوں کے لئے بددعا فرمایئے تاکہ ان کو کئے کی سزا ملے مگر رحمت عالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ اسلام نہیں لاتے تو ان کی آنے والی نسلیں ضرور ایمان لے آئیں گی، بددعا نہ فرمائی اور رحمت کا رویہ ہی اسوہ بنایا۔

مکہ مکرمہ اور گردونواح کے حالات سازگار نہ تھے، کیا ان نامساعد حالات سے نشرِ خیر کا کارواں رُک جاتا، یہی تو آنے والی نسلوں کو سبق دینا تھا کہ ایک راستہ مسدود نظر آئے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ متبادل راستے استعمال کرنے چاہیں۔ اہل وطن کا رویہ درست نہ پا کر باہر سے آنے والوں کو دعوتِ فکر دینے کا ارادہ کرلیا، حج کے ایام ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا قافلوں تک رسائی پائی، یثرب کے چند افراد بھی حج ادائیگی کے حوالے سے منیٰ میں موجود تھے۔ اُن کو دعوت دی وہ لوگ یہود کی قربت کی وجہ سے ایک آنے والے نبی کا سن چکے تھے، ہمہ تن گوش ہوگئے، پیغام حق سنایا گیا تو دلوں پر دستک ہوئی اور قبولیت کا رویہ اپنایا یہ انتہائی خوش کن

لمحہ تھا۔ وہ لوگ واپس گئے اور اگلے سال تک اس دعوتِ حق کا تذکرہ کرتے رہے۔

معراج النبی ﷺ:

حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات نے ایک غمگین فضا پیدا کر دی تھی عام الحزن کی تلخیاں بہت تھیں کہ خالقِ کائنات نے اس غم کا ازالہ یوں کر دیا کہ ''معراج'' کی عظمت عطا کر دی، محبوب کریم ﷺ کی توجہ عرب کے معاند معاشرے سے ہٹائی گئی کہ اگر اہل مکہ پتھر برساتے ہیں راستوں میں کانٹے بچھاتے ہیں تو کیا ہوا ذرا آسمانوں پر آیئے اور دیکھئے کہ کس طرح فرشتے قطار در قطار استقبال کرنے کو تیار ہیں مکہ والوں کے پتھروں کو نہ دیکھئے۔ قدسیوں کے پھول برسانے پر توجہ دیں۔ سرداران قریش کے راہ کاٹنے کی پرواہ نہ کیجئے اولوالعزم رسولوں کا آسمانی راستوں پر استقبال ملاحظہ کیجئے کہ آپ صرف اہل مکہ کے رسول تو نہیں ہیں کائنات ارض وسماء کے رسول ہیں۔ 27 رجب کی رات عروج کی رات تھی حرم سے براق، برق رفتاری سے روانہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں سید الملائکہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔ سفر کی پہلی منزل مسجد اقصیٰ تھی کہ یہاں ماضی میں تشریف لانے والے تمام انبیاء ورسل قطار در قطار منتظر تھے کہ امام الانبیاء تشریف لا رہے ہیں، وہاں خیر مقدمی محفل ہوئی اور سرور کائنات ﷺ عالم وبالا کی طرف روانہ ہوئے۔ آسمانوں کے دروازے کھلتے گئے۔ استقبالی مرحلے طے ہوتے گئے اور انبیاء کرام علیہم السلام ملتے گئے آپ آسمانوں کو عبور کر گئے۔ راستوں میں عجائبات کا ایک جہان آباد تھا، سب کو ملاحظہ کرتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ تک آ گئے یہاں رفیق سفر جبرئیل علیہ السلام نے آگے

بڑھنے سے معذرت کی کہ یہی اُن کی آخری حد تھی مگر نبی اکرم ﷺ کا سفر جاری رہا۔ اب کسی ساتھی کی بھی ضرورت نہ تھی۔ راہ یاب نبی فاصلوں کو طے کرتا ہوا حظیرۂ قدس میں آ پہنچا قاب قوسین کی منزل آ گئی اور اپنے خالق کے روبرو ہو گئے، ساری مخلوق میں سے ایک آپ ہی تھے جن کو دنیٰ فتدلیٰ کی رفعتیں حاصل ہوئیں اور دیدارِ خاص سے آپ ہی نوازے گئے، نمازوں کا تحفہ لئے واپس لوٹے تو لمحوں کو ٹھہرے ہوئے پایا قرآن مجید نے بھی لَیلاً فرما کر راز کو راز ہی رہنے دیا۔ صبح ہوئی تو حرم میں رات کے اس سفر کا تذکرہ فرمایا۔ مادیت آشنا قریش حیران تھے، اُن کی سمجھ میں ایسی رفعت آ بھی کب سکتی تھی مگر راز دار نبوت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تسلیم کا ایسا شعور حاصل تھا کہ سنتے ہی تصدیق کر دی اسی طرح صدیق کا لقب پایا اور تصدیق کا حق ادا کر دیا، کفار مکہ انکار ہی کرتے رہے کہ اُن کی کوتاہ عقل ایسی رفعتوں سے آشنا نہ تھی۔

ہجرت مدینہ منورہ:

اہل مکہ کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ شانِ رسالت کی بلندیوں کا جلد ادراک کر سکیں، یثرب والے خوشگوار حیرت سے پیغام نبوی سن کر واپس لوٹے تھے۔ اُن کی محبت آمیز گفتگو نے یثرب میں اشتیاق زیارت فروزاں کر دیا۔ گیارہ بارہ افراد اسلام قبول کر کے واپس لوٹے اگلے سال تہتر مرد اور دو عورتیں اس قافلہ خیر میں شامل تھیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی، یثرب میں اسلام ان ابتدائی مسلمان ہونے والے خوش قسمتوں کے ذریعے پھیلنا شروع ہوا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جن کو ایک معلم کے طور پر بھیجا گیا تھا، نے

اہل یثرب میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اسلام اس تیزی سے پھیلا کہ تقریباً ایک سال
کے محدود عرصہ میں پورا یثرب دامن اسلام میں آچکا تھا اور جب نبی محترم ﷺ نے
یثرب کو ہجرت فرمائی تو سارا یثرب حتّٰی کہ بچے، بچیاں بھی استقبالی ترانے گا رہے
تھے۔ یثرب کی طرف سے جانفزا ہوا آ رہی تھی اس لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنے
اصحاب کو آہستہ آہستہ یثرب چلے جانے کی اجازت رحمت فرما دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ یثرب میں مہاجرین مکہ کی تعداد مسلسل بڑھتی گئی مگر رسول اکرم ﷺ چند
جانثاروں کے ساتھ مکہ مکرمہ ہی میں رہے تا آنکہ اذن پروردگار نے ہجرت کی تکمیل کا
اشارہ دے دیا۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ اسوۂ بھی قوم کے لئے راہنما ہے کہ قوم کی حفاظت
سربراہ قوم کے لئے ضروری ہوتی ہے نہ کہ سربراہ محفوظ مقام پر چلا جائے اور ساتھیوں
کو ظلم سہنے پر مجبور کر دے، یہ حوصلہ بیدار ہوتا ہے تو مصائب کی زنجیریں کٹ جایا کرتی
ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد مکہ مکرمہ میں کم ہوتی جا رہی تھی، دشمن کو محفوظ پناہ گاہ کا دکھ
کھائے جا رہا تھا اسی لئے اُن کے خیال میں مہلت کم رہ گئی تھی مشورہ ہوا
دارالندوہ، سردارانِ قریش سے اٹا پڑا تھا ہر کوئی اپنے تجربات کی بنیاد پر مشورہ دے
رہا تھا مگر ایک شیطان صورت کا مشورہ سب کو پسند آیا کہ ہر قبیلے سے تلوار زن افراد
لے لئے جائیں اور کاشانۂ نبوت کا گھیرا ڈال لیا جائے تا کہ جب آپ ﷺ صبح کو
گھر سے نکلیں تو یکبارگی حملہ کر دیا جائے اس سے کام بھی تمام ہو جائے گا۔ اور الزام
بھی کسی ایک پر نہ آئے گا یہ تو اُن کی تدبیر تھی جو آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی نہ کر
رکھتے تھے اور بنو ہاشم کے انتقام کا سامنا بھی نہ کر سکتے تھے مگر انسان کی تدبیر، تقدیر

کے فیصلوں کو کب روک سکتی ہے۔ صبح کے آثار نمودار ہوئے تو نبی اکرم ﷺ روانگی
کے لئے تیار ہوئے ایسے نازک موقعہ پر بھی اخلاق عالیہ کا وہ منظر پیش کرنا تھا جو
انسانیت کے لئے دائمی اسوہ بنے، دشمنی کے حصار کا اہتمام کرنے والوں کی امانتیں
نبی کریم ﷺ کے پاس تھیں۔ حیرت ہے کہ وہ لوگ قتل کے ارادے سے آئے تھے
مگر انہیں اپنی امانتوں کی پرواہ نہ تھی واضح ہو رہا تھا کہ جان کا دشمن بھی امانت کے محفوظ
ہونے کا یقین رکھتا تھا۔ یہ وہ سربلندی تھی جس کا اقرار شمشیر بدست دشمن کو بھی تھا۔
رسول اکرم ﷺ نے یہ امانتیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے کی کہ مالکوں کو
لوٹا دی جائیں، یہ دشمن سہی مگر امانتیں انہیں کی ہیں اور صاحب امانت ہونے کی یہ دشمن
بھی شروع سے ہی گواہی دے رہے ہیں۔ سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے
نبی رحمت ﷺ گھر سے روانہ ہوئے کھچی ہوئی تلواریں تنی رہ گئیں اور رب کی پناہ
میں رہنے والا وجود بسہولت وہاں سے گزر گیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان پر
گیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رمز شناس تھے، بھانپ چکے تھے کہ سفرِ ہجرت کا آغاز
ہونے والا ہے اس لئے منتظر تھے اُن کو ساتھ لیا اور یہ قافلہ رشد و ہدایت مکہ مکرمہ سے
روانہ ہو گیا، خاندان صدیقی نے کس طرح ایثار کیا، بچے، بچیوں نے کس قدر جانثاری کا
مظاہرہ کیا کہ کسی نے ذات النطاقین کا لقب انعام میں پایا تو کوئی غار ثور تک رابطوں
کا نگران کہلایا۔ کہنے کو تو وہ ایک غار تھی مگر پناہِ رسالت کے حوالے سے مرجع عقیدت
بن گئی تھی غار کو ہر ممکنہ خطرے سے پاک کرنے کا فریضہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
نے انجام دیا۔ تاریخ کے صفحات پر یہ داستانِ عزیمت یوں رقم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا
ابدی کلام اس کی شہادت بن گیا۔ تین دن کے قیام میں بلا شرکت غیر کیا کیا راز و نیاز

ہوئے کیسی تدبیریں مرتب ہوئیں اور کس طرح کی نوازشیں ہوئیں یہ تو راز ہی رہا مگر ایک بات واضح ہوگئی کہ ممکنہ اذیت رساں سے حفاظتِ رسالت کا منصب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہوا۔ فتنوں پر ایسا قدم رکھا کہ کسی فتنے کو سراٹھانے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ قوم کو یہ پیغام دیا گیا کہ حفاظتِ رسالت کا مشن عزیز ہو تو یارِ غار کے قدموں سے راہنمائی لے لیا کرو۔

سفرِ ہجرت کے دوران میں کئی واقعات پیش آئے کبھی سراقہ (رضی اللہ عنہ) کا تعاقب درپیش تھا تو کبھی بنو اسلم کے لوگ پیچھا کر رہے تھے مگر حیرت اس الٰہی فیصلے پر ہے جو بھی آیا سراپا انکسار بن کر حاضر ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت مدینہ کامرانیوں کی حکایات سے لبریز ہے۔ ام معبد (رضی اللہ عنہا) کا ڈیرا راستے میں آیا تو ایک بدویہ کی فصاحت لسانی سیرت کا دائمی حوالہ بن گئی۔ آخر کار یہ قافلہ رحمت قبا کی بستی میں آپہنچا جہاں ایک مسجد کی تعمیر ہوئی جس کی اساس تقویٰ پر اٹھائی جانے کی کلام رب نے شہادت دی۔ مسجد ایک پڑاؤ تھی مگر تاابد بلندی کردار کا حوالہ بن گئی یثرب جسے اب مدینۃ النبی ہونے کا شرف حاصل ہو گیا تھا سراپا انتظار تھا۔ مرد، عورت، بچے، بچیاں سب خیر مقدمی ترانوں سے اپنی خوش قسمتی کا اعلان کر رہے تھے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو شرفِ میزبانی ملا، دو یتیموں کی بے آباد زمین رحمت عالم ﷺ کی سجدہ گاہ بنی اور یہ جانثاروں کے لئے پناہ گاہ قرار پائی۔

مدینہ منورہ آمد کے ساتھ ہی ایک اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آئی جو تاقیامت ہر ریاست کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئی۔ مدینہ منورہ کی کل آبادی دو حصوں میں منقسم تھی۔ انصار اطاعت شعار اور سراپا نیاز مند تھے یہود کی بستیاں اپنی

برتری کا خمار لئے ہوئے تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ہر دو گروہوں کے ساتھ معاہدے کئے۔ اپنوں کے ساتھ مواخات طے پائی اور غیروں کے ساتھ میثاقِ مدینہ، مسلم امت کو حکمرانی کا اُسوۂ دے دیا گیا کہ جب بھی کوئی اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو یہی دو صورتیں سامنے آئیں گی۔ کچھ اپنے ہوں گے اور کچھ بیگانے، ایک مستحکم اسلامی ریاست کو دونوں گروپوں کے ساتھ رہنا ہے اور رہنے کا سلیقہ یہ ہے جو مدینہ منورہ میں ترتیب دے دیا گیا تھا۔

کفار مکہ کو چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی قوت تسلیم ہوگئی، اُن کے ناپسندیدہ افراد شہر چھوڑ گئے بس اس کامیابی پر اکتفا کریں اور اتنی دور جا بسنے والوں کا تعاقب نہ کریں مگر انانیت کی سرمستی اس عافیت کدے کو کب برداشت کرتی تھی اس لئے تصادم رونما ہوا اور مسلسل ہوتا رہا۔

غزوات و سرایا:

غزوات کی ابتداء اہل مکہ کے ساتھ تصادم سے ہوئی کہ وہی شجر اسلام کو بار آور نہیں دیکھنا چاہتے تھے پھر اُن کے بعض بہی خواہ بھی میدان میں کود پڑے اور اس طرح مدینہ منورہ کے قیام کے دس سال زیادہ تر انہیں معرکوں میں گزرے۔ غزوات کے لئے شرط ہے کہ ان میں خود نبی اکرم ﷺ شریک ہوئے ہوں خواہ جنگ کی نوبت نہ بھی آئی ہو۔ ایسے غزوات کی تعداد ابن سعد کے مطابق ستائیس ہے۔ اگرچہ کچھ اختلاف بھی ہے۔ اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ ایک لشکر جو کسی خاص ہدف کی طرف جا رہا تھا اُسے راستے میں بعض معاندین سے نبرد آزمائی کی مجبوری لاحق ہو جاتی

تھی بعض سیرت نگاروں نے اسے لشکر کشی کو ایک ہی غزوہ شمار کیا ہے مگر بعض نے ہر تصادم کو الگ شمار کرلیا ہے۔ سرایا کی تعداد زیادہ سے زیادہ بہتر کہی گئی ہے ان میں بھی غزوات کا سا معاملہ رہا ہے۔

بظاہر تو یہ مہمیں تھیں جو مختلف مقاصد کے تحت روانہ کی گئیں مگر اصل مقصد دفاع تھا کہ کفر یلغار کررہا تھا ایسے ماحول میں رد عمل نہ دینا تبلیغ اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہوتا اور دشمن دلیر ہو کر مرکز کو ہی برباد کرنے پر دلیر ہو جاتا، قوت کا استعمال اگر شر کو روکنے کے لئے ہو تو ضروری ہوتا ہے ورنہ کوئی مشن بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

بقول علامہ اقبال

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

سیرت رسول ﷺ غزوات و سرایا میں بھی راہنمائی کرتی ہے۔ ہر غزوہ اگرچہ برسرِ پیکار ہونے کا ذریعہ تھا مگر کہیں بھی اخلاقِ اسلامی کی عظمت پر داغ نہیں آیا کہ مقصود جنگ نہ تھی انسانیت کی فلاح تھی۔ اگرچہ مدنی زندگی ان معرکوں سے بھری پڑی ہے مگر ان کا مقصود تعلیماتِ اسلام کا فروغ تھا، آج تعلیمات کی وسعت دیکھئے کہ زندگی کے قدم قدم پر ان سے راہنمائی لی جاسکتی ہے تو سوچئے کہ تعلیمات کی ہمہ گیری کے لئے خالی لمحات کون سے تھے، حقیقت یہ ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران میں ہی اُسوۂ رسول ﷺ انسانیت کے لئے بھرپور کردار انجام دے رہا تھا۔ ہر غزوہ کی تفصیل پڑھ لیجئے یہ معرکہ نظر نہیں آئے گا مکتبِ ہدایت محسوس ہوگا، اسیرانِ جنگ سے جو سلوک رحمۃ للعالمین نے کیا وہ تاریخ عسکریت کا انوکھا باب ہے نہ انتقام کے جذبے جوان ہوئے نہ ہلاکت خیزیوں سے قتل گاہیں سجائی گئیں، رحم و کرم

کا رویہ جو پہلے تھا بعد میں وہی پیش نظر رہا اکثر مہمات صرف باطل قوت کو پسپا کرنے کے لئے تھیں، نو ایسے غزوات میں جن میں باقاعدہ جنگ ہوئی ان کے اسماء ہیں۔

غزوہ بدر، احد، خندق، قریظہ، مصطلق، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف، غزوہ بدر پہلا یا باقاعدہ تصادم تھا مگر اس میں بھی حسن سلوک کا وہ معیار قائم کیا کہ ہدایت کشید کرنے والوں کے لئے قیامت تک راہنما ہے کہ عین جنگ میں دشمن پر پانی بند نہ کیا، غزوہ احد میں اطاعت شعاری کی اہمیت واضح ہوگئی، خندق میں سربراہ لشکر کا عام لشکریوں کا سا رویہ فتح مندی کا حوالہ بنا، فتح مکہ میں ''لاتثریب علیکم الیوم'' کا عام عفو کا اعلان تاریخ عسکریت کا درخشاں مظہر ثابت ہوا۔ حنین میں خود میدان میں شمشیر بکف آجانا کس قدر ہمت افزا تھا۔ اسی طرح دیگر غزوات میں نصیحت افروزی کے متعدد واقعات صفحات تاریخ پر جگمگا رہے ہیں۔ کسی جنگ میں خواہ وہ کس قدر ہولناک ہو، منصب رسالت کی جلوہ گری ماند نہیں پڑی۔ حضور اکرم ﷺ ہر حال میں نبی تھے اور بہر صورت رحمۃ العالمین تھے اور آج بھی یہ رحمۃ للعالمینی انسانیت کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

حجۃ الوداع:

قائدانہ زندگی کا لمحہ لمحہ قوم کے لئے راہنمائی فراہم کرتا رہا۔ دین کی تعلیمات مکمل ہو رہی تھیں اور انسان کو وہ سب کچھ میسر آگیا تھا جو اُس کی ضرورت تھی، اس کی تصدیق صدیوں کا سفر کر رہا ہے کہ مسلمان امت کسی حال میں ہو، کہیں بھی ہو اور کسی دور میں ہو اُسوۂ رسول ﷺ راہنمائی کی کفالت کر رہا ہے۔ کبھی بھی

ناتمامی کا شکوہ نہیں ہوتا اور کہیں بھی محرومی کا احساس نہیں ابھرتا۔ مکہ مکرمہ آٹھ سال ہجرت کے بعد فتح ہو چکا تھا۔ نو ہجری کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امارت میں فریضہ حج ادا ہو چکا تھا کہ دس ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے لئے خود قصد فرمایا۔ اعلان عام ہوا کہ جو جانا چاہے سفر کے لئے تیار ہو جائے۔ ازواج مطہرات سب بھی شریک سفر تھیں۔ 26 ذوالعقدہ کو یہ قافلہ خیر روانہ ہوا۔ راستے میں لوگ شامل ہوتے گئے اور ایک جم غفیر امڈ آیا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ملت اسلامیہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں مکہ مکرمہ کی جانب روانہ تھی۔ ذوالحلیفہ میں احرام باندھا گیا، نو دن میں یہ سفر عبادت طے ہو۔ آٹھ ذوالحجہ کو منیٰ میں قیام رہا۔ اور اگلے روز جمعۃ المبارک کو عازم عرفات ہوئے اور حج کا رکن اعظم ادا فرمایا۔ بعد از نماز ظہر ایک آفاقی خطبہ ارشاد فرمایا۔ جو تاریخ انسانی کا ابدی منشور ہے منیٰ میں بھی خطبات ارشاد فرمائے، ان خطبات میں اسلامی تعلیمات کے تمام مرکزی احکام واضح کر دیئے گئے مثلاً ارشاد ہوا۔

"لوگو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک، تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے تھے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔

بے شک تمہارے خون اور مال دوسرے پر حرام ہیں ان کی حرمت ایسے ہے جیسے آج کا دن، یہ مہینہ، یہ شہر۔

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھنا جو خود کھاؤ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو ان کو پہناؤ۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، جس طرح عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اس طرح عورتوں کے تم پر حقوق ہیں۔

آج میں جاہلیت کے خون معاف کر رہا ہوں، سب سے پہلے اپنے خاندان کے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔

آج میں جاہلیت کے تمام سود معاف کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے اپنے خاندان یعنی عباس بن عبدالخطاب کا سود معاف کرتا ہوں۔

لوگو میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت۔

یہ ایک طویل خطبہ ہے جس میں تعلیمات کا نچوڑ آ گیا ہے اور یہ قیامت تک کے لئے انسانیت کے لئے راہنما ہے۔ اس پر تکمیل دین کی آیات نازل ہوئیں، واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے، دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ صفر کے مہینے میں طبیعت علیل رہنے لگی اور لگاتار نقاہت ہوتی گئی۔ جنت البقیع تشریف لے گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے دعا فرمائی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اُس کے پاس چلے جانے کا اختیار دیا ہے جو اُس بندے نے قبول کر لیا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آب دیدہ ہو گئے کہ وہ یہ اشارہ سمجھ گئے تھے، جب مسجد میں آنے میں نقاہت حائل ہو گئی تو حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جماعت کرائیں۔ اس پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد گرامی کی محبتوں کا ذکر کر کے کسی اور کو حکم دینے کا عرض کیا مگر حکم یہی رہا کہ امامت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کرائیں۔ روایت میں ہے کہ آپ نے سترہ نمازیں پڑھائیں ایک روز سہارے سے چلتے ہوئے مسجد

میں تشریف لے آئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جماعت کرا رہے تھے۔ پیچھے ہٹنے لگے تو روک دیا مگر وہ پابند آداب تھے۔ صف میں شامل ہوگئے اور نبی اکرم ﷺ نے آخری مرتبہ بیٹھ کر جماعت کرائی۔ آخر میں وہ لمحہ آگیا جو ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ ربیع الاول گیارہ ہجری کی بارہ تاریخ تھی ملت اسلامیہ کو ملت کے راہنما غمزدہ چھوڑ گئے اُسی حجرہ میں قبر مبارک بنی جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دوصاحبزادوں فضل اور قثم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر غسل دیا، حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت شقران رضی اللہ عنہ پانی ڈالتے تھے، حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے لحد والی قبر تیار کی حجرہ اقدس کے اندر آپ کو چارپائی پر لٹایا گیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرداً فرداً نماز پڑھی، نماز کیا تھی درود وسلام کے نذرانے تھے جو پیش کئے گئے اور اُسی حجرے میں ہمیشہ کے لئے آرام کرنے کے لئے قبر میں اتار دیا گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی کہ وہ اپنے محبوب کریم ﷺ کے ظاہری جمال سے محروم ہوگئے تھے۔ دردناک مرثیے کہے گئے اور جذبات کا اظہار کیا گیا مگر یہ یاد رہے کہ اُس لحاتی غم کے زیر اثر مراثی لکھے گئے۔ قوم جلد ہی اس غم سے رہائی پاگئی کہ اُسے قبر انور میں موجودگی کا شعور حاصل ہوگیا تھا اس لئے اُس محدود دور کے بعد آج تک رسول اللہ ﷺ کا مرثیہ نہیں لکھا گیا جس نے اظہارِ محبت کے لئے جذبات کو شعر یا نثر کے ادب میں ڈھالا، مدح اور نعت لکھی۔

رسول اکرم ﷺ کی تریسٹھ سالہ ظاہرہ زندگی کا لمحہ لمحہ ہدایت کا روشن باب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۔ (الاحزاب:21)

’’بے شک تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، یہ نمونہ اس کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہے اور یوم آخر کا طلب گار ہے اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا ہے‘‘۔

اُسوۂ تو آپ سب کے لئے ہیں جو بھی اسلام کے دامن میں آجاتا ہے خاص طور پر اُن کے لئے جو اپنے خالق کے متلاشی ہیں، عرفان حق کے طلب گار ہیں۔ یوم آخر ابرومندر رہنا چاہتے ہیں اور اُن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہمہ وقت سمائی رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی کو دعویٰ ہے کہ وہ خالق کا محب ہے تو اُسے عرفان کا وہی رستہ اختیار کرنا چاہیے جو رسول اکرم ﷺ نے تلقین فرمایا ہے۔ یوم حساب اگر کوئی کامیابی چاہتا ہے تو اُسے بھی اسی سنت پر عمل کرنا ہے حتّٰی کہ اپنے خالق ومالک کی یاد میں بھی اسی اسوہ کو راہنما بنانا ہے یہ آیت کریمہ ایک اطاعت شعار پر اسوہ حسنہ کی پیروی کو لازم قرار دیتی ہے کہ یہی ذریعہ نجات ہے بعثت نبوی کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے نبوت کے چہارگانہ مناصب کا حوالہ دیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے اہداف میں تلاوتِ آیات پہلی منزل ہے۔ تزکیہ نفوس دوسرا منصب ہے اور تعلیم کتاب تیسرا اور تعلیم حکمت چوتھا منصب ہے۔ نبوی تبلیغ انہیں چار مناصب کا احاطہ کرتی ہے اس لئے ہر قاری قرآن کو ہر تزکیہ نفوس کے دعویدار کو، ہر تعلیم کتاب کے ماہر کو اور ہر تعلیم حکمت کے داعی کو انہیں مناصب کی پیروی کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرأت کے ماہرین لہجہ رسالت کے متلاشی رہتے ہیں۔ تزکیہ نفوس کی ذمہ داری سنبھالنے والے ذات رسالت مآب ﷺ سے ہی کسبِ فیض کرتے ہیں اور

علم کتاب وحکمت میں انہماک رکھنے والے ہر ہدایت کا رشتہ بھی آپ کے اسوہ سے ہی قائم ہے۔

یہی تعلق مستحکم ہوتو کامیابی ونجات نصیب ہوتی ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر محدث روایت کا سلسلہ آپ کی ذات سے جوڑتا ہے جس سے متصل حدیث وجود میں آتی ہے۔ اُسی قراءت اور اُسی اعراب کو حتمی سمجھتا ہے۔ جو آپ سے منسوب ہے۔ اسی طرح تزکیہ نفوس کے ماہر صوفیاء کرام بھی اُسی طریقِ عبادت ، انداز مجاہدہ اور طریقِ تلقین کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں جو آپ سے روایت ہوا ہے۔ تصوف جو اصلاحِ باطن کو تحریک ہے کا حسن بھی اسی نسبت سے قائم ہے۔ صوفیاء ارشادات نبوی کی روح کے پاسدار ہیں اس لئے ہمہ تن اتباع شریعت کو مقصود بناتے ہیں سلسلہ نقشبندیہ کا یہ یقین ہے کہ نقشبندی صوفی ہرحال میں شریعت کا پیرو ہے۔ اُن کے ہاں فرائض وسنن میں ہی متابعت نہیں ، رویوں ، معاملوں اور دنیاوی بود وباش میں بھی اتباع رسالت کو ہی راہنما بنایا جاتا ہے۔ صوفیاء کے ہاں سیرت رسول اکرم ﷺ کے وہ پہلو خصوصی توجہ کے حامل ہوتے ہیں جو اخلاقِ رسول ﷺ سے عبارت ہوں اس لئے بعض صوفیاء کے نزدیک تصوف ہے ہی سراسر اخلاق۔ صوفیاء کے مراقبے غارِ حرا کی عبادت گزاری کا فیضان ہیں، صبر وتحمل کے تمام مراحل طائف کے واقعات سے مستعار ہیں اور دنیا سے قدرے بے رغبتی ”لِیْ مَعَ اللہ“ کے خصوص کے پرتو ہیں، صوفیاء نماز وروزہ کے فرائض سے غافل نہیں ہوتے بلکہ ان فرائض پر مداومت پر زور دیتے ہیں کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے عبادت گزاری کی کثرت سے پاؤں پر

پڑے ورم یاد رہتے ہیں۔ غرضیکہ صوفیاء کے ہاں شریعت کی ہمہ جہت پیروی ہی طریقت کا امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر سلسلہ تصوف اُس اصل ثابت سے متصل رہتا ہے اور اپنے آپ کو اسی شجر طیب کی پیوستہ شاخ شمار کرتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ بھی اسی اصل کی فرع ہے جس کی شاخیں فلک آشنا ہیں اور جس کا پھل ہر وقت بارآور ہے، آیئے مرکزِ نبوت سے توانائی پانے والی اس شاخ کا تذکرہ کریں جس کی ابتداء اُس وجود مسعود سے ہوئی جو سراپا تتمہ نبوت ہے جس وجود گرامی کی ہر ہر ادا سے بوئے رسول ﷺ آتی ہے اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی حق وصداقت کا کامیاب حوالہ ہے۔

حوالہ جات

1 صحیح مسلم جلد دوم کتاب الفضائل۔

2 صحیح البخاری، باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

3 الخصائص الکبریٰ، علامہ السیوطی جلد اول ص: 740

4 سیرت ابن هشام جلد اول ص: 209

5 سیرت النبی لابن هشام جلد اول ص: 214

6 صحیح البخاری باب کیف بدء الوحی۔

2۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُن خوش خصال اور بلند اقبال انسانوں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جن کی ذات طلوعِ اسلام کی اولین ساعتوں میں ہی توجہ کا مرکز بنی، تاریخ اسلام ہی نہیں تاریخ عالم کا کوئی قاری آپ کی سعادت مندی اور نبوی پیغام سے آپ کی گرویدگی کا انکار نہیں کرسکتا۔ عرب کے بدوی ماحول اور قبائل کی باہمی چپقلش کے ناآسودہ ماحول میں سیرت وکردار کا الہامی پیمانوں کے مطابق تشکیل دینا آسان کام نہ تھا، جاہلی غرور میں ڈوبا ہوا عرب معاشرہ تہذیب نفس کی کسی آواز پر لبیک کہنے کو تیار نہ تھا، ایسے تہہ درتہہ اندھیروں میں نورِ نبوت ہویدا ہوا تو اکثر آنکھیں چندھیا گئیں کہ نظری صلابت کا حوصلہ بایدوشاید تھا مگر جس وجود محترم نے اپنی فطری راہ یابی کی توفیق پا کر درِ صداقت پر سب سے پہلے سر جھکایا اور تصدیق صدق کی رفعت پائی وہ رفیقِ نبوت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ نہ دلیل طلب کی اور نہ معجزہ چاہا بلکہ کلمۂ حق کو حق شناس وجود نے ادا ہوتے ہی پہچان لیا، اس طرح قافلۂ ملت اسلامیہ کے اولین سالار کہلائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ، کنیت ابوبکر اور لقب صدیق ہے، کنیت ابوبکر کے حوالے سے متعدد توجیہات کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اونٹوں کے علاج میں ماہر تھے اور اہل عرب کا سرمایہ اور زرمبادلہ ہی اونٹ تھا اس لئے ابوبکر کہلائے کہ بکر جوان اونٹ کو کہتے تھے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ کی صاحبزادی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کنواری تھیں جب ازواج میں شامل ہوئیں اور یہ شرف صرف آپ کو حاصل ہوا اور بکر کا ایک مفہوم کنوارا ہونا بھی ہے اس لئے ابوبکر کہلائے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے اس لئے ابوبکر کہے گئے کہ بکر کے مفہوم میں ابتداء کا تصور بھی موجود ہے۔ بکرۃ طلوعِ صبح کو کہتے ہیں اور باکرہ اُس پھل کو جو سب سے پہلے درخت سے اُترے۔ صدیق کا لقب اس لئے ملا کہ پہلے تصدیق کرنے والے تھے۔ معراج کی بھی پہلی تصدیق آپ ہی نے فرمائی تھی اس لئے اس لقب سے سرفراز ہوئے۔ صدیق صرف سچے کو ہی نہیں کہتے کہ اُس کے لئے صادق ہے۔ صدیق وہ ہے جو اپنے قول کی تصدیق اپنے عمل سے کرے۔ غرضیکہ ان اسماء والقاب میں بھی آپ کے اولین تصدیق کرنے والے ہونے کا اعلان موجود ہے۔

آپ قبیلہ قریش کی شاخ بنوتیم سے تعلق رکھتے تھے۔ چھ واسطوں سے مرہ بن کعب پر آپ کا نسب، نسب رسالت سے مل جاتا ہے، بنوتیم جاہلی دور میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اہم فیصلوں میں شریک تھے۔ آپ نبی اکرم ﷺ سے دو سال اور کچھ ماہ چھوٹے تھے اس لئے تقریباً ہم عمر تھے یہی وجہ ہے کہ باہم اخوت کے مراسم رکھتے تھے جس کی وجہ سے مزاج آشنائی کا شرف بھی حاصل تھا، معمولاتِ زندگی میں بھی قرب تھا کہ عرب معاشرے میں رہتے ہوئے بھی شراب نوشی سے مکمل اجتناب اختیار کئے رکھا، معاشرتی تعلقات میں صداقت شعاری قبل از اسلام زندگی میں بھی موجود تھی اسی لئے جب نبی اکرم ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو سب سے پہلے حاضر ہو گئے۔ نہ کوئی دلیل طلب کی کہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی، نہ کوئی معجزہ مانگا کہ ذاتِ رسالت سے گرویدگی پہلے سے موجود تھی، اسلام قبول

کرنا اُس وقت کے معاشرے کو رد کرنا تھا اس پر ردعمل بھی شدید ہوا، محترم وجود تھے مگر قبولیتِ اسلام سے مخالفت کا وہ طوفان دیکھا کہ ظلم وجبر کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن آپ اپنی ذات کے دفاع اور حفاظت سے بے نیاز تھے خیال تھا تو یہی کہ حبیب کریم ﷺ کی ذات ان معاندین کے حملوں سے محفوظ رہے۔

دفاع ذات رسالت کی جو دلیرانہ جنگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لڑی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر موقعہ پر حصار بنے رہے اور جب بھی مکہ مکرمہ کا بگڑا ہوا ماحول ذاتِ رسالت پر اُمڈ آتا تو آپ ہی آگے بڑھتے اور کفر کا ہر حملہ پسپا کرتے، بڑی جرأت وحوصلہ مندی سے للکارتے۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ 1

"کیا تم ایسے وجود کو مارنے کے درپے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ اور وہ تمہارے پاس رب کی نشانیاں لایا ہے"۔

یہی جانثاری تھی جس پر دربارِ رسالت کی طرف سے متعدد اعزازات عطا ہوئے۔ کبھی فرمایا۔

يَا اَبَا بَكْرٍ اَنْتَ عَتِيْقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ. 2

"اے ابوبکر رضی اللہ عنہ تو اللہ تعالیٰ کی نوازش سے دوزخ سے رہائی پا چکا ہے"۔ تو کبھی ارشاد ہوا۔

وَاللّٰهِ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰى اَحَدٍ بَعْدَ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى اَفْضَلَ مِنْ اَبِيْ بَكْرٍ۔ 3

"اللہ تعالیٰ کی قسم، نہ کبھی سورج طلوع ہوا اور نہ کسی پر غروب ہوا۔ انبیاء ومرسلین کے بعد جو ابوبکر ؓ سے افضل ہو"۔

اسی کا اعلان حضرت حسان بن ثابت ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یوں فرمایا۔

وَكَانَ حِبَّ رَسُوْلِ اللهِ قَدْ عَلِمُوْا - مِنَ الْبَرِيَّةِ لَمْ يَعْدِلْ بِهٖ رَجُلًا ۔4

"آپ رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے وہ سب جان چکے تھے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے برابر نہیں ہے"۔

نبی اکرم ﷺ نے آپ کو عتیق اللہ من النار بھی فرمایا تو "سیدا کھول اھل الجنۃ" کی عظمت سے بھی نوازا۔ کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ فرما کر رفعتِ شان کا اظہار فرمایا کہ ابوبکر (ؓ) میرے رفیق غار بھی ہیں اور رفیق حوض بھی۔5

صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن العاص ؓ کا یہ استفسار بھی درج ہے کہ اے اللہ تعالیٰ کے رسول لوگوں میں سے آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے تو فرمایا عائشہ (رضی اللہ عنہا) سوال کیا گیا کہ مردوں میں سے تو فرمایا اُس کا باپ۔6

اور وہ ارشادِ گرامی تو حضرت صدیق اکبر ؓ کی شناخت قرار پایا کہ

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُهٗ خَلِيْلًا وَلٰكِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ۔7

"اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ان کو یعنی ابوبکر ؓ کو دوست بناتا لیکن اخوتِ اسلامی ہی افضل ہے"۔

اعمالِ صالحہ کی جزا جنت ہے اور ہر صاحب ایمان جنت کا طلب گار ہے مگر عنایات کریمانہ دیکھئے کہ دس اصحاب باصفا کو دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی گئی ان اصحاب جنت میں سرفہرست حضرت ابوبکر ؓ ہیں پھر یہ بھی واضح فرما دیا گیا۔

اَمَا اِنَّكَ يَا اَبَابَكْرٍ اَوَّلُ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِيْ ۔8

"جہاں تک تیرا معاملہ ہے تو اے ابوبکر تو میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا"۔

جامع الترمذی کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے اپنے وزراء کا ذکر فرمایا تو واضح کر دیا کہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام آسمانوں میں میرے وزیر ہیں اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دنیا میں میرے وزیر ہیں۔9

معاونت جانی و مالی حضرت صدیق اکبر ؓ کا وہ امتیاز ہے جس میں کوئی آپ کا سہیم وشریک نہیں ہے۔ اس کا واضح اعلان متعدد بار زبان رسالت سے ہوا مثلاً فرمایا۔

مَا نَفَعَنِيْ مَالٌ قَطُّ اِلَّا مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ ۔10

"مجھے سوائے ابوبکر ؓ کے مال نے کبھی کسی مال نے نفع نہیں دیا"۔

یہ قربانی اور نفع دہندگی کس قدر تھی اس کا اندازہ اس ارشاد نبوت سے ہوسکتا ہے۔

مَا لِاَحَدٍ عِنْدَنَا يَدٌ اِلَّا وَقَدْ كَافَيْنَاهُ مَا خَلَا اَبُوْ بَكْرٍ فَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا يَدًا يُكَافِئُهُ اللهُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔11

"جس کسی کا بھی ہم پر احسان تھا ہم نے اس کا بدلہ ادا کر دیا سوائے

ابوبکر کے کہ ان کا ہم پر احسان ہے جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے روز دے گا۔

یوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محسن ملت شمار ہوئے کہ ان کے خاندان کے ہر ہر فرد نے حمایتِ اسلام کے مشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چالیس ہزار درہم جو اسلام میں داخل ہوتے وقت آپ کے پاس تھے۔ سب کے سب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کے لئے قربان کر دیئے، نہ بوڑھے والدین کی فکر نے ستایا اور نہ اولاد کی ضرورتوں نے کسی طرح کی جزءرسی کی تحریک دی حتّٰی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قربانیوں کا ذکر فرمایا تو پکار اٹھے۔

یارسول اللہ ھَلْ اَنَا وَمَالِیْ اِلَّا لَکَ۔ 12

"اے اللہ کے رسول کیا میں اور میرا آپ کی وجہ سے نہیں"

مکی دور مصائب وآلام کا دور تھا جس میں تبلیغ دین کا مرحلہ بہت دشوار تھا مگر اس قدر کٹھن حالات میں بھی آپ کی مسلسل محنت پھل لائی کہ مکہ مکرمہ کے نمایاں افراد حظیرۂ اسلام میں داخل ہوئے مثلاً

حضرت عثمان بن عفّان، حضرت زبیر بن العوام، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جو عشرہ مبشرہ میں ہیں ان کے علاوہ۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہم بھی آپ کی شب وروز محنت سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے یہ تو وہ افراد تھے جو معاشرے میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور اپنے فیصلے پر قدرت رکھتے تھے مگر وہ افراد بھی دربار رسالت میں حاضر ہو گئے جن کو کسی معاشرتی فیصلے کا استحقاق حاصل نہ تھا، ان میں معاشرے کے پست افراد بھی تھے اور غلام اور کنیزیں بھی تھیں مثلاً

حضرت بلال حبشی، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت ابوفکیہۃ رضی اللہ عنہم خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور تبلیغی مساعی کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے جب حضرت لبینہ، حضرت ام عبیس، حضرت حمامیہ، حضرت زنیرہ، حضرت نہدیہ رضی اللہ عنہن بھی ہزار مشکلات کے باوجود درِ رسالت پر سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایسے متعدد افراد کے دلوں میں شجر اسلام کی آبیاری کا شرف حاصل ہوا جو آپ کا منفرد اعزاز ہے۔

ہجرت مدینہ منورہ:

کاتبِ تقدیر نے ان عظمتوں کے علاوہ وہ عظمت بھی آپ کے نامہ اعمال میں درج کر دی تھی جو آپ کا وہ امتیاز بنی کہ ہر زبان یار غار کے حوالے سے اس کا تذکرہ کرتی رہتی ہے۔ مکہ مکرمہ کی سرزمین نے تیرہ سال ایسے دیکھے تھے جو بظاہر حوصلہ شکن تھے مگر اسلام لانے والوں کی استقامت کی حد یہ تھی کہ ایک بھی حاضرِ دربار ہونے والا واپس نہیں لوٹا، ظلم ہوئے، جبر کے پہاڑ توڑے گئے، قتل گاہیں سجیں مگر استقامت میں لرزش نہ آئی۔ یہ تیرہ سال کڑے امتحان کا دورانیہ تھے مگر کامرانی نے کیسے قدم چومے اس کی گواہی مکہ مکرمہ کے تیرہ سال کا ہر لمحہ دے رہا ہے۔ غرور وتکبر کا مقابلہ عجز وانکساری سے، قبائلی تعصب کا رد انسانی رویوں سے، تندوتیز معاندت کا جواب پروقار متانت سے دیا گیا۔ ظلم جتنا بڑھا حلم اُسی قدر پروان چڑھا، ایذاءرسانی کی جتنی شدت ہوئی قوت برداشت اُسی قدر حوصلہ مند ہوئی، آخر وہ لمحہ آ گیا جب سفر ہجرت کی منزل آ گئی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ہجرت حبشہ کی اجازت بھی مل گئی تھی، تقاضائے وقت

کے تحت روانہ بھی ہوئے مگر ستم رانیوں کے موجود مرحلوں کے باوجود واپس آ گئے کہ حفاظتِ رسول ﷺ کا منصب انہیں ہی سنبھالنا تھا، ہجرتِ مدینہ کا اذنِ عام ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد سفرِ ہجرت پر روانہ ہوگئی مگر آپ اُس لمحہ مسعود کے منتظر رہے جو رفاقتِ رسالت کی برکات سے لبریز ہوتا تھا۔ آخر وہ وقت موعود آ ہی گیا۔ ایک اور اعزاز، برتر اعزاز استقبال کرنے والا تھا، رسول اللہ ﷺ جفا پیشہ مخالفوں کا گھیرا توڑ کر نکلے تھے، گھیرا ڈالنے والے منتظر ہی رہے مگر اُنہیں نورِ مجسم ﷺ کہیں دکھائی نہ دیا۔ سچ ہے اندھیروں کے پاسبانوں کو حق کا نور کب نظر آتا ہے یہ خوشی تو چمکتے ہوئے ذہنوں کا مقدر ہے، رسول اللہ ﷺ بڑی تمکنت سے نکلے، یہ سفر کاشانہ نبوت سے کاشانہ صدیق تک کا تھا۔ یارِ غار کی منزلت پانے والا وجود سراپا انتظار تھا، آج وہ منظر چشمِ فلک نے دیکھنا تھا کہ سراپا صدق کا سفر ہمہ تن مصدّق کی منزل تک تھا۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ (الزمر:33)

کا خوش کن لمحہ سامنے تھا جس کے بیان سے زبانیں عاجز ہیں، رفاقت کا مژدہ ملا تو وجدان کے چراغ روشن ہو گئے رختِ سفر باندھا، صاحبزادی نے اوڑھنی پھاڑ ڈالی کہ پیکرِ حیا کے لئے سامانِ سفر باندھنا تھا۔ مکہ مکرمہ کی فضاؤں کو الوداع کہا مگر دکھی دل کے ساتھ اور واپسی کی امید کے ساتھ۔

غارِ ثور پہلی منزل تھی، تاریک غار جہاں حشرات کا بسیرا تھا نور آشنا ہونے والی تھی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے غار میں گئے، حفاظت کا اطمینان کرنا بھی تو رفاقت کا ایک پہلو تھا، بہت سے سوراخ نظر آئے یقیناً موذی حشرات کا مسکن ہوگا اپنی چادر پھاڑ ڈالی کہ سوراخ بند کرنا تھے۔ حیرت ہے بیٹی اوڑھنی پھاڑ رہی ہے تو باپ

چادر، مطلوب ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کا سفر عافیت سے گزر جائے، ایک دو سوراخ بند نہ ہوئے کہ چادر نا کافی تھی۔ وہاں پاؤں رکھ دیا کہ خطرے کا منہ بند ہو جائے، آنے والی نسلوں کو راہنمائی مہیا کر دی کہ قدم صدیق رضی اللہ عنہ کو ہر مصیبت میں سامنے رکھے یہ تمہید تھی کہ دیکھنا استقامت صدیق رضی اللہ عنہ کس طرح ہر خطرے کا در بند کر دیتی ہے۔ وہ حشرات کا خطرہ ہو یا نبوت کی صیانت پر حملہ آور ہونے کا خطرہ یا احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں دشواریوں کا خطرہ، اندر داخل ہوئے تو اپنی گود کو بستر بنا دیا، خلوت گزینی کا یہ اہتمام کہ احکام الٰہی نے بھی تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا تا کہ کسی اور کا تصور ہی جنم نہ لے سکے سوراخ سے سانپ نے نکلنا چاہا مگر فصیلِ قدم کو توڑ نہ سکا، ڈسنے لگا کہ یہ دشمن کی عادت ہوتی ہے ٹیس اٹھی مگر قدم نہ ہل سکا، ہاں ضبط کا بندھن ضرور ٹوٹا، آنسو چھلکے اور وہاں جا گرے جس کی ایک جھلک صحابیت کا اعزاز عطا کرتی ہے۔ آنسو نثار ہوئے، سبب دریافت فرمایا تو جواب تھا کہ

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں سانپ نے ڈس لیا ہے،

رحمۃ للعالمین ﷺ نے لعاب دہن لگایا تو سب درد دور ہو گیا۔[13]

آرام نصیب کیوں نہ ہوتا یہ لعاب تو کھارے کنوؤں کو میٹھا بنا دیتا ہے، رخسار پر لٹکتے ہوئے ڈھیلے کو یوں جوڑ دیتا ہے کہ بینائی پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ جانثاروں کے ہر دکھ کا علاج اسی رحمت میں ہے۔

ثانی اثنین:

غار میں تھے کہ مشرکینِ مکہ سامنے چوٹی پر آ گئے، اُنہیں تلاش تھی

عقابی نظروں سے ہر موڑ اور ہر چوٹی پر ان مسافران یثرب کو تلاش کر رہے تھے۔
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس تشویش ناک منظر کو دیکھا تو عرض کرنے لگے کہ اگر یہ لوگ قدموں کی طرف دیکھ لیں تو ہمیں پالیں گے یعنی تلاش حصولِ مدعا کے قریب تر تھی مگر وقار وطمانیت کا پیکرِ عظیم مطمئن تھا کہ گھر سے نکلے تھے جب گھیرا ڈالے کھڑے دشمن تب نہ دیکھ سکے تو اب کیسے دیکھ پائیں گے اب صرف خود نہ تھے یارِ غار بھی حصارِ نور میں تھا، قرآن مجید اس منزل کا یوں پتہ دیتا ہے۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا
(التوبۃ: 40)

وہ دو میں سے دوسرے تھے جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی کو کہہ رہے تھے، غم نہ کر بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

ایک ہی فرمان میں کئی حقائق آشکار ہو گئے۔ دو تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دو میں دوسرے تھے اور یہ کہ غار میں بھی دو ہی تھے، صرف گفتگو دو کے درمیان نہ تھی، تھے ہی دو، اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے، صحابی ہونے کی نص قطعی حاصل ہوئی اور پھر یہ کہ پروردگار کی معیت میں دونوں ہی تھے، اتنا اتصال اس قدر قرب کہ وقت اجل بھی جدائی نہ ڈال سکا، غار ثور ایک غار تھی جس کو آج سے مرکز محبت بننا تھا، دشمن مرکز محبت کی طرف پیش قدمی کرتے رہیں گے، ایک نظر جھکانے کی دیر تھی کہ ہدف سامنے تھا، یہ منظر اس جانثار کو کس درجہ مضطرب کر رہا ہوگا، اسی رازداری کے لئے تو یہ سب اہتمام کیا تھا، کندھوں پر اٹھایا تھا کہ قدم بھی پتھروں پر نہ لگیں مگر اب ساری محنت کا ثمر کیا ہوگا، تھرا اٹھے ہوں گے، محبت کرنے والا دل دھڑکنے لگا ہوگا، سوچتے ہوں گے کہ

جس کی خاطر زہریلے سانپوں کے سوراخوں کو بند کیا کہ کوئی زہر بھرا جانور بھی آگے نہ بڑھ سکے یہ انسانی روپ میں زہر آلود ہیولے دسترس پالیں تو کیا ہوگا؟ ایک بے کلی تھی ایک نادیدہ خوف تھا۔ مسلسل رفاقت، مسلسل جانثاری اس خوف کے محرّک ہیں یہ واضح رہے کہ خوف اپنا نہ تھا کہ وہ تو حصار نبوت کے ذوق میں اپنا آپ بھول چکے تھے ورنہ ساتھ ہی کیوں دیتے۔ چٹانوں سے کیوں ٹکراتے۔ کندھوں پر کیوں اٹھاتے اور یہ کہ لباس کو کیوں تار تار کرتے؟ صرف اس لئے سب اہتمام ہوا کہ خطرہ پوشیدہ ہو یا ظاہر اُس وجود محترم ﷺ تک نہ پہنچ پائے جو اُن کے نزدیک سارے جہان سے عزیز تھا۔ جانثاری کا یہ جذبہ، گرویدگی کی اُس منزل تک آ گیا تھا جہاں غیریت کے تمام حوالے معدوم ہو جاتے ہیں، یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے کرم بالائے کرم ہے کہ ثانی اثنین کا رتبہ پایا اور صحبت رسالت سے وہاں فیض یاب ہوئے جہاں کوئی تیسرا نہ تھا، ایک جھلک اگرچہ اجتماع میں ہو صحابی بنا دیتی ہے تو صدیقین کے امام کا کیا مقام ہوگا جس نے تین دن چہرہ رسالت گود میں لے کر بلا شرکتِ غیر دیکھا ہے۔

سفر ہجرت کی ہر منزل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور آپ کے خاندان کے اختصاص کی منزل ہے، کہاں سے یہ قافلہ خیر گزرا۔ کہاں ٹھہرا، کون اُن تک رسائی پا سکا، یہ سب خاندان صدیقی پر عیاں تھا۔ واضح ہو گیا کہ یہ وہ گھرانہ ہے جس پر رحمت عالمین ﷺ نے بھرپور اعتماد کیا ہے، بچوں پر بھی بچیوں پر بھی حتّٰی کہ غلاموں پر بھی، سراقہ بن مالک کا تعاقب ہو یا قبیلہ اسلم کا، ام معبد کی جھونپڑی یا قبا کا مسکن، ہر موقعہ پر اور ہر جگہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رفاقت و مصاحبت کا حق ادا کر رہے ہیں یہاں تک کہ مدینہ منورہ کا مامن حاصل ہو گیا۔

مدینہ منورہ آمد کے بعد مسجد نبوی کی تعمیر کا مرحلہ درپیش ہوا۔ دو یتیموں کی زمین انتخاب کرلی گئی مگر ان سے تحفتاً لینا گوارا نہ کیا۔ قیمت ادا کی گئی اور یہ قیمت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ادا کی، اس طرح آپ تاسیس مسجد نبوی کا پہلا حوالہ بنے مدینہ منورہ کے دس سال مہمات کے سال تھے۔ ہر معرکے میں مشیران کی فہرست میں آپ کا نام سرفہرست رہا حتّٰی کہ غزوہ بدر کے اسیران کے فیصلے میں آپ کی رائے، نبوی رائے کے موافق قرار پائی۔ ان دس سالوں میں جو بھی پیش قدمی ہوئی جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شراکت لازم رہی۔ 8 ہجری کو مکہ مکرمہ فتح ہوا تو اذن حج کی نوید ملی، نو ہجری کو فرضیت کے بعد پہلا حج ہوا۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ نیابت رحمت عالمین ﷺ کے لئے آپ کا ہی انتخاب ہوا۔ امیر حج بن کر مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ دس ہجری کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ کی معیت لائق فخر رہی، تکمیل دین کی آیت نازل ہوئی تو یہی راز دار نبوت تھے جو اس کے نتائج سے سب سے پہلے باخبر ہوئے، علالت کے ایام میں نیابت امامت کا شرف بھی آپ کو حاصل ہوا۔ دو ارکان ہی ایسے ہیں جن میں امامت ہوتی ہے۔ نماز اور حج دونوں میں امامت کا شرف عطا ہوا جس سے حقیقت شناس نظروں نے خلافت کے اشارے پا لئے۔

رسول اکرم ﷺ کے سانحہ ارتحال پر کس کو دُکھ نہ ہوا تھا مگر یہ دُکھ ملت کی استواری سے اغماض کا ذریعہ نہ بننا چاہیے تھا چنانچہ وہی وجود گرامی صبر و استقلال کی چٹان ثابت ہوا جسے بظاہر سب سے زیادہ اس مفارقت پر غم ہونا چاہیے تھا مگر اآپ کا استقلال ثابت کر رہا تھا کہ قوم کی امارت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ تصوف

صفائے باطن ہے اور صفائے باطن کے کچھ اصول اور فروع ہیں، فرماتے ہیں۔

"ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کرے اور فرع یہ ہے کہ مکر و فریب سے بھرپور دنیا سے دل کو خالی کردے، یہ دونوں صفتیں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہیں۔ اسی لئے آپ طریقت کے راہنماؤں کے امام ہیں۔"14

پھر اس پر دلیل کے طور پر رسول اکرم ﷺ کی وفات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذباتی ردعمل اور خصوصاً حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیا اور استقامت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے شرف کا خصوصی تذکرہ کیا، پھر اُس واقعہ کا ذکر کیا کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سب مال و منال لے کر حاضر دربار ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے صدیق گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے تو عرض کیا اللہ اور اس کا رسول، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ صفائے قلب کی انتہا ہے، یہ تمام صفتیں صوفی صادق کی ہیں۔

خلافت و نیامت:

نبی آخر الزماں ﷺ کے وصال کے بعد امت مسلمہ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ نبوی پیغام پر قائم رہنا تھا، یہ تاریخ کا نازک ترین موڑ تھا کہ وہ وجود پردہ فرما گیا تھا جس کی ہر ادا متبعین کے لئے حجت تھی۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ کا وجود مرکزیت کی جان تھا۔ یہ صرف حکمرانی کا دور نہ تھا، رسالت کی پناہ کا بھی دور تھا۔ دورِ مسعود کی برکات کا جاری رہنا بقائے امت کے لئے لازم تھا۔ یہ فریضہ وہی وجود ادا کرسکتا تھا جس کے ہر عمل سے عہد نبوی کا سا استحکام ظاہر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ریاست کے تسلسل کا مرحلہ نہ تھا، دین کے استقلال کا بھی دورانیہ تھا، خلافت

راشدہ جس کی خشت اول حضرت صدیق اکبر ؓ کے ہاتھوں نصب ہوئی مسلمان امت کے لئے ایک عملی نمونہ تھا کہ دین کو حصار رسالت میں کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ سلطنتیں مٹتی بھی رہیں ریاستیں اجڑتی بھی رہیں، دین قائم رہا بلکہ توسیع دین کا سلسلہ چلتا ہی رہا، معاند سے معاند فضا میں بھی دین کی حفاظت ہوتی رہی بلکہ دشمنوں کی صفوں سے بھی بہی خواہ جنم لیتے رہے۔ بقول علامہ اقبال ؒ۔

ہے عیاں شورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

حضرت صدیق اکبر ؓ کی خلافت کا دورانیہ اگرچہ مختصر ہے مگر جب اُن کے کارہائے نمایاں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہر مورخ ششدر رہ جاتا ہے کہ کون سی روحانی قوت کارفرما تھی جو ہر منزل کو آسان کرتی گئی۔ رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد پوری اسلامی ریاست میں ارتعاش تھا، کچھ معاند قوتیں سر اٹھانے پر دلیر ہو رہی تھیں، کچھ غلطِ فہمیوں کا شکار ہو رہے تھے، کہیں کہیں خواہشات کا گرداب تھا تو کہیں قبائلی عصبیت سر اٹھا رہی تھی، ان تمام حالات میں حضرت صدیق اکبر ؓ کی قوت فیصلہ اور ایمانی استقامت یوں ظاہر ہوئی کہ ہر منزل آسان ہوگئی۔

رسول اکرم ﷺ نے جنگ موتہ کے اثرات کی وجہ سے شہید سپہ سالار حضرت زین بن حارثہ ؓ کے صاحبزادے حضرت اُسامہ بن زید ؓ کو ایک لشکر کے ساتھ روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لشکر تیار ہوگیا اور روانہ ہوا چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوگیا۔ جس سے حالات کا رُخ بدل گیا۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے خلافت پر متمکن ہوتے ہی لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ حالات کا جائزہ لینے

والے اصحاب پریشان تھے کہ ابھی اس اقدام کا موقعہ نہیں ہے کچھ تاخیر لازم ہے مگر خلیفہ اعظم ؓ رسول ﷺ کے فیصلے میں تاخیر برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ جب یہ فیصلہ حتمی قرار پایا تو جہاں دیدہ اصحاب نے سپہ سالار کی نوعمری کی بنیاد پر تبدیلی کا تقاضا کیا مگر حضرت ابوبکر ؓ نے یہ بھی تسلیم نہ کیا فرمایا اُن کے بس میں نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو بدل دیں، یہ قوت ارادی کا وہ مومنانہ اظہار تھا جو استحکام ریاست کی خشت اول قرار پایا۔ لشکر اپنے اہداف کی تکمیل کے لئے روانہ ہوگیا اور نہائت مختصر عرصے میں کامرانیوں کے پھریرے اڑاتا ہوا واپس آیا۔

ریاست اسلامی کی ہر جانب سے بعض فتنوں کی خبریں آ رہی تھیں آپ نے چھوٹے بڑے گیارہ لشکر ترتیب دیئے اور چہار جانب روانہ کردیئے۔ ہر طرف اسلامی لشکر اس قوت سے آگے بڑھا کہ ہر اٹھنے والا فتنہ دم توڑ گیا اور اسلامی ریاست ایک مضبوط اور پرسکون ریاست کے طور پر قائم ہوگئی۔ فلپ کے ہٹی انگریز مورخ اس مختصر مدت پر متردد ہے کہ یہ کارنامے تو مضبوط حکومت سے چالیس سال میں بھی انجام نہیں پا سکتے، یہ کیسے اتنے مختصر سے عرصے میں ممکن ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ سوا دو سالوں میں ہوا جو مورخین کو حیرت زدہ کر گیا۔

مدعیانِ نبوت:

نبوت ایک عطاء ربانی ہے۔ یہ نہ کس کی ریاضت کا انعام ہے اور نہ کسی کی معاشرتی برتری کا نتیجہ ہے۔ خالقِ کائنات جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں کی اصلاح کا وسیلہ بنا دیتا ہے رسول اکرم ﷺ کے اعلانِ نبوت پر بعض سرداران قریش وطائف کو

یہی اعتراض تھا کہ یہ انتخاب کس بنیاد پر ہوا ہے۔ وہ تو خود کو اس اعزاز کا مستحق گردانتے تھے مگر جب آفتاب نبوت کی ضیاپاشیاں اطراف واکناف کو محیط ہوئیں تو حسرتیں جوان ہونے لگیں۔ اسود عنسی وہ پہلا فریب خوردہ وجود تھا جو سب سے پہلے نبوت کا دعویدار بنا کچھ اثر رسوخ بھی حاصل کر گیا مگر مقامی ردعمل کا ہدف بن گیا اور عہد رسالت ہی میں مارا گیا، بدقسمتی سے وہ ایک ایسا راستہ کھول گیا جس پر چلنا ہر جاہ پسند کے لئے مرغوب ہوگیا، مسیلمہ کذّاب یمامہ سے نمودار ہوا اور اپنے ایک خط کے ذریعے ریاست میں حصہ داری کا مطالبہ کرنے لگا مگر نبی اکرم ﷺ نے اس کے خط کا مسکت جواب دیا اور اُس کے تمام دعوؤں کو رد کر دیا وہ اپنے اندر یہ خواہش پالتا رہا کہ شہرت وعظمت کا یہی راستہ اُسے سجھائی دیتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے وصالِ کے بعد تو وہ دبی ہوئی خواہش جوان ہوگئی اور اُس نے باقاعدہ اپنی جھوٹی نبوت کا پرچار شروع کر دیا، اس فتنہ کا سدباب کرنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اولین ہدف تھا، طلحہ بن خویلد اسدی بھی ایسے ہی لالچ کے اسیر سرداروں میں سے تھا کہ نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور تو اور بنو تمیم کی ایک عورت سجاح بھی نبوت کے دعویٰ کے ساتھ سامنے آگئی اور جب اُس نے مسیلمہ کذاب سے شادی کر لی تو فتنہ دو آتشہ ہوگیا۔

یہ تھا ماحول کہ نبوت کے دعویداروں کی سرگرمیاں ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہی تھیں مرکز گریز قوتوں کے ساتھ مدعیانِ نبوت کی طاقت بھی شامل ہوگئی یہی وقت مومنانہ فراست کی آزمائش کا تھا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیدار مغز قیادت اس چوطرفہ ہنگامہ آرائی کے سامنے مضبوط دیوار بن گئی۔ ایک ایک پر حملہ ہوا اور کامیابی خلافتِ صدیقی کا بہر طور مقدر بنی۔ طلحہ شکست کھا کر تائب ہوا۔

اسود عنسی تو عہدِ رسالت ہی میں مارا گیا تھا۔ مسیلمہ کذاب کی قوت سخت مزاحم ہوئی۔ ابتداء میں کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا مگر آخر کار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مہارت اور نوجوانوں کی استقامت نے یہ معرکہ بھی سر کرلیا، یہ ضرور ہوا کہ بہت سے حفاظ کرام شہید ہوگئے جس سے جمع وتدوینِ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان معرکوں میں امت کے لئے راہنمائی کے کئی سامان مہیا کر دیئے ایک یہ کہ محبت شراکت برداشت نہیں کرتی، ملت اسلامیہ کو محبت رسول ﷺ میں یک گیر و محکم گیر کے اصول پر کاربند رہنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کا عقیدہ کسی بحث کا متحمل نہیں کہ دعویداراں نبوت سے دلائل طلب کئے جائیں۔ مناظرے کئے جائیں کہ یہ عقیدہ اس قدر حتمی ہے کہ اس میں کسی بحث ودلیل کی گنجائش ہی نہیں ہے، یارِ غار رضی اللہ عنہ کے ایمان کا یہ مظاہرہ ہر آنے والی نسل کے لئے راہنما قرار پایا کہ حقائق پر استدلال کی ضرورت نہیں اور ختم نبوت کا عقیدہ کسی طور بھی معرض بحث میں نہیں ہے۔ یہ خلافت صدیقی کا وہ احسان ہے جس کا اعتراف ہر دور میں ہونا چاہیے اور اسی سے استحکام ملت کے لئے راہنمائی لینی چاہیے۔

منکرین زکوٰۃ:

زکوٰۃ رکنِ اسلام ہے کہ یہ صاحبِ نصاب افراد سے لی جاتی ہے اور مستحقین کو پہنچائی جاتی ہے یہ اسلامی معاشرت کا وہ اصول ہے جس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی جسدِ اسلام کو مضمحل کردے گی۔ عرب معاشرت میں اس زکوٰۃ کو حق نبوت خیال کرتے تھے اور جب نبی اکرم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو دین کے

تقاضوں کی کماحقہ فہم نہ رکھنے والوں کے ہاں اس بارے میں اضطراب پیدا ہوا، اس سے دوطرفہ نقصان کا خطرہ تھا ایک یہ کہ مرکزیت سے انحراف تھا اور جسد ملت پارہ پارہ ہونے کا خطرہ تھا دوسرے یہ کہ یہ نظامِ عبادات میں رخنہ اندازی تھی کہ ارکان خمسہ کی وحدت ٹوٹ رہی تھی اس لئے اس فتنے کا در بند کرنا رفیق نبوت کی ذمہ داری تھی۔ یہی ہوا کہ عام لشکر کشی ہوئی اور زکوٰۃ کی فرضیت کو یوں منوایا گیا کہ ایک رسی تک کی معافی بھی نہ دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت کے فکری اتحاد کی اساس مضبوط ہوگئی تاریخ اسلام اس اقدام کی عظمت کو ہمیشہ سلام پیش کرتی رہی، کس قدر بھی فکری و عملی اضمحلال پیدا ہوا ارکانِ اسلام کی یکجائی ہمیشہ قائم رہی۔

جمع وتدوینِ قران:

قرآن مجید جو غار حراء کی خلوتوں میں نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ بتدریج نازل ہوتا رہا ایک بارگی پرانے صحائف کی طرح نازل نہ ہوا۔ اس میں حکمت کیا تھی اس کا اظہار خود قرآن مجید نے کردیا۔

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔ (الفرقان:22)

یہ اس لئے ہوا کہ ہم اس سے آپ کے دل کو مضبوط کردیں اور اسی لئے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھایا ہے۔

حالات کے تقاضے اور تعلیمات کی ضرورت کے مطابق آیات نازل ہوتی گئیں۔ کاتبین وحی کی ایک تعداد اُتری ہوئی آیات کو محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دے رہی تھی، نبی اکرم ﷺ آیات کے نزول پر موجود کاتب یا کاتبین وحی کو بلاتے اور

آیات لکھوا دیتے اور ہدایت فرماتے کہ

اس آیت کو فلاں سورت میں یوں لکھ لو۔ 15

اس طرح آیات قرانیہ لکھی جاتی رہیں۔ کتابت کے ذرائع اور وسائل محدود تھے مگر فرض کی اہمیت نے حفاظت کے کئی طریقے ایجاد کر لئے تھے، حفظ ایک محفوظ ذریعہ تھا، اکثر صحابہ کرام ؓ اترنے والی آیات کو یاد کر لیتے تھے اور پھر نبی اکرم ﷺ بھی جب تلاوت فرماتے تو ترتیب قائم رہتی اس سے بھی یادداشت کو مہمیز ملتی۔

حضرت صدیق اکبر ؓ کے عہد خلافت کی ابتداء بعض شورشوں کو دبانے سے ہوئی۔ توجہ کا مرکز مرکزیت کا تحفظ رہا۔ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمر ؓ کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں قرآن مجید کی حفاظت میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ حضرت صدیق اکبر ؓ سے اس اندیشے کا تذکرہ کیا۔ ابتداء کچھ رائے کا اختلاف بھی ہوا مگر جلد ہی تدوین کی ضرورت کا فیصلہ کرلیا گیا۔ قرآن مجید کے مختلف اجزاء صحابہ کرام ؓ کے پاس محفوظ تھے کچھ اوراق پر تھے تو کچھ پتوں اور کچھ پتھر کی سلوں پر، ان سب کو یکجا کرنے کا اعلان ہوا۔ حضرت زید بن ثابت ؓ کو سربراہ مقرر کیا گیا اور ایک بورڈ تشکیل دے دیا گیا۔ اعلان عام ہوا کہ جس کے پاس کوئی محفوظ آیت یا سورت ہے وہ اس بورڈ کے سامنے لے آئے، احتیاط کی گئی کہ ہر آیت یا سورت کو محفوظ کرنے سے پہلے کم از کم دو گواہوں کی تصدیق حاصل کی گئی یوں ایک مستند نسخہ ترتیب پا گیا۔ یہ نسخہ مرکزی بعد میں ام المومنین حضرت حفصہ ؓ کے سپرد کردیا گیا کہ وہ ازواج میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی تھیں اس طرح حفاظت قرآن کی ذمہ داری ایک عورت کو نصیب ہوئی جس کا حق مستوراتِ اسلام نے ہر دور میں ادا کیا۔

قرآن مجید کا ہر قاری جب ایک مربوط اور منضبط نسخے کو ہاتھوں میں لیتا ہے تو بے اختیار اس سعادت پر حضرت صدیق اکبر ؓ کو سپاسِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

الغرض حضرت صدیق اکبر ؓ کا مختصر دورِ خلافت امت مسلمہ کے لئے سدا بہار رحمتوں کا سبب تھا جس کا اعتراف ہر دور میں ہوا اور قیامت تک ہوتا رہے گا جانثاری اور جان دادگی کی جسقدر روایات، وجودِ صدیق اکبر ؓ نے قائم کئیں اُن پر ہر مورخ اُن کو خراج محبت پیش کرتا رہے گا۔

حضرت صدیق اکبر ؓ کے کارہائے نمایاں تو تاریخ کا حصہ ہیں مگر وہ سوزِ محبت جو ایمان کی حرارت کو زندہ رکھتا ہے، نسل در نسل اصحاب محبت میں منتقل ہوتا رہا کبھی یہ حضرت سلمان فارسی ؓ کی صورت جلوہ گر ہوا تو کبھی امام جعفر صادق ؓ کے روپ میں ہدایت کا مینارۂ نور بنا، کبھی حضرت بایزید بسطامی ؒ کے وجود میں ہدایت کا پیغام بنا تو کبھی ابوالحسن علی خرقانی ؒ کے دست حق پرست کی صورت قاسمِ نعمت بنا اور یہ سلسلہ اس قدر مستحکم رہا کہ آج بھی شرق وغرب میں یہ فیضان جاری ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق اکبر ؓ کی ذات سے مسلمانانِ عالم نے عقائد پر پختگی اعمال میں استواری اور رویوں میں استقامت کا درس لیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اتباعِ شریعت کا ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوا کہ طریقت کا ہر پہلو شریعت کے حصار میں آگیا، اسی مستقیم روش پر حضرت مجدد الف ثانی ؒ فخر بھی کرتے ہیں اور قائم رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ خصوصیت سے ایثار وقربانی کی جو روش آپ نے اپنائی تھی وہ سلسلہ نقشبندیہ کا ہر دور میں امتیاز رہی۔ امت کی ضرورت کے لئے گھر بار نثار کر دینا اور اس یقین محکم کا اظہار درِ صداقت پر حاضر ہو کر کرنا کہ

صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

وہ شرف ہے جس کی آرزو سب اکابر کو رہی حتّٰی کہ حضرت عمر فاروق ؓ بھی اسی تمنا کو دل سے لگائے رہے صوفیاء کا کردار جب بھی سیرت صدیق اکبر ؓ میں ڈھل جائے گا۔ قربتِ رسول اکرم ﷺ کی راہیں کھل جائیں گی، یہی حسرت سب کے دل میں ہے اور یہی تمنا حاصلِ ایمان ہے۔

دو سال تین ماہ گیارہ دن خلافت صدیقی کا کل دورانیہ ہے۔ اس ہنگامہ خیز دورِ خلافت میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دین کی اساس مستحکم ہوگئی آخر وہ وقت آیا جو ہر ذی روح کا نصیب ہے 22 جمادی الآخریٰ 13ھ سوموار اور منگل کی درمیانی رات انتقال فرمایا اور حجرہ اقدس میں دفن ہوئے۔ یار غار کو یار مزار ہونے کا بھی شرف حاصل ہو گیا جو اس حقیقت کی دلیل ہے کہ اس قدر پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے کہ اُن کے آقاء کریم ﷺ نے ہمیشہ کے لئے آغوش میں لے لیا، یہ قرب دائمی ہے اور روضہ اقدس پر ہر نظر ڈالنے والے کے لئے پیغام ہے کہ یہ ہے میرا رفیق، جس کی رفاقت موت بھی چھین نہیں سکی۔

ہو عطا باغِ صداقت سے مجھے بوئے یقین
تا کہ ہو جائیں عمل میرے مصفیٰ بالیقین
حضرت صدیق اکبر باصفا کے واسطے

حوالہ جات

1 صحیح البخاری کتاب المناقب باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

2 مستدرک حاکم

3 سنن ابی داؤد باب فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ

4 دیوان حسان رضی اللہ عنہ

5 جامع الترمذی باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

6 صحیح البخاری کتاب المناقب باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

7 حوالہ مذکورہ

8 سنن ابی داؤد کتاب السنہ باب فی الخلفاء

9 جامع الترمذی باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

10 سنن ابن ماجہ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ

11 جامع الترمذی باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

12 سنن ابن ماجہ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ

13 مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ

14 کشف المحجوب باب ''تصوف''

15 سنن ابی داؤد کتاب الصلاۃ باب من جھر بھا

3۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

(م 33ھ)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی کوائف زندگی تک رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مورخین نے اس قدر سراغ لگایا ہے کہ آپ رام ہرمز کے مضافات کے ایک قصبہ جی کے رہنے والے تھے جو اصفہان کے قریب ہے والد آتش پرست بلکہ آتش پرستوں کے ایک معبد کے نگران بھی تھے۔ خوشحال گھرانہ تھا مگر جس وجود کے اندر تلاش حق کی تڑپ انگڑائیاں لینے لگے وہ مال و دولت سے دل نہیں لگاتا۔ خاندان والے ان کے وجود میں مستقبل کا مذہبی راہنما دیکھ رہے تھے اس لئے تربیت پر پوری توجہ دی گئی مگر قدرت کا فیصلہ اور تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نوخیز عمری میں عیسائیوں کے مذہبی راہنماؤں سے مانوس ہوگئے۔ والد نے اس پر برہمی کا بھی اظہار کیا مگر افتادِ طبع کو کیسے روکا جاسکتا تھا، ایک موقعہ پاکر عیسائیوں کے ایک قافلے کے ساتھ شام کا رخ کیا کہ انہیں بتایا گیا تھا کہ عیسائیت کی تعلیمات کے مراکز وہیں ہیں شام میں کچھ عرصہ قیام رہا، عیسائی طرز عبادت سے بھی مانوس ہوئے اور علم و دانش کے مراکز تک بھی رسائی حاصل کی۔ یہیں مطالعہ کے دوران میں حجاز کی وادی میں ایک نبی کے ظہور کی بھی خبر پڑھی۔ تجسس پسند طبیعت ہمہ تن تلاش بن گئی۔ تنہا تھے کوئی سہارا بھی نہ تھا اس لئے راہب انہیں فروخت کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے تقریباً دس مرتبہ فروخت ہوئے۔ آخری راہب جس کے ہاں آپ رہ رہے تھے، سراپا جستجو دیکھ

کر کہنے لگا کہ نبی آخرالزمان کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے، اشارہ پا چکے تو
راہب کے انتقال کے بعد یثرب کو چل پڑے مگر معاشرتی جبر کی حد یہ تھی کہ بنوکلب
کے ایک قافلے کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے اور ستم کیا کہ بنو قریظہ کے ایک یہودی
جس کا نام عثمان بن سہل تھا کے ہاتھ فروخت کر دیا، اس طرح وادی یثرب میں آ گئے،
یہ وہ وقت تھا کہ ابھی حضور اکرم ﷺ یثرت کو مدینہ بنانے کے لئے تشریف نہ لائے
تھے مگر آمد آمد تھی۔ آخر وہ لمحہ مسعود آ گیا کہ نبی رحمت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے
آئے۔ حضرت سلمان ؓ تو اسی لمحے کے متلاشی تھے۔ آمد کی خبر ہوئی۔ موقعہ پایا
تو حاضر دربار ہو گئے اور ہجرت کے بعد پہلے سال ہی دامن اسلام میں آ گئے یوں یہ
سفر نجات اپنی منزل پر پہنچا۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود غلامی کا پھندا گلے میں
تھا مگر آپ نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ حالات کچھ سازگار ہوئے۔
معاندین کے جبر کا حصار ٹوٹا تو نبی رحمت ﷺ کی نگاہ رحمت اور شفقت بے پایاں
کے طفیل غلامی سے رہائی نصیب ہوگئی۔

حضرت سلمان ؓ اب ایک آزاد شہری کی حیثیت سے مدینہ منورہ رہنے
لگے۔ مادری زبان فارسی تھی، عرب ماحول میں کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر
نبی العلم ﷺ کی شفقت نے اس مجبوری سے بھی رہائی عطا فرمادی اور عربی زبان
پر حسب ضرورت دسترس پیدا ہوگئی۔ یہ سوال ہمیشہ سے درپیش رہا کہ اُن کے والد کا نام
کیا تھا خود حضرت سلمان ؓ اس کا جواب پورے مومنانہ جذبے سے دیا کرتے کہ
"سلمان بن اسلام" ہجرت کے بعد مہاجرین وانصار کے درمیان "مواخات" کا اہتمام
ہوا تھا کہ اجنبیت کی کوئی فضا نہ رہے۔ جب حضرت سلمان دائرہ اسلام میں آئے تو

اگرچہ آزاد نہ تھے مگر حقوق کی پاسداری کے لئے آپ کو حضرت ابوالدرداء ؓ کے ساتھ
مواخات کے سلک مروارید میں پرو دیا گیا، یہ مواخات پوری زندگی اپنا اثر دکھاتی رہی۔
غزوہ احزاب جو 5 ہجری میں پیش آیا ایک نئی حکمت عمل کا متقاضی تھا،
مدینہ منورہ کی کھلی جانب جہاں پہاڑوں کا قدرتی حصار نہ تھا خندق کھودنے کا فیصلہ
ہوا۔ روایات کہتی ہیں کہ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان ؓ کا ہی تھا کہ اُن کا
قیام فارس کا تجربہ یہی تھا، حاضر دربار ہوئے اور خندق کھودنے کا عرض کیا۔
نبی اکرم ﷺ کو یہ مشورہ بہت پسند آیا چنانچہ اس کے مطابق عمل کیا گیا۔ یہ شرف بھی
آپ کو اسی غزوہ کے دوران حاصل ہوا کہ خندق کھودنے کے لئے قبائل میں جگہیں
متعین کردی گئیں تاکہ ہر قبیلہ اپنے حصے کی خندق کھودے۔ اس تقسیم میں سوال اٹھا کہ
حضرت سلمان فارسی ؓ کس قبیلے کا ساتھ دیں۔ مہاجرین انہیں اپنا فرد گردانتے
تھے اور انصار ان کو اپنی جانب شمار کرتے تھے۔ آراء کا کچھ اختلاف ہوا فیصلے کے لئے
معاملہ نبی اکرم ﷺ کے حضور پیش کیا گیا۔ رحمت عالمین ﷺ کا فیصلہ تھا
"سَلْمَانُ مِنْ اَهْلِ الْبَیْتِ" "سلمان میرے اہل بیت میں سے ہے یہ وہ فخر ہے جو
ہمیشہ کے لئے حضرت سلمان فارسی ؓ کا امتیازی وصف رہا۔

حضرت سلمان ؓ کی حیات مبارک رسول اللہ ﷺ کے رحمت بھرے
سایوں میں سمٹ آئی تھی شب وروز اشاعت دین کی سرگرمیوں میں شریک تھے۔
پڑھے لکھے تھے۔ اہل کتاب کے خیالات ونظریات سے آگاہ تھے۔ خود بھی تلاشِ حق
کی جدوجہد میں شریک رہے تھے۔ صداقت تک پہنچنے میں جس قدر نشیب وفراز آتے
ہیں ان سے آگاہ تھے اس لئے تبلیغِ دین کے ہر مرحلے سے آشنا تھے، پھر گرم جوشی

اس حد تک تھی ایک مجاہد کا روپ اختیار کر چکے تھے غزوات میں نمایاں کردار رہا کہ اُس دور کی نبرد آزمائی سے خوب آگاہ تھے۔

حضرت فاروق اعظم ؓ نے انہیں صلاحیتوں کی بنیاد پر آپ کو مدائن کی فتح کے بعد اس کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جہاں آپ کی سپہ سالارانہ مہارات بڑی وضاحت سے سامنے آئی۔ دین کو شعوری فیصلے کی بنا پر قبول کیا تھا اس لئے اس پر عمل پیرا ہونے میں ذاتی میلان بھی شامل تھا۔ گورنری کے منصب نے بھی اس روش میں کوئی تبدیل پیدا نہ کی، حضرت فاروق اعظم ؓ جہاں بانی کے تقاضوں سے آگاہ تھے اسی لئے گورنروں کو خود کفالت کے لئے معقول تنخواہ دیتے تھے۔ آپ کی بھی پانچ ہزار درہم سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی مگر آپ کی بے نیازی اور آسائش دنیوی سے اس قدر بے رغبتی تھی کہ ساری تنخواہ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے، زنبیل بافی سے گزر اوقات کرتے فرماتے ہیں۔

''ایک درہم کے کھجور کے پتے خرید تا ہوں ان سے زنبیل بناتا ہوں اور تین درہم میں فروخت کر دیتا ہوں۔ ایک درہم سے پھر پتے خرید لیتا ہوں ایک درہم اپنے عیال پر خرچ کرتا ہوں اور ایک درہم خیرات کر دیتا ہوں''۔

کھجور کے پتوں سے ایک جھونپڑی تیار کر کے رہتے، عقیدت مند ایک پُر آسائش گھر کی تعمیر کا مشورہ دیتے تو انکار کر دیتے۔ ایک کمبل کل کائنات تھی، ادھا نیچے بچھا لیتے اور آدھا اوپر لے لیتے اسی کمبل کو اوڑھے لوگوں کے درمیان آجاتے ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو راہ چلتے دیکھ کر مزدور سمجھا اور اپنا سامان اٹھانے کا کہا، آپ نے اٹھا لیا، منزل کے قریب پہنچے تو کسی آشنا نے پہچان لیا اور حیرت سے پوچھا

اے امیر، یہ بوجھ کیوں اٹھا رکھا ہے؟ کچھ پریشان نہ ہوئے بوجھ کا مالک شرمندہ ہو گیا اور معذرت چاہی مگر آپ نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا اور سامان منزل تک پہنچا کر ہی آئے۔ آپ جیسے افراد ہی ملت اسلامیہ کے لئے قابلِ فخر تھے کہ ان کی بدولت دین کی ترویج کا سامان ہوتا رہا۔

اس درویشی کے باوجود شادی کی، باہمت تھی وہ خاتون بھی جس نے اپنا مستقبل ایک تقویٰ شعار وجود کے ساتھ جوڑ لیا تھا جس کے ہاں گھر کی کل متاع ایک لوٹا، ایک پالان، ایک پوستین اور ایک کمبل تھا، پھر بھی اس نیک خاتون نے اس درویش کدے کو ترجیح دی، دو بچے پیدا ہوئے جن کی اولاد سے آپ کی نسل چلی اور خوب پھلی پھولی۔

حضرت سلمان فارسی ؓ کی کل ملکیت ایک متوسط گھرانے سے بھی کم تھی کہ دولت جمع کرنے کا شوق نہ تھا دولت کی طلب ترجیح ہوتی تو اپنے باپ کا آتش کدہ کبھی نہ چھوڑتے جہاں متوسلین کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، آپکی زندگی کا منشور ہی یہ تھا کہ دنیا میں آخرت کا سامان کر لیا جائے جس میں آپ کامیاب رہے آخری وقت آیا تو رونے لگے، معتقدین نے اس گریہ کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ

''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ اگر تم قیامت کے روز مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو دنیا جمع نہ کرنا اور دنیا سے اس طرح جانا جیسے میں جاتا ہوں''، لیکن میرے پاس تو سامانِ دنیا اکٹھا ہو گیا ہے۔1

ذرا غور فرمایئے سامان کیا تھا اور کس پر پریشان تھے۔ اللہ اللہ یہی لوگ ہیں جو دینِ اسلام کی عظمت وصداقت کی دلیل ہیں، عین وقت وفات اپنی بیوی سے کہا کہ جو کستوری تمہارے پاس ہے اُسے پانی میں بھگو کر میرے گرد چھڑک دینا اور خود

باہر چلی جانا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ زوجہ محترمہ گھر سے نکلی ہی تھی کہ آواز آئی۔

السلام علیك یاولی اللہ۔ السلام علیك یاصاحب رسول اللہ

آواز بند ہوئی زوجہ محترمہ اندر آئیں تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنے خالق کے پاس جا چکے تھے۔ عمر کے بارے میں مختلف روایات ہیں اکثر سوانح نگار ڈھائی سو سال بتاتے ہیں مگر اہل نقد ونظر اس پر اعتماد نہیں کرتے، امام الذھبی کے قول کے مطابق تقریباً چالیس سال کے تھے کہ مدینہ منورہ آئے اور پنتیس یا چھتیس ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ اس طرح آپ کی عمر پچتر یا چھہتر سال بنتی ہے اور اگر تینتیس ہجری کو وفات مانا جائے تو تہتر سال کی عمر ہوئی۔ 2

مدائن میں انتقال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے وہ علاقہ جہاں دفن کیا گیا وہ علاقہ آج بھی سلمان پاک کے نام سے معروف ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے انتہا درجے کا قرب رکھتے تھے پاس بیٹھتے تو مجلس طویل ہو جاتی، یہ صریحاً قرب کی دلیل ہے۔ ارشادات نبوی میں آپ کا فضائل کا کئی بار ذکر آیا مثلاً ایک مرتبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار آدمیوں سے محبت کا حکم فرمایا ہے۔ پوچھا گیا کہ وہ کون کون سے ہیں تو فرمایا یہ علی، ابوذر، مقداد اور سلمان (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ 3

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ اِلٰی ثَلٰثَةٍ عَلِیٍّ وعَمَّارٍ وَسَلْمَانَ۔ 4

''بے شک جنت تین کی مشتاق ہے۔ حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے ارشادات اور روایات حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رفعتِ شان اور قرب رسول ﷺ کی شہادت دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا اے ابو عبداللہ کیسے ہو، فرمایا بہت خوش ہوں، پھر پوچھا کہ آپ نے وہاں کس عمل کو افضل پایا۔ آپ نے فرمایا میں نے توکل کو عجیب چیز پایا''۔ 5

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اُن صحابہ کرام میں سے ہیں جو ہمہ وقت دربار رسالت میں رہتے تھے اور فرامین رسالت سے بہرہ ور ہوتے تھے، اصحاب صفہ سے بھی نسبت تھی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قرب بھی حاصل تھا اس لئے جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وقتِ آخر قریب آیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ عیادت کے لئے تشریف لائے اور عرض کیا کہ مجھے وصیت فرمائیے اس پر آپ نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا فتح کرنے کو ہے۔ اس میں سے بقدر بسر اوقات لینا یاد رکھو کہ جو کوئی صبح کی نماز ادا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عہد میں آجاتا ہے ایسا نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی کرو۔ کیونکہ یہ عہد شکنی تمہیں منہ کے بل دوزخ میں ڈالے گی''۔ 6

یہ آخری نصیحت ہی نسبت کا رابطہ بنی، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیض یافتہ ہیں اور نسبتِ سلوک کے محافظ ہیں۔

حوالہ جات

1. تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:64
2. اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 11 ص:989
3. جامع الترمذی باب مناقب علی رضی اللہ عنہ
4. حوالہ مذکور۔ باب مناقب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ
5. انوار لاثانی کامل ص:307

   بحوالہ طبقات جلد:4 ص 92
6. تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص:129

4۔ حضرت امام قاسم رضی اللہ عنہ

امام قاسم رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں آپ کے والد گرامی یعنی محمد بن ابی بکر حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آگئی تھیں اس لئے محمد بن ابی بکر نوعمری ہی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر آئے اورانہیں کے سایہ شفقت میں پروان چڑھے اور آپ کی مہمات میں بھی شریک رہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شاہ ایران یزدگرد کی تین بیٹیاں اسیر ہوکر مدینہ منورہ آئیں، معاشرتی رویوں کی پاسداری کرتے ہوئے تینوں کومعزز اورمحترم خاندانوں میں دے دیا گیا۔ ایک بیٹی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئی، دوسری حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دی گئیں تو تیسری محمد ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں، اس طرح تین معزز گھرانوں کے تینوں افراد ہم زلف تھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اسی ایرانی شہزادی کے بطن سے تھے۔ حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ دوسری شہزادی کے شکم سے تھے اور قاسم بن محمد رضی اللہ عنہ تیسری کے فرزند تھے۔ اس طرح یہ تینوں نامور سپوت آپس میں خالہ زاد تھے۔ یہ نسبت ہر دور میں قائم رہی اور اس تعلق کی پاسداری بھی ہوتی رہی۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کی پیدائش 23 شعبان 24ھ میں ہوئی۔ ابھی تو نوعمر ہی تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور آپ اپنی پھوپھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سایہ تربیت میں

آ گئے، حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان کی تربیت پر بہت توجہ دی، قرآن وحدیث کا عالم بنایا اور خصوصی طور پر استنباطِ مسائل میں طاق کر دیا۔ اسی لئے آپ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں شمار ہوئے، بڑے بڑے علماء ومحدثین اور فقہا نے آپ سے فیض پایا۔ خالہ زادگی کی نسبت کی بنا پر آپ کا گہرا تعلق حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سے تھا مگر داخلی نسبت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے تھی۔ اس نسبت کی پختگی کے دو محرّک تھے ایک یہ کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضرت امام قاسم رضی اللہ عنہ کے جد امجد سے فیض یافتہ تھے اور دوسرے یہ کہ انہیں اہل بیت میں شمار کیا گیا تھا یوں یہ نسبت اہل بہت کے سایوں میں بھی رہی اور اپنے جد امجد سے بھی استوار ہوگئی۔

نسبت اور تربیت نے امام قاسم رضی اللہ عنہ کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ بڑے بڑے عالم آپ کی شوکت علمی کے معترف تھے مثلاً روایت ہوا کہ

آپ لائق اعتماد عالم، عالی قدر فقیہہ، کثیر الحدیث امام اور بڑے پرہیز گار تھے۔1

آپ تابعین کے سردار، علم وادب اور فقہ میں اپنے اہل زمانہ پر گوئے سبقت رکھتے تھے۔2

یحیٰی بن معاذ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ منورہ میں امام قاسم سے بڑھ کر کسی کو علم وفضل، عمل وتقویٰ، فقہ وحدیث، تفسیر القرآن الکریم اور علوم طریقت وحقیقت میں افضل نہیں دیکھا۔3

تقریباً چوراسی سال عمر پائی اور یہ ساری درس وتدریس میں ہی گزاری 108ھ کی 24 جمادی الآخریٰ کو وفات پائی۔ وقت رحلت آیا تو وصیت کی کہ انہیں اُن تینوں کپڑوں میں دفن کر دیا جائے جو وہ نماز کے وقت پہنتے تھے۔

صاحبزادے جن کا نام عبدالرحمن تھا نے عرض کیا کہ دو کپڑوں کا اضافہ نہ کر دیا جائے تو فرمایا یہ زندہ انسانوں کی ضرورت ہے مجھے میرے جد امجد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح تین کپڑوں کا ہی کفن دیا جائے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے راستے پر مقام قدید انتقال ہوا اور قریبی پہاڑ مثلل پر دفن کر دیا گیا۔

دو صاحبزادے تھے عبدالرحمن اور محمد اور دو ہی صاحبزادیاں تھیں ام فروہ اور ام حکیم، یہ یاد رہے کہ ام فروہ علیہا الرحمۃ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں، صاحبزادوں میں بھی علم کی شمع روشن رہی اور یہ سلسلہ ہدایت پوری آب وتاب سے جاری رہا۔ آپ کا فیضِ نسبت اپنے نواسے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے ذریعے سلسلہ نقشبندیہ میں مسلسل جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ خاندانِ صدیقی کے اس فیض کو دوام عطا فرمائے آمین

حوالہ جات

1 طبقات ابن سعد
2 تہذیب التہذیب
3 انوار لاثانی کامل ص: 210۔211

5۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ
(م 148ھ)

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ائمہ اہل بیت کے جلیل القدر فرد ہیں منزلت اور رفعت آپ کا ہالہ کئے ہوئے ہے۔ والد گرامی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں، سادات اہل بیت میں شمار ہونے کے ساتھ خانوادہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے خصوصی نسبت رکھتے ہیں، آپ کی والدہ ام فروہ رضی اللہ عنہا امام قاسم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور نانی اسماء رضی اللہ عنہا حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی لختِ جگر تھیں۔ ان نسبتوں پر آپ کو فخر بھی تھا۔ آپ کا یہ قول کہ

وَلَدَنِیْ اَبُوْبَکْرٍ مَرَّتَیْنِ۔ 1

کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے دو دفعہ جنا ہے

اس سے آپ کی مراد کیا تھا سوانح نگاروں نے دو ہی تاویلیں کی ہیں، ایک یہی خاندانی نسبت کہ ماں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھیں اور نانی بھی مگر اکثر توجیہ نگاروں نے نسلی نسبت اور سلوک کی نسبت مراد لی ہے کہ آپ نسلاً بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منسوب تھے اور کسبِ فیض کا سلسلہ بھی حضرت امام قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔

آپ کے سنّ پیدائش میں قدرے اختلاف ہے تاریخ پیدائش تو متفقہ ہے کہ 21 ربیع الاول ہے مگر سن ولادت کے بارے میں دو آراء ہیں 80 ہجری یا 83 ہجری 80 ہجری کا اکثر سوانح نگاروں نے تذکرہ کیا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ

چودہ سال کے تھے کہ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا جو 94ھ کا واقعہ ہے، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو تربیت کے ایسے مہ وسال ملے جو تقویٰ کی سند سے منور تھے یعنی چودہ سال اپنے دادا محترم حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے زیر سایہ گزارے، چونتیس سال اپنے والد گرامی حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کی صحبت نصیب رہی اور ستائیس سال اپنے نانا حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کا سایہ شفقت حاصل رہا اس طرح فیضان روحانی کے حصول کی ایک بے پناہ دولت آپ کی روحانی ثروت کا باعث بنی، شروع سے ہی صدق مقال اور صدق کردار کے امتیازات حاصل ہوئے اس لئے امام جعفر الصادق کہلائے یہ فیضانِ صدیقی کا ہی پرتو محسوس ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کا پاکیزہ ماحول ملا تھا جہاں ہر جانب پاکیزگی اور پارسائی کے جلوے تھے روضہ انور کی قربت اور اہل بیت کے مراکز انوار نے علم و عمل کا اک جہان آباد کر دیا تھا امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ اس جہاں علم کے درخشندہ ستارے تھے کہ مشتاقانِ علم اُن کے در اقدس پر پروانہ وار حاضر رہے، تیس ہزار احادیث کی روایت کا ذکر ملتا ہے۔ پوچھا گیا کہ ان روایات کی سند کیا ہے تو فرمایا۔

میں نے اپنے والد سے سنی ہیں اور بعض اُن کی تحریرات سے مجھے ملی ہیں۔ 2

ائمہ حدیث کی کثیر تعداد آپ سے روایت کا شرف رکھتی ہے، ان میں امام مالک، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام الترمذی، امام النسائی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابرین بھی ہیں۔ فقہ جعفریہ تو سرتاپا آپ سے نسبت کا دعویٰ رکھتی ہے، علمی سطوت کے باوجود انکسار اس حد تک تھا کہ فرماتے۔

مغرور مطیع گنہگار رہتا ہے اور نادم گنہگار مطیع ہوتا ہے۔3

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مزاج میں مزاح بھی تھا مگر جب نبی اکرم ﷺ کا ذکر آجاتا تو رنگ زرد ہوجاتا حدیث مبارک کی روایت میں کلمات رسول ﷺ کا اس قدر احترام سے ذکر کرتے کہ کبھی بے وضو لفظ تک ادا نہ کرتے، یہی تقویٰ شعاری آپ کو مرجع خلائق بنا رہی تھی کہ بڑے بڑے عالم حاضر دربار رہیے۔ تلامذہ میں نہایت جلیل القدر ائمہ شامل ہیں۔ مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ، یحییٰ بن سعید انصاری، امام مالک، صاحب سیرت محمد بن اسحاق اور آپ کے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم علیہم الرضوان ان کے علاوہ حضرت امام سفیان ثوری اور حضرت امام سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ بھی شرفِ تلمذ سے بہرہ یاب تھے، مثلاً شیانِ علم جوق در جوق آتے اور دامن علم وحکمت کو بھر کر جاتے، ایک دائمی وقار چہرے پر پہرہ دیتا کہ ہر دیکھنے والا پکار اٹھتا کہ یہ شاخِ نبوت کا ثمر ہے عمر بن ابی المقدم کا فرمانا ہے کہ میں جب بھی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو دیکھتا ہوں تو یقین ہوجاتا ہے کہ آپ خاندانِ نبوت میں سے ہیں۔

ائمہ کرام آپ کی جلالت شان کے معترف تھے مثلاً امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ۔

اِتَّفَقُوا عَلٰی اِمَامَتِهٖ وَجَلَالَتِهٖ وَسِيَادَتِهٖ۔4

کہ آئمہ امت آپ کی امامت، جلالت شان اور سیادت پر اتفاق رکھتے ہیں

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ

"میں نے اہل بیت میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو فقیہ نہیں دیکھا۔5

اُس دور کا سب سے بڑا مسئلہ علم کلام تھا کہ بیرونی خیالات وتصورات ملت اسلامیہ میں ہیجان پیدا کر چکے تھے اس لئے نظری اعتراضات وفلسفیانہ موشگافیوں

کا رد علم کلام میں ڈھونڈا گیا، یہ دور ایسا تقاضا کرتا تھا اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ دین کی اس ضرورت سے غافل نہ تھے، عقل کی بنیاد پر اٹھنے والے مسائل پر آپ کو اس قدر دسترس تھی کہ باقاعدہ مناظرانہ اسلوب اختیار کر لیتے تھے اور معترضین کو داریتی حوالوں سے بھی قائل کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے۔ علمی سطوت اور عملی طہارت کے باوجود برتری کا کوئی زعم نہ تھا۔ سراپا انکسار تھے، حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ حاضر دربار ہوئے اور عرض کیا کہ اے فرزندِ رسول ﷺ مجھے نصیحت فرمائے کہ میرا دل سیاہ ہوگیا ہے۔ فرمایا

"اے ابوسفیان، آپ زاہد زمانہ ہیں آپ کو میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے"

عرض کیا آپ خاندانِ نبوت میں سے ہیں، آپ کی فضیلت ہم سب پر ثابت ہے اس لئے آپ پر فرض ہے کہ آپ سب کو نصیحت فرمائیں، فرمایا۔

"اے ابوسفیان، مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن کہیں میرے جد بزرگوار میرا دامن نہ پکڑیں اور فرمائیں کہ حق متابعت کیوں بجا نہ لایا، کیونکہ یہ کام نسب پر موقوف نہیں بلکہ بارگاہِ رب العزت میں عمل کی پسندیدگی پر موقوف ہے"۔

یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ بہت روئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر عرض کی کہ اے پروردگار جس شخص کی سرشت نبوت کے آب وگل سے ہے اور جس کے جد بزرگوار رسول اکرم ﷺ اور ماں خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہوں وہ ایسی حیرانی میں ہے تو داؤد کس شمار میں ہے۔6

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ پاکیزہ نسبتوں کے حصار میں تھے۔ علم وعمل کا جوہر بھی تابدار تھا، عباسی حکومت سے خوش تو نہ تھے مگر کبھی کسی مخالف تحریک میں حصہ نہ لیا، سیاست سے کنارہ کش ہی رہے اور اپنا پورا وقت ترویج علم اور تقویم عقائد کی

جدوجہد میں گزارتے رہے، عباسی خلیفہ منصور اپنے اندر آپ کی ذات سے خوف محسوس کرتا رہا اور اس کوشش میں بھی رہا کہ آپ کو قتل کرا دے مگر امام کی ہیبت اس قدر تھی کہ جرأت نہ کر سکا اور امام اپنے مشن پر بلا خوف وخطر کاربند رہے ہر آنے والے کو نیکی کی طرف راغب کرتے اور برائی سے بچنے کی تدبیر مسلسل جاری رہی ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ حاضر ہوئے اور کچھ سوالات کئے تاکہ راستی کی منزل آسان ہوجائے مثلاً فرمایا۔

"اے سفیان دروغ گو کو مروّت نہیں ہوتی، حاسد کو راحت نہیں ہوتی، بدخلق کو سرداری نہیں ہوتی اور ملوک یعنی بادشاہوں کو اخوت نہیں ہوتی"۔

پھر فرمایا۔

"اے سفیان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے محارم سے بچانا تاکہ عابد بن جاؤ۔ جو کچھ قسمت میں مل گیا اس پر راضی رہنا تاکہ مسلم بن جاؤ۔ فاجر سے صحبت نہ رکھنا کہ تجھ پر فجور غالب آجائے گا۔ اور اپنے معاملات میں ایسے آدمیوں سے مشورہ کرنا جو اطاعت خدا کا خوف کرتے ہوں"۔

پھر مزید نصیحت کے سوال پر فرمایا۔

"اے سفیان جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی عزت بلا ذات وقبیلہ کے ہو اور رعب بلا حکومت کے ہو، اس سے کہو کہ گناہ چھوڑ دے اور اطاعت اختیار کرے۔ 7

اس قدر عالی مرتبت ہوکر بھی معاشرے میں کسی منزلت کا اظہار نہ کرنا بلکہ سادگی اور بے نفسی سے زندگی گزارنا، ان اصحابِ عظمت کا شیوہ ہوتا ہے۔ دنیاوی معاملات میں اپنی برتری منوانے کا کوئی شوق ان عشاق کے ہاں کبھی نہیں پایا

جاتا۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا ہر پہلو سرافراز تھا، معاشرتی احترام کا ہر رُخ انہیں کی جانب تھا مگر آپ معاشرے میں کس طرح رہتے تھے یہ اس واقعے سے ہویدا ہے۔

"ایک شخص کی اشرفیوں کی تھیلی گم ہوگئی، وہ حضرت امام سے واقفیت نہ رکھتا تھا، اس نے آپ پر شک کرتے ہوئے کہا کہ میری تھیلی تم نے لی ہے۔ حضرت امام نے اس سے بحث نہ کی فرمایا کس قدر دینار تھے، اس نے کہا کہ ایک ہزار تھے۔ آپ اسے اپنے کمرے میں لے گئے اور ہزار دینار دے دیئے جب وہ شخص اپنے گھر واپس گیا تو اسے وہاں اپنی تھیلی مل گئی وہ شخص واپس حضرت امام کے پاس آیا اور عرض کی کہ مجھ سے خطا ہوئی ہے، مجھے اپنی تھیلی مل گئی ہے، آپ اپنے دینار واپس لے لیجئے آپ نے فرمایا، تم یہ لے جاؤ، ہم جو کچھ دے دیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے، اُس شخص نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں، اسے بتایا گیا کہ یہ امام جعفر صادق ہیں، وہ شرمندہ ہوکر چلا گیا۔ 8

صاف دکھائی دیتا ہے کہ آپ معاشرے میں سربلند ہوکر نہ رہتے تھے کہ اجنبی پہچان بھی نہ سکا، یہ بھی واضح ہوا کہ اُس دور کی معاشرت میں نیکی کے رجحانات ہر کہیں پائے جاتے تھے کہ وہ شخص تھیلی واپس لے آیا، اس سے خاندانِ اہل بیت کے طریقہ معاشرت کی بھی خبر ہوئی کہ عطا کر کے واپس نہ لیتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اسی نیک نفسی، علمی وقار اور تقویٰ شعاری کے ساتھ مدینہ منورہ میں حسنات کی خیرات بانٹتے رہے اگرچہ عباسیوں کی بعض بدگمانیوں نے متعدد بار مدینہ منورہ چھوڑنے پر مجبور بھی کیا مگر مستقل سکونت دیارِ حرم ہی میں رہی

اور وہیں شوال 148ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں احاطہ اہل بیت میں اپنے اباء واجداد کے ساتھ دفن ہوئے۔

آپ کے سات صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں جن میں حضرت موسیٰ کاظم ؒ جانشین ہوئے، ایک بیٹا اسماعیل بھی تھا جس کی طرف اسماعیلی گروہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔

امام جعفر صادق ؓ کی امام اعظم ؓ سے متعدد ملاقتیں ہوئیں امام اعظم ؒ اُن کے تلامذہ میں شمار ہوئے۔ فقہ حنفی میں حضرت امام کے بعض اثرات بڑے نمایاں ہیں فقہ جعفریہ کاملۃ آپ سے منسوب ہے۔ حضرت امام کی سلسلہ روحانیت حضرت علی ؓ سے تو نسلاً بعد نسل جاری رہا مگر آپ کی خصوصی نسبت حضرت صدیق اکبر ؓ سے ہے اس لئے سلسلہ نقشبندیہ میں آپ کا نمایاں مقام ہے۔ یہ نسبت بعد والوں کے لئے وجہ افتخار بھی ہے اور باعث برکت بھی، آپ کی بہت سی کرامات کا ذکر بھی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے مگر آپ کی سب سے بڑی کرامت اُس فیضان کا تسلسل ہے جو آج تک نسبتِ صدیقی کے اعزاز سے سرافراز ہے۔

حوالہ جات

1 تہذیب التہذیب

2 اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 7 ص:273

3 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:74

4 حوالہ مذکورہ ص:214

5 حوالہ مذکورہ ص:215

6 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص:145۔146

7 تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص158

8 حوالہ مذکورہ ص:159

اور وہیں شوال 148ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں احاطہ اہل بیت میں اپنے آباء واجداد کے ساتھ دفن ہوئے۔

6۔حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

(م 261ھ)

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل نام طیفور بن عیسیٰ بن سروشان ہے۔ سروشان شروع میں آتش پرست تھے، پھر توفیق الٰہی سے مسلمان ہوگئے۔ بسطام کے رہنے والے تھے جو خراسان کے علاقے کا ایک شہر ہے۔ عباسیہ خلافت کے زیر اہتمام یہاں طاہری خاندان برسرِ اقتدار تھا بعد میں صفاری خاندان قابض ہوگیا مگر عملی طور پر برائے نام ہی سہی عباسیوں کی حکمرانی تھی۔ سروشان کے صاحبزادے عیسیٰ اسلامی ماحول میں پروان چڑھے اور محنت وریاضت سے اولیاء کاملین میں شامل ہوئے، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ پر جب ریاضت کا ذوق پوری شدت سے طاری ہوا تو آپ شہر چھوڑ کر صحراؤں میں نکل گئے اور عرفانِ حق کی منزلیں طے کیں۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ 136ھ میں بسطام میں پیدا ہوئے، ریاضت آشنا گھرانے میں آنکھ کھولی والدہ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ شکم میں تھے اور وہ کبھی ایسا لقمہ کھالیتی جسکی حلت مشتبہ ہوتی تھی تو بے قراری بڑھ جاتی تھی تا آنکہ وہ لقمہ نکل نہ جائے یا اُگل نہ دیا جائے، سچ ہے کہ طاہر وطیّب وجود اپنی شرست میں ہی پاکیزگی کے پابند ہوتے ہیں۔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو استاد کے ہاں بھیج دیئے گئے تاکہ علم حاصل کریں۔ استاد کے ہاں سورۂ لقمان پڑھ رہے تھے کہ یہ آیت تلاوت کی۔

اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ۔ (لقمان:14)

کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو۔

ہونہار تھے اور رمز شناس بھی پڑھتے ہی مضطرب ہوگئے۔ والدہ کے پاس آئے کہ اُس سے یہ الجھن دور کرانے میں مدد لیں، عرض کیا کہ حکم تو یہ ہے کہ میرا اور والدین کا شکر ادا کرو، مگر میرے لئے یہ مشکل امر ہے۔ آپ توجہ فرمائیں یا تو اللہ تعالیٰ کا شکر معاف کرادیں یا اپنا شکر معاف کردیں، والدہ اپنے صاحبزادے کے مقام بلند سے آشنا تھی کہ وہ حمل کے ایام سے ہی پاکیزہ جذبوں کو جان چکی تھی۔ فرمانے لگیں۔ میں نے اپنا حق معاف کردیا۔ تو خالصۃً اللہ تعالیٰ کا ہوجا، یہ باطنی کیفیت عزلت نشینی کا مطالبہ کررہی تھی۔ چنانچہ گھر چھوڑ دیا اور تیس سال شام کے صحراؤں میں ریاضت میں مشغول رہے اور تعلق باللہ کا رشتہ مستحکم کرتے رہے۔ پھر ساری زندگی یادِالٰہی میں گم ہوگئے اور ظاہر سے تقریباً لاتعلق رہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی زندگی کا سفر اپنی والدہ کی خدمت کے سایوں میں شروع ہوا روایت ہے کہ ہمہ وقت اطاعت وغم گساری میں رہے، ایک رات سوتے ہوئے ماں نے پانی مانگ لیا۔ گھر میں پانی موجود نہ پایا تو ندی کی طرف چلے گئے اور پیالہ بھر لائے واپس آئے تو والدہ سو رہی تھیں، انتظار میں کھڑے رہے حتّٰی کہ تمام رات گزر گئی، رات بھی سردی کی تھی مگر جذبہ خدمت مسلسل سرگرم رہا۔ جب ماں نے آنکھ کھولی اور اپنے بیٹے کو مجسم محبت بنے دیکھا تو ممتا کے دل سے ایسی ایسی دعائیں نکلیں کہ صاحبزادے کا مقدر بدل گئیں۔ آپ کے بارے میں بعض بے باکانہ جملوں کا صدور بھی منسوب ہے کہ ہمہ تن جذب کی حالت تھی اس لئے منہ سے ایسے کلمات بھی نکلے جس پر علماء ظاہر معترض بھی ہوئے اور فتوے بھی صادر کئے مگر یہ سب مجذوبانہ اظہار تھا، خود بھی اس پر متبعین کو سخت ردعمل کی تلقین کرتے تھے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ جذب وسُکر کے دورانیہ میں بھی حدود آشنا رہے تھے

نبی اکرم ﷺ سے محبت، عشق کی حد تک تھی اور یہ محبت صرف دعویٰ ہی نہ تھا اس کا عملی اظہار بھی ہوتا تھا روایت ہے کہ آپ نے خربوزہ کبھی نہ کھایا کہ اُس کو کاٹنے کی سنت کی روایت تک نہ پہنچ سکے یہ دلیل تھی کہ آپ کی پسند و ناپسند محبت رسول ﷺ سے استوار ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس پر خوب داد دی فرماتے ہیں۔

کاملِ بسطام از تقلیدِ فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اتباع کی منزلت کیا تھی اور زندگی کا لمحہ لمحہ کس قدر ادب آشنا تھا۔

روایت ہے کہ حج پر تشریف لے گئے، حج کیا اور واپس آ گئے، احباب نے کہا کہ روضہ رسول ﷺ پر حاضری چاہیے فرمایا لازم ہے مگر ارادہ حج تھا جو ادا کرلیا۔ دربار رسالت کی حاضری کو حج کے تابع نہیں کرنا چاہتا اگلے سال پھر آئے اور خالصۃً حاضری دربار رسالت کے ارادے سے آئے، اسی سے آپ کے موعود ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے جب دربار رسالت کی عظمت کا حوالہ دیا تو حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ دلیل کے طور پر کیا۔ فرمایا

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

مردانِ حق کی نگاہ بصیرت زندگی کے منتشر اوراق سے زندگی کے لئے راہنما اصول تلاش کرتی رہتی ہے حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مبارکہ اس طرح کی خوشہ چینیوں سے بھرپور ہے۔ کسی نے ایک مرتبہ پوچھا کہ آپ کا مرشد کون ہے یعنی کس سے راہ ہدایت کی راہنمائی پائی ہے فرمایا ایک بڑھیا، ہوا یوں کہ شوق ریاضت

میں جنگلوں کی طرف نکل گئے وہاں حال مست گھوم رہے تھے کہ ایک بوڑھی عورت نظر آئی جو کافی بوجھ اٹھائے ہوئے تھی اور یہ بوجھ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا، اُس نے کہا یہ بوجھ زیادہ ہے اٹھانے میں میری مدد کرو، حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بوجھ اٹھالیا، ذرا ہی چلے تھے کہ سامنے سے ایک شیر نکل آیا، آپ پر محویت غالب تھی۔ بوجھ شیر پر رکھ دیا اور کہا جاؤ مگر یہ بتاتی جاؤ کہ جب شہر پہنچوگی تو اس کیفیت کے بارے میں کیا کہو گی۔ فوراً بولی کہ کہوں گی کہ آج ایک ظالم دیکھا ہے۔ حیران ہوئے کہ یہ کیونکر، کہنے لگی، شیر بوجھ اٹھانے کا مکلف نہ تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کے لئے پیدا نہیں کیا تو نے اُسے تکلیف دی، یہ ظلم نہیں تو کیا ہے، اس ظلم کے باوجود تو چاہتا ہے کہ لوگ جان لیں کہ شیر تیرے تابع ہے، بس یہی بڑھیا تھی جس نے مجھے حدود کی پاسداری کا سبق دیا۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی تقویٰ کے اعلیٰ معیار میں گندھی ہوئی تھی۔ ذرا سا بھی انحراف پسند نہ تھا۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ آپ نے لوگوں سے سنا کہ فلاں علاقے میں ایک ولی رہتا ہے، فوراً اُس کی زیارت کے لئے چل پڑے، جب وہاں پہنچے تو وہ شخص مسجد سے باہر آرہا تھا۔ اسی اثنا میں اُس نے جانب قبلہ تھوک دیا۔ آپ دیکھتے ہی واپس لوٹ پڑے۔ پوچھا گیا ملاقات کیوں نہ کی۔ فرمایا کہ ایسا خلافِ ادب حرکت کرنے والا ولی نہیں ہوسکتا۔ اس سے آپ کے معیارِ ولایت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کا اپنا معمول یہ تھا کہ گھر سے مسجد کی طرف نکلتے، راستہ چالیس قدم کا تھا تعظیم مسجد کی خاطر راستے میں بھی نہ تھوکتے تھے۔

یہی ادب شناسی اور حدود آشنائی تھی کہ بڑے بڑے اکابر صوفیاء کے ہاں لائق احترام ٹھہرے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بایزید ہم میں سے ایسے ہیں جیسے فرشتوں میں جبرئیل۔ روایت ہے کہ گھر سے حج کے لئے روانہ

ہوئے۔ پیدل گئے اور ہر ہر قدم پر دو دو نفل پڑھتے گئے اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتے تھے ایک مرتبہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام نے بعد میں گفتگو کرتے ہوئے سوال کیا کہ کھانا پینا کہاں سے آتا ہے۔ آپ نے فرمایا ذرا صبر کرو، پہلے نماز دوہرالوں، جو شخص روزی دینے والے کو نہ جانے۔ اُس کے پیچھے نماز کیسے روا ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اسی جذب میں گزری، یک گیر و محکم گیر آپ کی زندگی کا شعار تھا، آخر یہ مردِ قلندر، محبانِ بارگاہ کا امام 4 شعبان 261ھ میں اپنی عمر کی تلاش کا صلہ پا گیا اور دربارِ الٰہی میں حاضر ہو گیا، بسطام ہی میں مزار بنا جو زیارت گاہِ خاص و عام ہے، ایسے بزرگ دنیا والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتے ہیں۔ کہ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

قرن ہا باشد کہ تا یک مرد پیدا می شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

وفات کے بعد ایک مرید نے خواب میں دیکھا تو پوچھا نکیرین سے سوال جواب کیسے رہے۔ فرمایا انہوں نے یہی پوچھا کہ رب کون ہے، جواب یہ تھا کہ اگر میں کہہ بھی دوں کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے تو یہ بات میری ہوگی جو کمتر ہوگی۔ جاؤ اُس رب سے پوچھو کہ آج قبر میں آنے والا کون ہے۔ اگر وہ کہہ دے میرا بندہ ہے تو میرے جواب کی حاجت نہ رہے گی۔ اللہ اللہ زندگی بھر وحدانیت کا درس دینے والے، ہر سانس سے اُس کی توحید کا اقرار کرنے والوں کو ان سوالوں کا کیا ڈر رہتا ہے اُن کی تو پوری زندگی ان حوالوں سے اعتراف وحدت میں گزرتی ہے۔ ان بزرگوں کا ایک ایک عمل توحید پر یقین کا اعلان ہوتا ہے۔

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو سلوک کا فیضان امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے حاصل ہوا

یہ حصول سلوک روحانی طور پر حاصل ہوا ہے کہ آپ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ہیں، ایسے فیضانِ کو اویسی ذریعہ فیضان کہا جاتا ہے۔ اگرچہ تذکرۃ الاولیاء کی بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی ہے، ہوسکتا ہے، ابو علی السندھی رحمۃ اللہ علیہ واسطہ بنے ہوں کہ تذکرہ نگار نمایاں افراد کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا مراتب شماری میں قول ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"عام مسلمانوں کے مقام کی انتہا اولیاء اللہ کے مقام کی ابتداء ہے اور اولیاء اللہ کے مقام کی انتہاء شہداء کے مقام کی ابتداء ہے۔ شہداء کے مقام کی انتہاء صدیقین کے مقام کی ابتداء ہے اور صدیقین کے مقام کی انتہاء نبیوں کے مقام کی ابتداء ہے اور نبیوں کے مقام کی انتہاء رسولوں کے مقام کی ابتداء ہے اور رسولوں کے مقام کی انتہاء حضور سید عالم ﷺ کے مقام کی ابتداء ہے اور حضور سید عالم ﷺ کے مقام کی انتہاء کسی کو بھی معلوم نہیں، صرف اللہ تعالیٰ ہی آپ کے مقام و مرتبہ کو جانتا ہے"۔ 1

اللہ تعالیٰ مراتب کی اس ترتیب پر یقین عطا فرمائے اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیضان سے سرفراز فرمائے۔ آمین

حوالہ جات

1 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:92

7۔ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ

(م 425ھ)

حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ صوفیاء کے اُس گروہ کے رکن رکین تھے جن کی پیدائش سے پہلے ہی اہل دردان کے کمالات سے آگاہ ہو چکے تھے، خرقان بسطام کے قریب ہی ایک بستی تھی اس لئے دونوں قصبوں کے ہاں لوگوں کا آنا جانا تھا، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس بستی سے گزرتے تھے کہ انہیں دہستان کے شہداء کی قبروں پر جانا ہوتا تھا، ایک مرتبہ اسی ارادے سے گزر رہے تھے تو خرقان میں رُکے، ایک مسلسل خوشبو تھی جو اس بستی سے اٹھ رہی تھی، ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا ہے تو ارشاد فرمایا، یہ بستی اگرچہ چوروں اور ڈاکوؤں کی بستی مشہور ہے مگر انہیں وہاں سے ایک مردقلندر کی مہک آرہی ہے، سوال ہوا کہ وہ کون ہوگا تو رازدانِ فطرت نے انکشاف کیا کہ ایک مرددرویش یہاں سے نمودار ہوگا جس کا نام علی ہوگا اور کنیت ابوالحسن، یہ بھی خبر دی کہ وہ تین صفات میں مجھ سے بڑھ کر ہوگا۔

ایک یہ کہ وہ اپنے اہل وعیال کا بوجھ خود اٹھائے گا۔

دوسرے یہ کہ کھیتی باڑی کرے گا

تیسرے یہ کہ شجر کاشت کیا کرے گا۔

واقف اسرار نہانی نے پیدائش سے پہلے ہی آنے والے کی خوشخبری سنادی اور معمولاتِ زندگی کی بھی خبر دے دی، ایک صدی کی یہ خبر 352ھ میں منصہ شہود پر

آئی کہ آپ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے اکیانوے سال بعد پیدا ہوئے جسمانی بُعد تھا مگر روحانی قرب کے جلوے قدم قدم پر ہویدا تھے۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پیش گوئی کا واضح تذکرہ اپنی مثنوی میں کیا ہے کہ مردانِ باصفا کے روشن ضمیروں کے سامنے آئینہ ایام یوں آشکار ہوتا ہے جیسے صراحۃً نظر آنے والی اشیاء، اس دعوے کا ثبوت اسی واقعہ کے بیان سے دیا ہے فرماتے ہیں۔

آن شنیدی داستانِ بایزید — کہ زحالِ بوالحسن از پیش دید

بوئے خوش آمد مرا درا ناگہاں — در سوادِ رے زحد خارقان

گفت زیں سو بوئے یارے می رسد — کاندریں دہ شہر یارے می رسد

"کہ کیا تو نے بایزید رحمۃ اللہ علیہ کی وہ داستان سنی ہے کہ انہوں نے ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا حال پہلے سے ہی دیکھ لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ مجھے رَے کے مضافات خرقان سے خوشبو آرہی ہے۔ فرمایا کہ اس طرف سے ایک یار کی مہک آرہی ہے کہ اس شہر میں وہ شہریار آرہا ہے۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ جوانی چڑھے تو معاملات زندگی میں فعال کردار انجام دینے لگے بسطام سے قلبی نسبت تھی اور معمول یہ تھا کہ عشاء کی نماز خرقان میں ادا کرتے اور پھر بسطام چلے جاتے اور رات بھر ریاضت میں گزارتے اور فیض خواہی کی عرض داشت پیش کرتے، نماز فجر سے پہلے واپس لوٹ آتے اور نماز فجر خرقان ہی میں ادا کرتے، پھر زندگی کے معمول میں دن بھر محنت کرتے، ادب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے اور واپس آتے ہوئے پشت مزار کی طرف نہ کرتے مسلسل بارہ سال یہی طریقہ رہا، اس ریاضت اور اسی مجاہدے نے صاحب قبر کو مائل بہ عطا کر دیا

اور آخر صاحب قبر نے فیض بخشی کا مژدہ سنایا۔ روحانی طور پر مالا مال ہو گئے مگر علم کی
کمی کا احساس گہرا تھا اور آپ جانتے تھے کہ علم کے بغیر کوئی منزلت مستحکم نہیں ہوتی،
اس لئے فریاد رس ہوئے کہ علم نہیں ہے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ تو اب فیوضات کا
در کھول چکے تھے فرمایا جو تو نے چاہا پروردگار کے ہاں سے سب مل گیا، اس طرح علم کی
دولت بھی اس درِ فیض سے ملی، سچ ہے ان بزرگوں کی عطا یک طرفہ نہیں ہوتی۔ یہ
نیابتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حامل ہوتے ہیں اس لئے ان کا اعلان محدود عطا کا نہیں
ہوتا، کھلے عام کہتے ہیں کہ سل سوال تو کرو اور یقین کے ساتھ کرو، قبولیت کا در کھلا ہے۔
چنانچہ ایسا ہی ہوا حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ علم و معرفت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر
تو آپ کو ہر جانب اپنا شیخ نظر آنے لگا اور اویسی نسبت اتنی مربوط ہوئی کہ درمیانی
رابطوں کا ذکر بھی نہ ہوا۔ یہی کہا جاتا ہے کہ آپ کی نسبت حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے ہی
ہے اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے حسی حوالوں کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ سلسلہ نسبت کچھ
یوں ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ ابو مظفر مولانا ترک طوسی رضی اللہ عنہم سے نسبت رکھتے
ہیں اور اُن کی نسبت حضرت خواجہ اعرابی یزید عشقی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی جو حضرت
خواجہ محمد مغربی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ ارادت رکھتے تھے اور وہ مرید تھے یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے
اس طرح یہ نسبت متصل تھی اگرچہ فیوض و برکات کی عطا اویسی طریق سے ہوئی۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خلفاء کے حوالے سے بھی کڑا معیار رکھتے
تھے، حق دار کو ہی حق دینے کے قائل تھے ایک مرتبہ ایک درویش صفت انسان
حاضر دربار ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے خرقہ خلافت پہنا دیں جواب دیا کہ کیا ایک
عورت جو مرد کے کپڑے پہن لے وہ مرد ہو جائے گی، وہ معترف ہوا کہ ایسا

نہیں ہو سکتا تو فرمایا بس اسی پر قیاس کر لو، خرقہ پہننے سے ولی باصفا نہیں بن جاتے اس
کے لئے سارے وجود کا اس قابل ہونا شرط ہوتا ہے۔ اپنا عمل یہ تھا کہ ہمہ وقت
ریاضت و عبادت میں رہتے تھے کہا جاتا ہے کہ چالیس سال مسلسل سر تکیے سے نہیں
لگایا۔ رات بھر قیام و سجود میں رہتے، اک جہاں آپ سے فیض یاب ہوا مگر خود ہمیشہ عجز
کا پیکر رہے۔ روایت ہے کہ آپ اور آپ کے تمام ساتھی درویش ہفتہ بھر سے بھوکے
تھے۔ ایک شخص ایک بکری اور ایک آٹے کا تھیلہ لے کر حاضر ہوا اور کہا کہ یہ صوفیاء کے
لئے ہے۔ آپ نے ساتھیوں سے فرمایا، جو صوفی ہے وہ اسے لے لے، میری تو ہمت
نہیں ہے۔ کہ صوفی ہونے کا دعویٰ کروں، یہ سنا تو کوئی بھی لینے کو تیار نہ ہوا، یہ ہدایت تھی
کہ دعویٰ تصوف کوئی معمولی دعویٰ نہیں ہے اس لئے ایسے دعوؤں سے بچ کر رہو۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"از ائمہ متاخرین، شرف اہل زمانہ در زمانہ، خود یگانہ حضرت ابوالحسن علی بن احمد
خرقانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو برگزیدہ جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں، تمام اولیاء کے مدح رہے"۔

پھر حضرت ابوالقاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے تھے کہ

"جب میں خرقان کی ولایت میں داخل ہوا تو اس بزرگ کے جلال و دبدبہ
کی وجہ سے میری فصاحت جاتی رہی اور میری تمام نکتہ سنجیاں ختم ہو گئیں۔ میں نے
خیال کیا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول کر دیا گیا ہوں۔ 1

سالک راہ طریقت کو کامیابی کا ایسا محفوظ پیمانہ دیا جو سلوک کے ہر فتنے سے
محفوظ رکھتا ہے، فرماتے ہیں کہ

"جو کہے کہ میں حق تک پہنچ گیا وہ نہیں پہنچا اور جو یہ کہے کہ مجھے اس تک پہنچا

دیا گیا وہ پہنچ گیا۔ 2

حضرت ابوالحسن خرقانی ؒ کا دور وہ ہے جبکہ عباسی خلفاء کے ہوتے ہوئے بھی محمود غزنوی کا ستارا عروج پر تھا۔ محمود غزنوی کا نام ملت اسلامیہ میں ایک کامیاب فاتح اور ایک نیک نام حکمران کی حیثیت سے مشہور تھا۔ محمود اہل سلوک کا مدّاح تھا مگر اپنا خاص معیار رکھتا تھا ایک دفعہ وہ خرقان آیا تو آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے حاضری کی خواہش کی، حالات کا جائزہ لیا اور ایک اہل کار کے ذریعے ملاقات کا پیغام بھیجا سن چکا تھا کہ حضرت ایسی ملاقاتوں کے عادی نہیں ہیں، اس لئے شرعی دلیل کے ساتھ قاصد روانہ کیا کہ اگر آپ ملاقات کے لئے تیار ہو جائیں تو فبہا وگرنہ قرآنی حکم سنانا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء:59)

"اے ایمان لانے والو، اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کرو۔ اور اس کی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں"۔

قاصد تیاری کے سارے مراحل طے کر کے حاضر دربار ہوا۔ آپ نے اس دعوت سے انکار کر دیا، قاصد نے پھر یہ آیت کریمہ پڑھی اور اطاعت کا مطالبہ کیا اس پر آپ نے فرمایا، میں اطیعوا اللہ میں اس قدر غرق ہوں کہ اطیعوا الرسول سے نادم ہوں تو اولی الامر کی نوبت کب آئی ہے۔

یہ جواب اگرچہ محمود کے اصرار کو رد کرنے کے لئے تھا مگر اس سے بعض ذہنوں میں الجھاؤ پیدا ہو سکتا تھا اس لئے حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے اس پر بڑا

عالمانہ مگر عقیدت مندانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"حضرت نے حق سبحانہ کی اطاعت کو اس کے رسول کی اطاعت کے مغایر جانا، یہ بات استقامت سے دور ہے، مستقیم الاحوال مشائخ اس قسم کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور شریعت و طریقت کے تمام مراتب میں حق سبحانہ کی اطاعت کو اس کے رسول کی اطاعت جانتے ہیں اور حق سبحانہ کی اطاعت کو جو اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے مغایر ہو عین گمراہی خیال کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حضرت شیخ کا یہ کلام حالت سکر و غلبہ حال میں صادر ہوا۔ ورنہ اطاعت رسول عین اطاعت حق سبحانہ ہے۔ 3

حضرت ابوالحسن خرقانی ؒ نے اس طرح حاضری دربار اور ملاقات کے لئے پیش قدمی سے معذرت چاہی، محمود غزنوی اس بے باکانہ استدلال پر آبدیدہ ہو گیا اور عقیدت مندانہ حاضر ہو گیا، نہایت عاجزی سے گفتگو کی اور کئی مسائل دریافت کئے عرض کرنے لگا کہ آپ حضرت بایزید ؒ کا کوئی ارشاد بیان فرمائیے، فرمایا آپ نے فرمایا جس نے مجھے دیکھا بدبختی سے محفوظ ہو گیا۔ محمود حیرت زدہ ہو گیا اور عرض کیا کہ کیا حضرت بایزید ؒ کا مقام نبی اکرم ﷺ سے بھی بڑھ کر ہے کہ آپ کو ابولہب اور ابوجہل نے دیکھا مگر بدبخت ہی رہے جواب تھا کہ محمود ادب کا خیال رکھو اور حد سے نہ بڑھو، سچی بات یہ ہے کہ سوائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی نے آپ ﷺ کو دیکھا ہی نہیں، قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف:198)

"اور آپ اُن کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف نظر ڈال رہے ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں"۔

بس کیا تھا محمود غزنوی کا سرِ نیاز جھک گیا اور دعا کا خواستگار ہوا۔ لب شیخ سے
دعا نکلی اور تعظیماً رخصت کیا اپنا پیراھن بطور تبرک عطا فرما دیا یہ تبرک اُس وقت کام آیا
جبکہ سومنات پر محمود غزنوی کا حملہ ہوا۔ پورا ہندوستان مقابلے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔
حالات سازگار نہ تھے مگر شیخ کی عطا یاد آ گئی اور پیراھن پکڑ کر بارگاہِ ایزدی میں فتح کا
خواستگار ہوا، پھر کیا ہوا تاریخ ہند اس کی گواہ ہے کہ جنگ کا رُخ بدل گیا اور سومنات کا
تیرتھ محمود غزنوی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ تائید الٰہی شامل حال ہو جائے تو فتح مندی
قدم چومتی ہے۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں دنیا کے تاجدار بھی حاضر ہوتے رہے
اور سلوک کے بادشاہ بھی، یہانتک کہ علم وفلسفہ کے امام ابوعلی سینا بھی زیارت کے لئے
حاضر ہوئے۔ کہاں وہ طلب گار جو دربار بایزید میں اپنی بے علمی کا اعتراف کرتا تھا اور کہاں
ایسا عالم بے بدل کہ علم وحکمت کا امام بھی سراپا نیاز ہے۔ یہ سب اُس بے غرضی کا ثمر تھا جو
آپ کا نشانِ امتیاز تھی، فرمایا کرتے تھے کہ دین کو شیطان سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا کہ
دنیادار عالم اور بے علم زاہد سے ہے۔ دین حق کا یہ پاسدار، علم وحکمت، خلوص وعقیدت کے
جواہر بکھیرتا ہوا 10 محرم 425ھ کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا اور تلاشِ حق کے
اضطراب سے رہائی پا گیا۔ آخری وقت نصیحت کی کہ میری قبر تیس گز گہری کھودنا کہ
مرشدِ کریم حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے اونچی نہ ہو جائے۔ یاد رہے کہ خرقان سطح
زمین کے لحاظ سے بسطام سے بلند تھا مگر مرید صادق کو اپنے مرشد کے سامنے بہر طور انکسار
تھا۔ خرقان میں دفن ہوئے اور مزار آج تک زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ آپ کے
ارشادات راہ حق کے سالک کے لئے استقامت کے استعارے ہیں، قبر پر چنے

ہوئے پتھر آج بھی ہاتھ رکھنے والوں کے لئے سامانِ راحت ہیں کہ اس طرح آپ
نے فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت کی توفیق بخشے کہ یہ نسبت
راہنما بھی ہے اور مسائل کا حل بھی۔

حوالہ جات

1 کشف المحجوب زاویہ پرنٹرز ص: 249۔ 250
2 حوالہ مذکورہ ص: 250
3 مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ جلد اوّل مکتوب نمبر 152

8۔ حضرت شیخ بوعلی فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ

(م 477ھ)

حضرت شیخ بوعلی فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ طوس کے قریب ایک گاؤں فارمیدی کے رہنے والے تھے اس لئے فارمیدی کہلائے 434ھ میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کا شوق مختلف مراکز میں لئے پھرا۔ آپ کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م 505ھ) سے درس فقہ لینے کا شرف حاصل ہے۔ اپنے دور کے متعدد علماء راسخین سے کسب علم کرتے رہے، علم کی تلاش میں مدت سرگرم رہے اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آپ کا سن ولادت 407ھ ہے جو بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے۔

جوانی ہی میں تھے کہ علمی مراکز کی جستجو میں نیشاپور آئے کہ وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کریں خوش قسمتی یہ ہوئی کہ انہیں ایام میں حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور آئے ہوئے تھے، خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نظر نے ہی گھائل کردیا ایک روز شوق اشتیاق میں گھر سے نکلے۔ راستے ہی میں شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک گزرتے ہوئے قافلے سے مل گئے اور ساتھ ہولئے یہ گروہ ایک مقام پر رک گیا اور محفل سماع شروع ہوگئی۔ شیخ فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ ایک کونے میں بیٹھے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اچانک حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ پر وجد طاری ہوگیا۔ کپڑے پھاڑ ڈالے، سماع سے فارغ ہوئے تو پھٹے ہوئے کپڑے اتار لئے، ایک آستین الگ کرلی اور بوعلی فارمیدی کا نام پکارا۔ یہ بے خبر تھے کہ یقین تھا کہ اُن کا نام معلوم نہ تھا۔

تین مرتبہ پکارا تو شک گزرا، اٹھ کر پاس گئے تو وہ آستین تفویض ہوئی اور فرمایا کہ تیرا حصہ ہے سنبھال کر رکھنا، یہ عطاء فیضان کا پہلا قطرہ تھا۔

نیشاپور میں ہی حضرت امام ابوالقاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی جو تصوف کے موضوع پر گراں قدر کتاب، رسالہ قشیریہ کے مولف تھے، انہوں نے فرمایا جوان علم حاصل کرو، تین سال حصول علم میں گزارے کہ اچانک ایک روز دوات سے قلم نکالا اور بجائے سیاہ ہونے کے سفید ہوگیا تھا، فوراً استاد محترم کے پاس گئے اور سارا واقعہ بیان کیا، امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، بس تلاش علم کا مرحلہ طے ہوگیا کہ علم تجھ سے دستبردار ہوگیا ہے اب طریقت کی دنیا میں قدم رکھو، مدرسہ سے خانقاہ میں آگئے، یہ بھی امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کے زیر انتظام تھی، ایک روز امام غسل خانہ میں نہا رہے تھے، شیخ فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ کو خدمت کا موقعہ میسر آیا، چند ڈول پانی سے بھر کر غسل خانہ میں ڈال دیئے۔ حضرت شیخ نہا کر باہر آئے، نماز پڑھائی تو پوچھا کہ پانی کس نے ڈالا تھا، یہ گھبرا گئے کہ کہیں گستاخی پر محمول نہ ہو، بار بار پوچھنے پر سامنے حاضر ہوگئے، حضرت شیخ خوش ہوئے اور فرمایا۔

”اے بوعلی جو میں نے ستر سال کی محنت سے پایا تو نے ایک ڈول سے ہی حاصل کرلیا“۔

پھر فرمایا کہ میں یہیں تک راہنمائی کرسکتا تھا اس سے اوپر میری پرواز نہیں ہے، جاؤ کسی اور راہبر کی تلاش کرو، یہ ارشاد کس قدر ہمت افزاء تھا اور یہ بھی کہ شیخ اپنی حدوں کو جانتے تھے اور عطاء کی کیفیات سے روشناس تھے، حضرت شیخ فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ اس صحبت سے بڑے فیض یاب ہوئے تھے اب مزید تلاش شروع ہوئی

طوس گئے اور حضرت شیخ ابوالقاسم گورگانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، سابقہ محنت وریاضت کا ذکر کیا، خوش ہوئے کہ ابتداء اچھی تھی، اگرچہ ابھی کوئی مقام بلند حاصل نہ ہوا تھا مگر فرمایا تربیت پاؤ گے تو بڑے درجے پالو گے۔ بس پھر حضرت فارمیدی وہیں کے ہو رہے۔ جناب شیخ نے خوش ہو کر اپنی بیٹی بھی نکاح میں دے دی، طریقت کے حوالے سے دو سلسلوں سے انتساب ہوا۔ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت ابوالقاسم گورگانی رحمۃ اللہ علیہ سے اگرچہ حضرت ابوالقاسم گورگانی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت رکھتے تھے مگر اُن کی دوسری نسبت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھی۔

حضرت شیخ فارمیدی رحمۃ اللہ علیہ کو آخرکار حضرت شیخ گورگانی رحمۃ اللہ علیہ نے خود برتر سلوک کے لئے حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا تھا جہاں آپ بام عروج تک پہنچے اور ایک مستند مسند ارشاد کے بانی بنے۔ 4 ربیع الاول 477ھ کو طوس میں انتقال فرمایا، وہیں پر مزار ہے جو زیارت گاہ خاص و عام ہے، تاریخ ولادت کے اختلاف کی وجہ سے عمر میں اختلاف ہے، 434ھ کو درست مانا جائے تو عمر صرف تنتالیس سال ہے مگر فیض بے اندازہ ہے۔

9۔ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ

(م 535 یا 536ھ)

حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ۔ 440 ہجری میں ہمدان کے نواح میں ایک بستی بوزنجر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی ماہ و سال اپنے علاقے ہی میں گزارے پھر اُس دور کی روایت علم کے مطابق 18 سال کی عمر میں بغداد آ گئے، بغداد اُن دونوں مرکزِ علم و عرفان تھا چنانچہ علماء بغداد کے دروازوں پر حاضر ہونے لگے وہاں کے مشہور فقیہ ابواسحاق شیرازی کے درس میں حاضر ہوئے، اُس دور کے عمومی تقاضے کے پیشِ نظر فقہ اور اصول فقہ میں مہارت حاصل کی، بغداد میں جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور عالم اسلام کے ماہر اساتذہ وہاں موجود تھے۔ وہاں ہی آپ نے قاضی ابوالحسنین محمد بن علی بن مہتدی باللہ رحمۃ اللہ علیہ ابوالغنائم بن علی بن مامون رحمۃ اللہ علیہ اور ابوجعفر محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ سے سماعِ حدیث کیا۔ پھر مزید ثروتِ علم کے لئے اصفہان، خراسان، سمرقند اور بخارا کے نامور اساتذہ سے علم حدیث میں مہارت حاصل کی اور علمی دنیا میں بہت ناموری کمائی، مرو کے قیام کو پسند کیا اگرچہ کئی بار ہرات بھی گئے اسی دور کے اکابر صوفیاء سے بھی رابطہ رہا کہ یہ وہ دور تھا جب علم فقہ اور علم تصوف میں قرب کی راہیں تلاش کی جا رہی تھیں، یہ دور اس قدر خوش قسمت تھا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے بھائی شیخ احمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی سطوت اور صوفیانہ کرامت کا ہر کہیں ذکر ہو رہا تھا، انہیں کی کاوشوں سے ان کے درمیان پیدا ہونے والا بعد ختم ہوا اور مسلک تصوف کی اصلاح ہوئی، یہی

دور تھا جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ بغداد کی فضاؤں میں مثل نورِ یقین درخشندہ تھے، اسی دور میں حضرت شیخ ابونجیب سہروردی ؒ کے کمال کا شہرہ تھا تو اسی عہد میں شیخ احمد الرفاعی ؒ کے متبعین کی دھوم تھی، غرضیکہ تصوف کا ایک جہان آباد تھا اور صفائے باطن کے مراکز عام تھے۔

حضرت یوسف ہمدانی ؒ بھی اسی دور کے قمر انوار تھے، ابتداء ہی سے راہ سلوک کے شناور تھے، اصفہان کے قیام کے دوران ہی حضرت عبداللہ جوینی نیشاپوری ؒ اور حضرت شیخ حسن سمنانی ؒ سے کسبِ فیض کر چکے تھے بلکہ خرقۂ خلافت بھی پہن چکے تھے، بغداد میں مروجہ علوم سے فارغ ہوئے تو پھر صوفیانہ مشرب کی طرف راغب ہوئے، زہد و ریاضت میں انہماک بڑھا حتّٰی کہ خراسان کے نواح میں کوہ زر میں کافی عرصہ مقیم رہے اور تحنث کی منزلیں طے کرتے رہے، کہا جاتا ہے کہ سوائے نمازِ جمعہ کے اس عزلت کدے سے باہر نہ آتے۔

حضرت یوسف ہمدانی ؒ کو آخر وہ مقام مل گیا جس کی آپ تلاش میں تھے اُن دنوں حضرت شیخ ابوعلی فارمیدی ؒ کا نام صوفیاء کے حلقہ میں بہت نمایاں تھا اس لئے اُن کے دربار میں حاضر ہوئے، تربیت کی ابتدائی منزلیں تو طے کر چکے تھے جلد ہی حضرت فارمیدی ؒ کی نگاہ انتخاب میں آگئے اور خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ پھر تو فیض کا چشمہ زلال پوری شدت سے بہنے لگا اور طالبانِ حق کی ایک جماعت اُن کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہوگئی اور متعدد صاحبانِ علم و معرفت نوازے جانے لگے، ان میں چار کے نام تو بقائے دوام کے حامل ٹھہرے یعنی حضرت عبدالخالق غجدوانی ؒ حضرت خواجہ احمد یسوی ؒ جو یسویہ سلسلہ تصوف کے امام

وبانی قرار پائے، حضرت خواجہ احمد اندانی ؒ اور حضرت خواجہ عبداللہ برقی ؒ سب سے فیض کے چشمے پھوٹے، نقشبندیہ سلسلہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی ؒ سے جاری رہا۔

یہ بھی ایک مستند روایت ہے کہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی ؒ کے وصایا کی شرح میں درج ہے کہ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی ؒ براہ راست حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی ؒ سے فیض یاب تھے، اس انتساب کے قدرے تفاوت کے باوجود یہ متحقق ہے کہ اسی سلسلے میں نسبت سلوک رہی اور اسی میں معروف ہوئے، حضرت شیخ ؒ کی ذات میں فقہی استقامت اور روحانی معرفت کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ باید و شاید، آپ کا مسلک حنفی فقہ سے تقویت پاتا رہا اور تمام عمر امام ابوحنیفہ ؒ کے فرامین کی روشنی میں شریعت سے مسائل کا استخراج کرتے رہے، فقہ سے یہ لگن نقشبندیت کا ہمیشہ سے امتیاز رہا کہ ان کے ہاں تصوف فقہ سے دوری کا نام نہ تھا بلکہ شریعت پر استقامت کا ذریعہ تھا، یہی وجہ ہے کہ نقشبندیوں کے ہاں اتباعِ رسالت کا ذوق فراواں رہا مجاہدے اور مکاشفے بھی پابندِ آداب رہے۔

حضرت خواجہ یوسف ہمدانی ؒ کی مسندِ ارشاد تقریباً ساٹھ سال پوری آب و تاب سے بچھی رہی، مرو اور ہرات کے درمیان متعدد سفر کئے، شاید وہ دونوں مراکز کو ارادت کے حصار میں رکھنا چاہتے تھے، آخر ایک سفر کے دوران میں ہی مرد اور ہرات کے درمیان بامتین کے مقام پر واصل حق ہوگئے، وہیں دفن کر دیا گیا، کچھ عرصہ بعد ایک عقیدت مند ابن النجار آپ کے جسد مبارک کو وہاں سے نکال لایا اور مرو میں دفن کر دیا مرو میں آپ کا مزار آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ شیخ یوسف ہمدانی ؒ نے 535۔536 میں 95 سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور ایک

جہان کو وابستہ داماں بنا کر رخصت ہوئے۔

حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تصنیف بزرگ تھے جن میں زبدۃ الجماعت، منازل السائرین، اور منازل السالکین کا تذکرہ علامہ جامی رحمۃ اللہ علیہ نے نفحات الانس میں کیا ہے۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک یادگار ملاقات کا ذکر بھی ملتا ہے اور وہ ہے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح حصولِ علم کی تلاش میں 18 سال کی عمر میں بغداد آئے تھے، حضرت شیخ عمر میں چھوٹے تھے، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا پتہ چلا تو ملاقات کے لئے آئے، دوران گفتگو حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وعظ کیا کریں کہ آپ میں اس کی صلاحیت ہے فرمانے لگے، عجمی ہوں بغداد کے فصحاء کے سامنے کیسے وعظ کہوں، فرمایا، فقہ، اصول فقہ، لغت، قرآن وحدیث کا علم تو ہے تو پھر انکار کیوں، میں تو آپ میں وہ دیکھ رہا ہوں جس کی شاخین زمین میں بھی ہیں اور آسمان تک بلند بھی ہیں، یہ تائید تھی اور تحریک تھی جس نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو وعظ کہنے کی ترغیب دی، پھر تو یہ وعظ بغداد کی مجلسی زندگی کا حصہ بن گئے اور ہفتہ میں چار دن جاری رہنے لگے۔

حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ بیان عالمانہ اور محققانہ ہوتا تھا سامعین پر آپ کے کلمات کا گہرا اثر ہوتا تھا مگر غیر ضروری سوالات پر کبھی کبھی جلال بھی آجاتا تھا، پھر لفظ یوں ادا ہوتے جیسے تقدیر کے فیصلے لکھے جا رہے ہوں، اسی قسم کا ایک واقعہ 515ھ کو جامعہ نظامیہ میں پیش آیا کہ حضرت وعظ فرما رہے تھے کہ ایک فقیہ جس کا نام ابن سقا تھا کسی بات پر معترض ہوا، جلال میں آکر فرمایا بیٹھ جاؤ مجھے

تیرے کلمات سے کفر کی بو آ رہی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ ایک عیسائی سفیر جو دربارِ خلیفہ میں آیا تھا سے مانوس ہوگیا اور واپسی پر ساتھ ہی چلا گیا اور وہاں جا کر عیسائی ہوگیا، کسی نے اُسے قسطنطنیہ میں دیکھا تو پوچھا کہ کیا قرآن یاد ہے، کہنے لگا صرف یہ آیت کہ۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝٢ (سورۃ الحجر: 2)

’’بعید نہیں کہ کفر کرنے والے خواہش کریں کہ کاش وہ مسلمان ہوتے‘‘۔

اہل سلوک سے اس قدر آگاہ تھے کہ اُن کے مراتب کا تعین فرما دیتے تھے، یہ اُن کی اس حوالے سے بالغ نظری تھی ایک مرتبہ ایک درویش آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ شیخ احمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے آیا ہے۔ آپ درویشوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اسی دوران محویت طاری ہوگئی پھر فرمایا کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ تشریف لائے ہیں اور ایک لقمہ میرے منہ میں رکھا ہے، حضرت خواجہ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تبصرہ فرمایا کہ یہ خیالات ایسے ہیں کہ ان سے بچوں کو طریقے کی تربیت دی جاتی ہے یعنی یہ ابھی منزل تک رسائی نہیں، ابھی تربیت درکار ہے۔ حضرت کے بہت سے ارشادات مساکین کے راہنما اصول ہیں ان میں ایک ہے۔

’’تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحبت رکھو، اگر یہ میسر نہ آئے تو اُس شخص کے ساتھ صحبت رکھو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحبت رکھتا ہے‘‘۔

ہر سالک طریقت کے لئے اس نصیحت پر عمل پیرا رہنا ہی کامیابی ہے۔

10۔ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ

(م 575ھ)

حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ کے وہ نامور بزرگ ہیں جن سے اکثر نقشبندی صوفیاء کے اوراد و وظائف منسوب ہیں، ایک راہنما وجود جن کے ترتیب دیئے ہوئے راستے کو کامیابی کا نشان سمجھا گیا آپ سے اوپر جتنے بھی اکابر اسی سلسلے کے حوالے سے شمار ہوتے ہیں وہ سلسلہ کے ذہبیہ حصّہ کے ارکان ہیں کہ سب راہ سلوک کے شناور اور امت کے راہنما تھے۔ آپ سے سلسلہ کی باقاعدہ تربیت کا آغاز ہوا کہ اب توجہ سالکین کی تربیت پر رہی، یہ اس لئے ہوا کہ وہ سنہری دور گزر چکا تھا جس کی فضاؤں میں پاکیزگی اور طہارت بھی تھی اور نیک اعمال کی آسودگی بھی تھی۔ اب دور انحطاط تھا اس لئے خصوصی توجہ اور مشق کا تقاضا کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ یہ دور تربیہ کہلایا۔ اور آپ سے خواجہ نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ تک سات ارکانِ سلسلہ کو دورِ تربیت کا نمائندہ سمجھا گیا اور عمومی طور پر یہ بزرگ ہفت خواجگانِ نقشبند کہلائے۔ اس مرکزی اہمیت کی وجہ سے آپ کا ذکر تاریخ تصوف میں بڑا نمایاں ہے۔

حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کا وطن قدیم بلادِ روم تھا نہایت عزت کا حامل خاندان تھا والد گرامی شیخ عبدالجلیل یا بعض روایات میں عبدالجمیل رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے یہی وجہ ہے کہ علم و دانش میں برتری کا امتیاز رکھتے تھے۔ والدہ گرامی قدر شاہ روم کی اولاد سے تھیں اس طرح

آپ کو نجیب الطرفین ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بلادروم ہی میں رہتے تھے مگر حالات کی ناسازگاری ان کو ماوراء النہر کے علاقے میں لے آئی وہاں بخارا کے قریب غجدوان میں رہائش کرلی، اسی مقام پر حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے تاریخ پیدائش 22 شعبان المعظم 425ھ روایت ہوئی ہے۔ والد گرامی سلوک کی کئی منازل طے کر چکے تھے اور نسبت باطنی کا اعلیٰ شرف رکھتے تھے، روایت ہے کہ اتنے دروں بین تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے رابطے میں رہتے تھے جو رجال الغیب کے سرتاج اور استقامتِ روحانی کے تاجدار تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے بچے کی بشارت دی اور نہایت شفقت سے عبدالخالق نام بھی تجویز کردیا، والد گرامی کو نومولود کی خصوصی حیثیت کا اعتراف تھا اس لئے ہمہ جہت تربیت کا اہتمام کیا، نامور اساتذہ کے مدارس میں بھیجا ہونہار تھے اور علمی وجاہت کا ایک وقار شروع سے ہی رکھتے تھے، اپنے اُس دور کے استاد تفسیر مولانا صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے درس تفسیر لے رہے تھے کہ اس آیت پر ٹھہر گئے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

(الاعراف:55)

"پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور رازداری سے، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

استاد سے پوچھنے لگے کہ رازداری اور خفیہ طور پر پکارنے کا طریقہ کیا ہے، کیونکہ اگر بلند آواز سے ذکر کیا جائے گا تو آواز اور حرکات لوگوں کو معلوم ہوجائیں گی اور اگر دل میں رازداری سے پکارا جائے تو بھی شیطان تو جان لے گا کہ حدیث

مبارک میں وضاحت ہے کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، پھر خفیہ کیسے پکارا جائے گا، استاد اس حکمت آمیز سوال تک رسائی نہ پا سکا اور کہنے لگا کہ یہ علم ظاہر نہیں ہے علم باطن ہے یعنی علم لدنی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو تمہیں کوئی ایسا اہل اللہ مل جائے گا جو اس کا جواب دے، یہ تحریک تھی کسی اہل اللہ کو تلاش کرنے کی، چنانچہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ ہمہ وقت ایسے اہل اللہ کی تلاش میں لگ گئے۔طلب صادق تھی اور قدرت کا بھی فیصلہ تھا جو جلد صادر ہو گیا۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ ایک جمعہ کے روز اپنے باغ کے دروازے پر اسی انتظار میں تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف لے آئے، نہایت پیار سے پوچھا کہ کوئی راہنما پایا ہے یا ابھی جستجو میں ہو، عرض کیا کسی راہنما کی تلاش میں ہوں، فرمایا تو میں تجھے اپنی فرزندی میں لے لیتا ہوں اور تمہیں ایک سبق بتاتا ہوں جس سے سب راز کھل جائیں گے، عرض کیا، بتایئے، بتایا گیا کہ حوض میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکالو، آپ نے اس پر عمل کیا اور مسلسل کرتے رہے یہانتک کہ سارے راز کھل گئے، یہ روحانی راہنمائی تھی، اسی میں مستغرق رہے حتّٰی کہ حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ بخارا تشریف لے آئے تو اُن کے ہاں حاضری شروع ہو گئی، جب تک اُن کا قیام بخارا میں رہا، یہ حاضریاں قائم رہیں اس سے روحانی طور پر فیض یاب ہوتے رہے اور انہیں کے حلقہ ارادت میں آ گئے، کہا گیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام آپ کے مرشد سبق تھے جبکہ حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ مرشد صحبت تھے، یہ تعلق عمر بھر قائم رہا، یہ تغیر ضرور آیا کہ حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر بالجبر کا اپنا طریقہ نافذ نہ کیا اور

حضرت عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت خضر علیہ السلام کے سکھائے ہوئے ذکر خفی پر ہی مداومت کی اجازت دے دی، یہ سلسلہ نقشبندیہ میں ایک بہت بڑا تغیر تھا کہ حضرت عبدالخلق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر خفی نقشبندیوں کا امتیاز بن گیا، جب حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ بخارا سے ہمدان لوٹ گئے تو اس وقت آپ کی عمر بائیس سال تھی۔تربیت کا دورانیہ بھی مختصر رہا مگر حضرت یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ جو آتش فروزاں کر گئے تھے وہ مسلسل لو دیتی رہی، حضرت عبدالخالق غجداونی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ایک مرکز اصلاح و تربیت کی حیثیت سے قائم رہی اور ان گنت لوگوں نے یہاں سے فیض پایا۔

یہ خانقاہ مسلسل مرکزِ تربیت کی حیثیت سے سرگرم عمل رہی یہانتک صاحبِ خانقاہ کا واصل باللہ ہونے کا وقت آ گیا، متوسلین کی موجودگی میں آنکھ کھولی اور فرمایا، خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر راضی ہے اور اُس نے اپنی رضا کی بشارت دی ہے، سب احباب آب دیدہ ہو گئے کہ فراق کے لمحات کا یقین ہو گیا تھا۔اس پر فرمایا: تم بھی خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو اس طریقہ پر تاحیات استقامت اختیار کرے گا، اُس پر بھی رحمت ہوگی اور وہ بھی بخش دیا جائے گا، یہ فرمانا تھا کہ نفس مطمئنہ رحمت حق سے واصل ہو گیا۔12 ربیع الاول 575ھ میں غجدان میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔مرقد ہر صاحب ارادت کے لئے زیارت گاہ ہے۔

حضرت کی نگاہ اس قدر باریک بین تھی کہ آپ کے سامنے کوئی ملمع سازی نہیں کر سکتا تھا، آپ کی مومنانہ فراست سب کچھ بھانپ لیتی تھی۔روایت ہے کہ ایک جوان درویشانہ لباس میں حاضر ہوا۔جائے نماز کندھے پر تھا اور کوئی صاحب سجادہ لگتا تھا، خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا، آپ کی حقیقت شناس نظر نے اُسے دیکھ

لیا مگر خاموش رہے، تھوڑی دیر کے بعد وہ جوان اٹھا اور حضرت شیخ کو ایک حدیث سنانے لگا، حدیث تھی کہ

اِتَّقُوا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ۔ 1

''مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے''

کہنے لگا اس کا مطلب کیا ہے۔ فرمایا مطلب یہ ہے کہ زنار توڑ ڈالو۔ اس نے زنار کے پہناوے سے انکار کیا تو آپ نے اپنے ایک خادم سے کیا اس کے کپڑے اتارو، کپڑے اُترے تو زنار موجود تھی، بس پھر کیا تھا سرنگوں ہو گیا اور ایمان لے آیا اس پر آپ نے حاضرین کو خطاب کیا کہ ہم بھی زنار پہنے ہوئے ہیں، ظاہری نہ سہی، باطنی ہی سہی، غرور تکبر اور خود پسندی کی زنار، آیئے ہم سب بھی اپنا وجود پاک کر لیں اور انا و غرور کی زنار اتار پھینکیں تا کہ سب بخشے جائیں۔

آپ نے بہت سے لوگوں کو راہ سلوک پر مستقیم کیا، عقائد میں اضطراب کو دور کیا اور عمل پر مداومت کا ذوق پیدا کیا، آپ کا سلسلہ طریقت مختلف حوالوں سے جاری رہا، چار خلفاء نے شہرتِ عام پائی، جن میں آپ کے صاحبزادے حضرت خواجہ اولیاء کبیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ احمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی مسند کے اصل وارث حضرت خواجہ عارف ریوگیری رحمۃ اللہ علیہ بہت نمایاں ہوئے۔

حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ مسلک نقشبندیت کے وہ گہر تابدار ہیں جس نے اس سلسلہ کو حدود و قیود سے منضبط کیا۔ نقشبندی خصائل اور معمولات کا اجراء آپ سے ہی ہوا، ذکر خفی آپ کی وہ اصطلاح تھی جو بعد میں نقشبندیوں کا امتیاز قرار پائی۔ سالکین راہ طریقت کو اگر نقشبندی طریق سلوک پر چلنا ہے تو آپ کی

عطا کردہ اصطلاحات کو پیش نظر رکھنا چاہیے وہ اصطلاحات یہ ہیں۔

1. ہوش در دم
2. نظر بر قدم
3. سفر در وطن
4. خلوت در انجمن
5. یاد کرد
6. باز گشت
7. نگاہ داشت
8. یادداشت

ان کے بعد حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ان پر تین کا اضافہ فرمایا وہ یہ ہیں

1. وقوف زمانی
2. وقوفِ عددی
3. وقوفِ قلبی

ان اصطلاحات کی وضاحت نقشبندیہ سلسلہ کے تعارف میں درج کر دی گئی ہیں جو ابتداء میں درج ہے۔ ان اصطلاحات کا دوام حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کی عبقریت پر دلالت کرتا ہے اور آپ کے مقام کا تعین کرتا ہے جو آپ کو سلسلہ نقشبندیہ میں حاصل ہے۔

وصیت نامہ:

حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے اور خلیفہ خواجہ اولیاء کبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وصیت فرمائی جو ہر سالک طریقت کے لئے راہنمائی کا سامان ہے وصیت تو طویل ہے صرف چند اہم نکات درج کئے جارہے ہیں۔ فرمایا اے فرزند میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ

☆ تقوٰی کو اپنا شعار بناؤ، وظائف وعبادات کی پابندی رکھو اور اپنے حالات کی نگہبانی کرتے رہو۔

☆ جاہل صوفیوں سے دور رہو کیونکہ یہ دین کے چور اور مسلمانوں کے راہزن ہیں۔

تم پر لازم ہے کہ مذہب حق اہل سنت وجماعت کے پابند رہو اور ائمہ سلف کے مسلک کو اختیار کئے رہو۔

☆ حق تعالیٰ کی جلالت سے ڈرتے رہو اور مت بھولو کہ ایک روز تمہیں میدانِ حساب میں کھڑے ہونا ہے۔

☆ علم فقہ کی طلب سے ایک قدم بھی دور نہ رہو اور حدیث کا علم حاصل کرو۔

☆ دنیا میں دوروٹی پر قناعت کرو، حلال کھاؤ کیونکہ حلال نیکی کی کنجی ہے حرام سے بچو ورنہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاؤ گے۔

☆ لوگوں کے ساتھ حسنِ خلق سے رہو، تم پر لازم ہے کہ ہر حالت میں ادب سے رہو۔

☆ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو اور اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

☆ قہقہہ مار کر نہ ہنسو کیونکہ قہقہہ غفلت کے سبب ہوتا ہے اور دل کو مردہ کردیتا ہے۔

☆ بخل اور حسد سے بچ کر رہو کیونکہ بخل اور حسد قیامت کے روز دوزخ میں جائیں گے۔

☆ غیر ضروری باتوں سے زبان بند رکھو لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔

☆ کم کھاؤ، جب تک کھانے کی شدید خواہش نہ ہو مت کھاؤ۔ جب تک کلام کی ضرورت نہ ہو مت بولو۔

اسی طرح اپنے صاحبزادے کو بھلائی کا راستہ بتاتے رہے۔ یہ درحقیقت اولاد کو ہی نصیحت نہ تھی، تمام مسلمانوں کو تھی کہ یہ زندگی سنوارنے کے سنہری اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر سالک کو ان نصائح پر عمل کی توفیق دے آمین۔

حوالہ جات

1 جامع الترمذی کتاب التفسیر۔ سورہ الفجر

11۔ حضرت خواجہ عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ

(م 616ھ)

حضرت خواجہ عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ۔ 557ھ میں ریوگر میں پیدا ہوئے جو بخارا سے 18 میل اور غجدوان سے 3 میل کے فاصلے پر تھا، ترک نسل سے تھے اور ترکوں میں عظیم صوفی تھے، ہوش سنبھالتے ہی حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے، سکونت کا قرب تھا اس لئے ہر وقت حاضر دربار رہے جب تک شیخ زندہ رہے آپ اُن کے پاس ہی رہے اس طرح بہت فیض پایا۔ شیخ کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے اور سلسلہ کی تقویت کا باعث بنے۔

صاحب تصنیف بزرگ تھے ایک رسالہ جس کا نام "عارف نامہ" ہے تصنیف فرمایا، خوش قسمتی سے اس کا ایک نسخہ خانقاہ موسیٰ زئی (ڈیرہ اسماعیل خان) میں اب تک موجود ہے۔ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاسداری کا بڑا انہماک تھا۔

مشہور روایت کے مطابق آپ کا سن وفات 616ھ ہے اگرچہ سفینۃ الاولیاء کی روایت کے مطابق سال وفات 715ھ ہے۔ مزار ریوگر میں ہے اور مشہور زیارت گاہ ہے۔ یاد رہے کہ یہ دور بڑے دلولے کا تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے مومنانہ قوت سے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا اور یورپ کی مجموعی قوت کے ساتھ لشکر کشی کو پسپا کر دیا تھا اس لحاظ سے یہ دور احیائے قوت کا دور تھا۔

12۔ حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی رحمۃ اللہ علیہ

(م 717ھ)

حضرت محمود انجیر فغنوی رحمۃ اللہ علیہ۔ 18 شوال 627ھ میں انجیر فغنہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بخارا کے ایک گاؤں وابکنہ کے قریب ہے یہ مقام بخارا سے تقریباً تیس کلومیٹر ہے۔ ایسے دور میں پیدا ہوئے جبکہ عالم اسلام چنگیزی حملوں کی زد میں تھا اور بے سکونی کا دور دورہ تھا مگر دوسری طرف برصغیر جو منگول حملوں سے سلطان التمش کی ماہرانہ تدبیر کی بنا پر محفوظ تھا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیضان سے سیراب ہو رہا تھا۔ مضطرب ماحول کے باوجود حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ نے درسیات کے تمام علوم پڑھے، عالم دین بنے مگر اس کو ذریعہ معاش نہ بنایا بلکہ گل کاری کو معاش کا ذریعہ بنائے رکھا۔ شعور آیا تو حضرت خواجہ عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور مسلسل کئی سال اُن کی خانقاہ میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہ عارف ریوگری رحمۃ اللہ علیہ نے دم آخر آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ اس لئے آپ تمام متوسلین کے مقتدا بن گئے وابکنہ ہی میں قیام رہا اور وہیں 17 ربیع اولال 717ھ میں وفات پائی۔

حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ ذکر بالجہر کے قائل تھے جو نقشبندیوں کے ہاں مروج نہ تھا اس لئے اسی دور کے ایک فاضل عالم مولانا حافظ الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو خواجہ پارسا رحمۃ اللہ علیہ کے جداعلیٰ تھے نے رئیس العلماء حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں ذکر

بالجبر کے بارے میں سوال کیا، جواب تھا کہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد سے اس کی اجازت لے لی تھی، پوچھا گیا کہ یہ کس نیت سے کرتے ہیں تو جواب تھا اس لئے تاکہ سویا ہوا بیدار ہو جائے، غافل آگاہ ہو جائے اور شریعت و طریقت پر استقامت کر کے اس راہ پر آجائے کہ حقیقی توبہ و انابت کی توفیق مل جائے۔ کہا گیا کہ نیت تو درست مگر اس کی حد مقرر کر دیں تو فرمایا، یہ اُس کے لئے جائز ہے جس کی زبان جھوٹ اور غیبت سے پاک ہو، حلق حرام اور شبہ کے لقمہ سے محفوظ ہو، دل ریا سے منزہ ہو اور ذہن ماسوا اللہ کے خیال سے پاک ہو۔

حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین حضرت خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ ہوئے جنہوں نے باطنی اشارہ پا کر تعلق قائم کیا تھا۔ جو ساری عمر قائم رہا، وابکنہ میں آپ کا مزار اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

13۔ حضرت خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ

(م 715ھ)

حضرت خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ 585ھ میں رامیتن قصبہ میں پیدا ہوئے جو بخارا سے قریب تھا۔ نساج یعنی کپڑا بننے کا کاروبار کرتے تھے جس کا ذکر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک شعر میں کیا ہے۔ شعر یوں ہے۔

گر نہ علم حال فوقِ قال بودے کے شدے
بندہ اعیانِ بخارا خواجہ نساج را

یعنی اگر علم حال، قال سے بہتر نہ ہوتا تو بخارا کے سرکردہ لوگ خواجہ نساج کے غلام کب بنتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو یہ احساس تھا کہ ایک کپڑا بننے والا، شہر کے اکابر کا امام کیسے بنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آپ اہل حال تھے اور اہل حال اہل قال کے امام ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ حضرت علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ کا صاحب حال ہونا معروف تھا اسی لئے اصحابِ طریقت کے ہاں آپ کی عظمت کا احساس موجود تھا روایت ہے کہ حضرت شیخ علاؤ الدین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ جو خود ایک مقامِ بلند کے مالک تھے کہ وہ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں بھی تھے اور مرشد بھی، فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ سے تین سوالوں کا جواب چاہا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ وہ مریدوں کو ان سے زیادہ عمدہ کھانا کھلاتے ہیں مگر وہ لوگ آپ کی تعریف کرتے ہیں اور میری

شکایت۔ آخر وجہ کیا ہے حضرت علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔

''احسان جتا کر خدمت کرنے والے بہت ہیں مگر احسان مند ہو کر خدمت کرنے والے تھوڑے ہیں''۔

دوسرا سوال تھا کہ سنا ہے کہ آپ کی روحانی تربیت حضرت خضر علیہ السلام نے کی ہے اس کا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا۔

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عاشق ہوتے ہیں حضرت خضر علیہ السلام ان لوگوں کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی تربیت کرتے اور ان کو راستہ دکھاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ آپ ذکر بالجہر کیوں کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ ذکر خفی کرتے ہیں پس آپ کا بھی ذکر جہر ہو گیا، کیونکہ اس کی اطلاع ہم تک پہنچی اور ذکر جہر وہی ہے۔ جسے دوسرا جان لے''۔1

حضرت علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ کی عمومی عادت تھی کہ گفتگو میں جب کبھی اپنا حوالہ دیتے تو عزیزاں کہہ کر دیتے اس طرح یہ کلمہ عام ہو گیا اور صوفیاء کرام نے اسے آپ کا پسندیدہ حوالہ سمجھا اور حضرت عزیزاں کہنے لگے، اگرچہ اہل خوارزم آپ کو ''خواجہ علی وردی'' اور اہل بخارا شیخ علی رامیتنی'' کے نام سے پکارتے تھے آپ رامیتن سے جہاں آپ 585ھ کو پیدا ہوئے تھے، باورد تشریف لے آئے تھے، یہاں کافی عرصہ قیام رہا، عام شہرہ بھی ہوا اور بہت لوگ ارادت مندی کی دولت سے سرافراز ہوئے، حضرت خواجہ محمود انجیر فغنوی رحمۃ اللہ علیہ کا وقتِ وصال قریب آیا تو آپ نے خواجہ علی رامیتنی کو شرفِ خلافت عطا فرما دیا اور فرمایا۔

''اے علی جو کچھ میرے سینے میں تھا میں نے تجھے عطا کر دیا''

باورد میں ایک عرصہ قیام رہا پھر برضائے الٰہی خوارزم آ گئے اور ساری عمر خوارزم ہی میں گزاری، یہاں ہر وقت دادخواہوں کا ہجوم رہتا، اک جہان آپ سے فیض یاب ہوا۔ عمر بھی طویل پائی اور کرم بخشی کا سلسلہ بھی طویل رہا ایک سو تیس سال کی عمر میں خوارزم ہی میں 715ھ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے، مزار پر لوگوں کا ہجوم ہر وقت دست بدعا رہتا ہے، مزار مبارک لاکھوں انسانوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔

آپ کی طبیعت میں اصلاحِ احوال کے جذبوں کے ساتھ خدمتِ خلق کا جذبہ بھی بڑا توانا تھا روایت ہے کہ خوارزم میں آپ کا معمول تھا کہ ہر صبح اُن مزدوروں میں سے جو محنت کی تلاش میں قطار در قطار کھڑے ہوتے تھے، دو کا انتخاب کر لیتے، گھر لا کر انہیں فرماتے کہ تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ وضو کر لو اور عبادت میں مشغول ہو جاؤ، عصر تک ہمارے ہاں اسی معمول پر رہو، عصر کے بعد اپنی مزدوری لے لینا اور چلے جانا، مزدور بہت خوش ہوئے کہ محنت بھی نہیں کرنا پڑ رہی، نیکی کے کام میں بھی شامل رہتے ہیں اور معاوضہ بھی پورا ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر مزدور اس خواہش میں رہتا کہ حضرت اُسے لے جائیں ایک، قرب کا سماں پیدا ہوا اور مانوسیت بڑھی اس طرح ایک حلقہ پیدا ہو گیا اور عقیدت مندوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ یہ مقبولیت امیر شہر کو پسند نہ آئی کہ اُس کے نزدیک ایک شخص کا مرجع خلائق بن جانا مناسب نہ تھا، حکم دے دیا کہ شہر چھوڑ دو آپ نے خوارزم میں داخلے کے وقت تحریری اجازت نامہ حاصل کیا تھا وہ امیر کی خدمت میں بھیج دیا کہ اس کے باوجود عہد شکنی روا ہے تو ہم شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ امیر بھی اُس دور کا تھا جس میں اخلاقیات کا آج کل کی طرح زوال نہ آیا تھا اس لئے خاموش ہو گیا اور آپ اپنی اصلاحی روش پر کاربند رہے۔

حضرت علی رامیتنی ؒ صاحب علم وحکمت بزرگ تھے ایک تحریر بھی ملتی ہے جو ''رسالہ عزیزاں'' کے نام سے معروف ہے، عمومی گفتگو سے بھی علمی سطوت کا اظہار ہوتا ہے۔ شعر کا بھی ذوق رکھتے تھے چند رباعیات ملتی ہیں جن سے قدرت شعر کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت کے بہت سے ارشادات روایت ہوئے ہیں جو علم ومعرفت پر آپ کی دسترس کے شاہد ہیں مثلاً۔

آپ کے صاحبزادے خواجہ ابراہیم ؒ نے پوچھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فقیر خدا کا محتاج نہیں ہے۔ اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا۔ ایسا نہیں ساری کائنات ہی اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے مگر فقیر اس قدر راضی برضا ہوتا ہے کہ اپنی چاہت کے لئے سوال نہیں کرتا کہ وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور وہ حاجات پوری کردیتا ہے۔

صاحبزادے خواجہ ابراہیم ؒ نے عرض کیا کہ منصور ؒ نے انا الحق کہا اور حضرت بایزید بسطامی ؒ نے کہا۔ لَيْسَ فِي جُبَّتِي سِوَى اللهِ دونوں قول شریعت کے خلاف تھے مگر منصور کو سولی چڑھا دیا گیا اور حضرت بایزید ؒ کو کچھ نہ کہا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ فرمایا دونوں میں بہت فرق ہے۔ منصور ؒ نے انا کہا کہ اپنی ہستی کا اثبات کیا مگر حضرت بایزید ؒ نے لیس کہا کہ نفی ذات کی، یہ الگ بات کہ اگر منصور ؒ کے دور میں خواجہ عبدالخالق غجدوانی ؒ کا کوئی فرزند یا نمائندہ موجود ہوتا تو منصور سولی سے بچ جاتا۔

آپ کے صاحبزادے نے سوال کیا کہ بعض احادیث میں بظاہر تناقض لگتا ہے اسے رفع فرمادیں۔ مثلاً حدیث ہے الفقر سواد الوجہ فی الدارین (فقر دونوں جہانوں میں روسیاہی ہے) یا یہ کہ كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا۔ (قریب ہے کہ فقر

کفر بن جائے۔ اور دوسری طرف حدیث ہے۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِي (فقر میرے لئے فخر ہے) ان میں تطابق کیونکر ممکن ہے تو رمز آشنا حضرت نے فرمایا کہ اگر فقیر جس کے ہاتھ میں اگرچہ کچھ نہیں ہے مگر وہ دل میں طلب رکھتا ہو تو وہ گدا ہے وہ گدائے محلہ ہے نہ کہ متبع رسول ﷺ مگر وہ فقیر جس کے ہاتھ میں اگرچہ کچھ نہیں ہے مگر وہ پانے کی حرص بھی نہیں پالتا تو وہ لائق عظمت ہے۔ گداگری اور حقیقی فقر میں یہی فرق ہے اسی طرف علامہ اقبال مرحوم نے اشارہ کیا تھا۔

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

شیخ فخر الدین نوری ؒ نے پوچھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا سوال کیا تھا تو جواب آیا۔ بَلٰی، لیکن جب پروردگار لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کا سوال کرے گا تو کوئی جواب نہ آئے گا آخر خود ہی پروردگار جواب دے گا اس کی حکمت کیا ہے۔ جواب بڑا حکیمانہ اور مسکت تھا۔ فرمایا

روزِ ازل قوانین وضع کرنے کا دن تھا اور جواب کا متقاضی تھا اس لئے جواب آیا مگر روز حشر حقیقتِ حال کے اظہار کا دن ہوگا اس لئے اس میں گفتار نہیں ہے۔

یہ سوال وجواب حضرت رامیتنی ؒ کے رسوخِ علم کے بھی شاہد ہیں اور دقتِ نظر کی بھی دلیل ہیں۔

✲ پوچھا گیا کہ آپ ذکر بالجہر کس نیت سے کرتے ہیں فرمایا۔ یہ مسلمہ ہے

کہ آخر وقت بلند آواز سے ذکر اور تلقین کرنی چاہیے کہ حدیث مبارک ہے کہ اپنے مردوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو۔ تو ہم درویشوں کا ہر دم، دم آخر ہی ہوتا ہے۔

✲ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کسی سے کہے کہ مجھ سے جو چاہو مانگو تو مناسب یہی ہے کہ بندہ اپنے رب سے اُس کے سوا کسی اور چیز کا مطالبہ نہ کرے یہی بندگی کا کمال ہے۔

✲ فرمایا کہ اگر تو اگلی صف میں بیٹھے مگر پچھلی صف والوں کے مقابلے میں خود کو ہیچ سمجھے تو یہ بہتر ہے۔ کہ تو پچھلی صف میں بیٹھے اور اگلی صف والوں کو اپنے آپ سے ہیچ خیال کرے۔

✲ فرمایا بندہ رب تو نہیں ہوسکتا مگر رب کی صفات سے متصف تو ہوسکتا ہے۔

اسی طرح کے بعض اور ارشادات بھی روایت ہوئے ہیں۔

ان فرمودات سے حضرت علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا علم ظاہری کس قدر پختہ اور لائق اعتماد تھا اور علم باطن کی راز داری کا معیار کس قدر بلند تھا۔ ایسے ہی بزرگ حق رکھتے ہیں کہ قوم کی راہنمائی فرمائیں، فراست ایمانی اور علم روحانی آپ کی ہر گفتگو سے ہویدا تھا، باخبری کا یہ عالم تھا کہ جب وقت رخصت قریب آیا تو عطائے مسند کا مرحلہ درپیش ہوا۔ دو صاحبزادے تھے ایک خواجہ محمد جسے خواجہ خورد کہا جاتا تھا کہ لوگ آپ کو خواجہ بزرگ کہتے تھے دوسرے بیٹے کا نام خواجہ ابراہیم تھا، اجازتِ خلافت دینے لگے تو خواجہ ابراہیم کو یہ منزلت عطا کردی حالانکہ یہ چھوٹے تھے مریدوں کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ آخر چھوٹے کا انتخاب کیوں ہوا۔ آپ تک بات پہنچی تو فرمایا۔ خواجہ خورد ہمارے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہ

سکیں گے اس لئے خواجہ ابراہیم کو یہ منصب تفویض کردیا گیا۔ یہ کوئی پسند ناپسند کا معاملہ نہ تھا۔ لوگوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا کہ آپ کی وفات سے صرف انیس دن بعد خواجہ خورد رحمۃ اللہ علیہ بھی انتقال کر گئے اور لائقِ احترام والد گرامی کے قول کی صداقت عیاں ہوگئی۔ [2]

الغرض حضرت شیخ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ ایک طویل عرصہ رشد وہدایت کا نشان بنے رہے، اک جہان نے آپ سے فیض پایا اور اب تک پا رہا ہے۔ اس قدر بلند مرتبت تھے کہ ایک شخص معاندانہ جذبوں کے ساتھ حاضر ہوا اور آپ کے کپڑا بننے کے کاروبار کے حوالے سے طعنہ زن ہوا کہ آپ تو بازاری ہیں، ذرا ملال نہ آیا۔ فرمایا زاری تو ہماری عادت ہے اس لئے بازاری یعنی زاری کے ساتھ ہیں۔ بازاری بھی اس طرح کے تھے کہتے ہیں بازار جاتے، خرید وفروخت کا ماحول دیکھتے اور اگر کسی محنت کش کا مال پڑا ہوتا اور کوئی خریدار نہ ہوتا تو خرید لیتے اور محنت کش کو مایوس نہ جانے دیتے۔

اللہ اللہ ایسے بزرگ ہی تھے جن سے نظام اصلاح قائم رہا

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

حوالہ جات

1 انوار لاثانی کامل ص:256

2 حوالہ مذکورہ ص:257

14۔ حضرت خواجہ محمد سماسی رحمۃ اللہ علیہ
(م 755ھ)

حضرت خواجہ محمد سماسی رحمۃ اللہ علیہ ہفت خواجگان میں نہایت بلند مرتبہ کے حامل بزرگ تھے۔ قصبہ سماس میں پیدا ہوئے۔ سماس رامتین سے ایک کوس یعنی تین میل کے فاصلے پر ہے اگرچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب انتباہ فی سلاسل اولیاء میں سماس کو طوس یعنی مشہد کے مضافات میں بتایا ہے مگر حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کے زندگی کے حالات بخارا کے نواح سے ہی زیادہ تر متعلق ہیں اس لئے یہی روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ آپ سماس میں 25 رجب 591ھ میں پیدا ہوئے، شروع سے ہی استغراق کے عالم میں رہتے تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک چھوٹا سا باغ تھا وہاں انگور توڑنے لگتے کہ محو استغراق ہو جاتے، کئی بار بحال ہوتے اور کئی بار مستغرق، اس طرح ایک خوشہ توڑنے ہی میں بہت وقت لگ جاتا، جوانی چڑھ ہی رہے تھے کہ حضرت خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں آگئے، وہاں فیوضات باطنی سے ایسے نوازے گئے کہ خلیفہ قرار پائے، مدت تک خدمت میں رہے اور نوازشات سے سرفراز ہوئے۔

ایک مرتبہ اپنے مرید اور خلیفہ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ لئے کوشک ہندواں سے گزر رہے تھے کہ فرمایا یہاں سے خوشبو آرہی ہے یہ مقام ضرور نوازا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تھے کوشک ہندواں کی طرف توجہ فرمائی اور ارشاد ہوا کہ آج وہ خوشبو پہلے سے بڑھ کر آرہی ہے، واقعہ یہ

تھا کہ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ تین روز پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد نومولود کو لے کر حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی، فرمایا یہ تو ہمارا فرزند ہے یہ وہی مرد باصفا ہوگا جس کی خوشبو آرہی تھی، یہ فرمایا اور اپنے خلیفہ اعظم سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نصیحت کی، میرے فرزند بہاؤالدین کے حق میں شفقت وتربیت سے ہرگز کوتاہی نہ کرنا، یہاںتک فرمایا کہ اگر کوتاہی کرو گے تو میں معاف نہیں کروں گا۔ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے سینے پر ہاتھ رکھا اور عرض کیا اگر کوتاہی کروں گا تو میں مرد نہیں۔ پھر ایسا رابطہ قائم ہوا کہ نسبت کو دوام حاصل ہوا۔

حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میری عمر 18 سال کی عمر ہوئی اور شادی کا سوچا جانے لگا تو میرے جد امجد مجھے حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لے گئے تاکہ برکت کی دعا کرائیں، فرماتے ہیں جب حاضر ہوئے تو مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور سجدے میں یہ دعا مانگی۔

"اے اللہ اپنی بلاؤں کے اٹھانے کی طاقت عطا فرما اور اپنی محبت کی محنت برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما"۔ صبح ہوئی تو حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نصیحت فرماتے ہوئے فرمایا۔ اے بیٹے دعا یوں کرنا چاہیے کہ۔

اے اللہ جو تیری مرضی ہو اس پر قائم رہنے کی اس بندہ ضعیف کو اپنے فضل وکرم سے توفیق عطا فرما، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ بندہ بلاؤں سے محفوظ رہے ہاں یہ دعا کرتے رہو کہ اگر کوئی مصیبت آتی ہے۔ تو اُس کو برداشت کرنے کی ہمت دے، بلا کو طلب کرنا مناسب نہیں اس لئے گستاخی نہ کرنا چاہیے۔[1]

حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ سے کئی کرامات منسوب ہیں مگر یاد رہے کہ آپ کی سب سے بڑی کرامت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی پیش گوئی اور اہتمام تربیت ہے کہ اس سے نقشبندیت کو شناخت ملی ہے۔

آپ کی تربیت سے بہت سے صلحاء امت نے شرف پایا ہے جن میں آپ کے فرزند خواجہ محمود سماسی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ محمد صوفی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ دانشمند رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے خلیفہ اعظم حضرت سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ بڑے نمایاں ہیں۔

حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ نے 10 جمادی الاخریٰ 755ھ کو وفات پائی، طویل عمر پائی اور صوفیاء کرام میں اہم مقام کے حقدار ٹھہرے۔

حوالہ جات

1 انوار لاثانی کامل ص: 261-262

15۔ حضرت خواجہ شمس الدین سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ

(م 772ھ)

حضرت سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ خاندان سادات میں سے ہیں مگر ذریعہ معاش کوزہ گری تھا اس لئے کلال مشہور ہوئے۔ سوفار کے رہنے والے تھے جو قصبہ سماس سے تقریباً پانچ کوس یعنی پندرہ میل دور ہے اور بخارا کے ساتھ ہے۔ سوفار ہی میں 676ھ کو پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ سادات میں ہونے کی وجہ سے لائق احترام بھی تھے اور نیک نام بھی، شجرہ نسب امام علی موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ جوانی میں کشتی لڑنے کا شوق تھا اور اس سلسلے میں قرب و جوار میں جاتے تھے اور اکھاڑوں میں اُترتے تھے، اسی عادت کے موافق ایک مرتبہ رامتین میں بھی آئے کشتی ہو رہی تھی کہ حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ یہ نظارہ بھلا لگا تو ایک دیوار کے سایے میں ٹھہر گئے اور دیکھنے لگے۔ خدام نے عرض کیا کہ ان بدعتیوں کی طرف متوجہ ہونے کا کیا سبب ہے۔ فرمایا کہ اس شکارگاہ میں ایک ایسا شکار ہے کہ کاملین بھی اس کی صحبت سے فیض یاب ہوں گے اس لئے کہ اس کی پرواز نہایت بلند و بالا ہے، ہم تو اسی کے منتظر ہیں کہ وہ ہمارے جال میں آ جائے یہ جس سلسلے میں داخل ہوگا اُس کی تقویت کا باعث بنے گا اسی اثنا میں سید کلال رحمۃ اللہ علیہ کی نظر حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی تو اپنی قوتِ جاذبہ سے اسیر کر لیا، کشتی کا خیر باد کہا اور بابا جی رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے اُن کے دولت خانہ میں آ گئے پس ایک نظر زندگی کا رُخ بدل گئی اور سلسلہ نقشبندیہ میں آ گئے۔

دنگل وغیرہ چھوٹے اور ریاضت ومجاہدے میں محو ہوگئے ،عطاء بھی مائل کرم تھی اور وصول کنندہ بھی حقدار تھا اس لئے لمحوں میں نسبت مستحکم ہوگئی اور بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کا دربار ہی مقصودِ حیات قرار پایا۔

اس انقلاب کے بعد تقریباً تیس سال تک باباجی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کے ہوگئے دونوں گاؤں کا فاصلہ پانچ کوس تھا۔ مغرب پڑھ کر چلتے اور عشاء آکر باباجی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سماس میں پڑھتے اور رات کے بعد واپس لوٹ جاتے پیر اور جمعرات دونوں دن یہی معمول رہا اور ایک عرصہ اس پر مداومت رہی، فیوض وبرکات سے وہ حصہ پایا کہ تمام خلفاء میں ممتاز ہوگئے زہد وتقویٰ کا معیار اس قدر بلند تھا کہ ساتھی بھی حیران تھے ایک روز رامتین میں تھے کپڑے دھوئے تو ان کے خشک کرنے کا مرحلہ آیا۔ باڑ پر نہ ڈالے کہ کہیں ٹیڑھی نہ ہوجائے شاخوں پر نہ ڈالے کہ کہیں نقصان نہ ہوجائے، گھاس پر نہ پھیلائے کہ کہیں چارے کو نقصان نہ ہوجائے ،مرید پریشان ہوگئے اور پوچھنے لگے آپ کپڑے خشک کیسے کرتے ہیں فرمایا کمر پر ڈال کر کمر کو سورج کی جانب کرلیتا ہوں یہ سب احتیاط اس لئے ہے کہ کسی کی ملکیت میں نقصان نہ ہوجائے اس پر نصیحت بھی فرمائی کہ راہ پروردگار کسی پر اُس وقت تک نہیں کھلتا جب تک وہ انسان تقویٰ شعار نہ ہوجائے۔

امیر تیمور کے ساتھ معاملہ:

امیر تیمور اُس دور کا طاقت ور حکمران تھا جس کا دبدبہ ہر جانب کو محیط تھا سمرقند اُس کا دارالحکومت تھا اپنی بے پناہ قوت کے باوجود اصحاب طریقت سے

عقیدت رکھتا تھا [illegible]رت سید کلال رحمۃ اللہ علیہ کو ملنے کا متمنی ہوا ،قاصد بھیجا کہ شرفِ ملاقات بخشیں ،ور سمرقند تشریف لائیں آپ نے حاضری سے معذرت چاہی اور اپنے صاحبزادے امیر عمر رحمۃ اللہ علیہ کو نیابت کے لئے بھیج دیا مگر یہ تاکید کردی کہ امیر تیمور سے کوئی ہدیہ کوئی جاگیر یا کوئی تحفہ قبول نہیں کرنا ہے تاکیداً فرمایا کہ اگر ایسا کروگے تو واپس میرے پاس نہ آنا کہ تم اپنے جدامجد حضرت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے مرتکب ہوگے۔ ان ہدایات کی روشنی میں صاحبزادے امیر تیمور کے ہاں گئے کچھ روز وہاں قیام رہا۔ واپس آنے لگے تو امیر تیمور نے کہا میں سارا بخارا آپ کی نذر کرتا ہوں آپ نے معذرت چاہی تو کہنے لگا اگر سارا نہیں تو کچھ حصہ قبول کرلیجئے مگر پھر بھی معذرت تھی کہنے لگا آخر کیا پیش کروں کہ مجھے قرب کی دولت نصیب ہوجائے فرمایا تقویٰ اختیار کرو، عدل کی عادت اپناؤ۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے بندوں کے قرب کا بس یہی طریقہ ہے۔

آپ کے تذکرہ نگاروں نے کئی کرامات کا بھی ذکر کیا ہے جس میں کعبۃ اللہ کا سامنے آجانا شیر کا سر جھکالینا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جو ناممکنات میں سے نہیں ہیں کہ جس مردِ درویش کی گردن اپنے پروردگار کے سامنے سرنگوں رہے تو تمام مظاہر اور تمام درندے اُس کے سامنے جھکے رہتے ہیں بقول شیخ سوری رحمۃ اللہ علیہ۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

حضرت سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کا فیض دور ونزدیک اس وسعت سے پھیلا کہ ایک سو چودہ خلفاء کے نام ملتے ہیں جو مملکت کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے اور

سلسلہ نقشبندیہ کی اشاعت کا کام کیا کرتے تھے۔ آپ کے چاروں صاحبزادے جن کے نام امیر برہان الدین، امیر سید حمزہ، سید امیر شاہ اور سید امیر عمر علیہم السلام تھے ترویج طریقت اور اصلاح خلق کے مشن میں اپنے گرامی قدر والد محترم کے نائب تھے۔

آپ زندگی بھر صاحبزادوں اور متبعین کو اپنے قیمتی نصائح سے نوازتے رہے مگر جب محسوس کیا کہ وقت آخر آیا ہی چاہتا ہے تو سب کو اکٹھا کیا اور وصیتیں فرمائیں ان وصایا میں ہر طرح کی راہنمائی مہیا کی چند ایک اس طرح سے ہیں۔

☼ جب تک زندہ رہو، طلب علم سے ایک قدم دور نہ ہونا کیونکہ طلب علم تمام مسلمانوں پر فرض ہے پھر علوم کی ایک فہرست بھی بیان فرمائی۔

☼ جان لو کہ جس طرح کپڑے کو پانی پاک کرتا ہے اسی طرح زبان کو اللہ تعالیٰ کا ذکر پاک کرتا ہے، تمہارے جسم کو نماز، تمہارے مال کو زکوٰۃ اور تمہاری راہ کو حق داروں کی رضامندی اور تمہارے دین کو شرک سے بچنا پاک کرتا ہے۔

☼ توبہ کرتے رہو کیونکہ توبہ تمام بندگیوں کا سر ہے توبہ یہ نہیں کہ زبان سے کہو کہ میں توبہ کرتا ہوں بلکہ توبہ یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں سے پشیمان ہو اور نیت کرو کہ آئندہ اس گناہ کی طرف نہ جاؤ گے۔

☼ روزی کا غم اپنے دل سے نکال دو، آخرت اور ادائے بندگی کے غم کو اپنے دل میں جگہ دو۔

ہر حال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بجالاؤ، ہمیشہ دل میں غیر شرعی امور اور بدعت سے بچتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ

"اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے بچاؤ جس کا

ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔"

پر غور کرتے رہو تا کہ قیامت کے روز درماندہ نہ ہو۔

☼ ظاہر میں روزہ یہ ہے کہ صبح سے شام تک کھاتے پیتے اور جنسی تعلقات سے رُکے رہو، لیکن اصل روزہ یہ ہے کہ کان کو حرام سننے ہاتھ کو حرام پکڑنے اور پاؤں کو حرام کی طرف چلنے سے روکو، یہ روزہ ہے۔

☼ زکوٰۃ ادا کرنے اور اس کی حدود کی نگہداشت کی کوشش کرو کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، اُس کی نماز، حج بھی قبول نہیں ہوتا۔

☼ علماء حق کی خدمت میں رہو کیونکہ وہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چراغ ہیں۔

☼ جاہلوں کی صحبت سے دور رہو، دنیاداروں کی صحبت اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔

☼ رخصت سے بچو اور عزیمت پر عمل کرو، رخصت پر عمل کرنا کمزوروں کا کام ہے۔

اسی طرح کئی اور وصیتیں ارشاد فرمائیں، تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کا حق ادا کرتے ہوئے 8 جمادی الاولیٰ 772ھ بروز جمعرات بوقت صبح صادق وصال فرمایا اور سوفار ہی میں دفن ہوئے اور اپنے پیچھے نقشبندیوں کے سربراہ اور نقشبندیت کی شناخت حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کو امورِ ہدایت سپرد کر کے راہی ملک عدم ہوئے۔

16۔ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ
(م791ھ)

حضرت خواجہ بہاؤالدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ دنیائے تصوف کے وہ گل سر سبد ہیں کہ جس کی مہک نے نقشبندیت کے سارے چمن کو مہکا دیا ہے۔ آپ کے وجود نے علم باطن کے وہ عقدے حل کئے ہیں کہ جو صرف خواص کے ہاں، ہی موضوع بحث تھے اور عام مسلمان ان کو اپنی دسترس سے باہر سمجھتا تھا پھر ایک ولولہ تازہ پیدا ہوا۔ تصوف ہر مجلس میں زیر بحث آیا اور اس کی برکات ہر کہیں عیاں ہونے لگیں اس عمومی پھیلاؤ سے ہر صاحب دل کو حوصلہ ملا کہ علم و معرفت کی طرف پیش قدمی کرے مگر حیرت اس پر ہے کہ عوام تک رسائی کے باوجود اس کا وقار پہلے سے بھی زیادہ ہوا۔ آپ کی راہنمائی نے تصوف کو دینی علوم کا حصہ بنا دیا اور خانقاہیں جو عزلت خانے سمجھی جاتی تھیں علم دین کے مراکز بن گئیں، آپ کی خداداد شخصیت کے اثرات اس قدر ہمہ جہت تھے کہ سلسلہ ہی آپ کے وجود سے شناخت پانے لگا، نقشبندیت کا نقش آپ کا ہی فیضان تھا اور یہ فیضان مرور ایام پر اس طرح محیط ہوا کہ شریعت کے سایوں میں پلنے والا صوفیاء کا گروہ ہمیشہ کے لئے نقشبندی ہو گیا، ہر سالک در عطاء پر حاضر ہوتے ہی پکارنے لگا کہ

اے نقشبند عالم نقش مرا بیند
نقشم چنان بیند کہ گویند نقشبند

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند خاندانِ سادات کے ہونہار فرزند تھے، سلسلہ نسب حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے بخارا کے مردم خیز علاقے سے تعلق تھا اور قصر ہندواں میں پیدا ہوئے تھے جو آپ کی نسبت سے قصر عارفان بن گیا، قصر عارفان بخارا کے مضافات میں ہے۔ اسی قصر میں آپ 4 محرم 718 کو ایک نیک نام گھرانے میں پیدا ہوئے جو تاجک نسبت رکھتا تھا۔ والد گرامی کا نام بھی محمد تھا۔ جب آپ اُن کے گھر پیدا ہوئے تو سعادت مندی کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ ان آثار کی تائید حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے ہوگئی کہ ابھی تین سال کے تھے کہ حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فرزندی میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اسی لئے کہ آپ تو قبل از ولادت ہی خوش خبری سنا چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آثارِ مجدہ شرف بچپن میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ حضرت بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ نے مستقبل کے مرشدِ عظیم کو اپنے مرید حضرت سید کلال رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا تھا اور تاکید فرمائی تھی کہ تربیت میں کوتاہی نہ ہو، مرید نے اپنے پیر کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھا اور تربیت کے تمام مراحل میں خصوصی شفقت سے نوازا جوانی کے ابتدائی ایام تھے کہ طبیعت خلوت پسندی کی طرف مائل ہوگئی، رات کے خاموش لمحات واصلین کے مزارات پر گزارنے کا شوق بہت فراواں تھا، ایک رات اسی شوق کی تکمیل کرنے کی ٹھانی اور تین مزارات پر حاضری دی۔ یہ مزارات مرد درویش جو دنیا سے بے نیازی پر پختہ یقین رکھتے تھے یعنی حضرت خواجہ محمد واسع رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ محمود انجبر فغنوی رحمۃ اللہ علیہ جو مشائخ نقشبند کے اہم فرد تھے۔ اور خواجہ مزدا آخن رحمۃ اللہ علیہ کے تھے۔ ہر مزار پر ایک دیا جلتا ہوا دیکھا مگر حیرت اس پر تھی کہ بتی اور تیل کے باوجود لو مدھم تھی حضرت

خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بتی اونچی کی اور آخر قبلہ رو ہو کر وہاں بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں دیکھا کہ ایک سبز پردہ لٹک رہا ہے اُس کے پیچھے ایک تخت بچھا ہے اور اُس تخت کے اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ کو پہچان لیا، ایک حاضر شخص اٹھا اور موجودین کا تعارف کرانے لگا، کہا یہ احمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ خواجہ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور یہ خواجہ بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ بزرگ ایک جگہ اکھٹے ہیں مگر وہ بزرگ کون ہیں جو تخت پر ہیں تعارف کرایا گیا کہ یہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو سب کے سردار ہیں، یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ سب بزرگ کسی خاص مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مقصد تو صاف تھا کہ یہ سب خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ پر مجموعی شفقت فرمانے کے لئے آئے ہیں۔ سارے سلسلے کا فیض عنایت ہو رہا تھا۔ اسی حیرت میں تھے کہ کسی نے آواز دی کہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کچھ ارشادات فرمانے والے ہیں یقیناً یہ شرف تھا کہ سب کی موجودگی میں ایک طالبِ صادق کو نوازا جا رہا ہے۔ پردہ اٹھا تو سالکِ راہ نے بڑھ کر سلام پیش کیا۔ حضرت خواجہ غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ دیئے جلتے ہوئے تم نے دیکھ لئے ہیں ان مدھم بتیوں کو بلند کرنا اب تمہارے ذمے ہے کہ تم اس کی استعداد رکھتے ہو۔ مگر نصیحت فرمائی کہ ہر حال میں جادہ شریعت پر ثابت قدم رہنا ہے۔ سنت پر عمل پیرا رہنا ہے اور بدعت سے بچنا ہے۔ بس یہ لازم پکڑو کہ ہر وقت سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تلاش میں سرگرم رہنا ہے۔ ان ہدایات کے ساتھ حکم دیا کہ سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کی راہنمائی میں سب مدارج طے کرنے ہیں بالفاظ دیگر آپ کو سید کلال رحمۃ اللہ علیہ کی پناہ میں دے دیا۔

یہ مکاشفہ جو نیم باز آنکھوں سے راہنما بنا تھا زندگی بھر کے لئے پیغام تھا کہ اپنے اسلاف کے طریقوں کی روشنی میں آگے بڑھنا ہے اور مسلسل یہ کوشش کرنا ہے کہ اسلاف کی تعلیمات زندہ رہیں بلکہ ان میں اضافہ ہو، پھر یہ بھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کو پیشِ نظر رکھنا ہے۔ غور کیا جائے تو سلسلہ نقشبندیہ کا یہی پیغام اُس وقت بھی راہنما تھا اور آج بھی ہے تصوف کو سنت کے سایوں میں اپنی تگ ودو کو زندہ رکھنا ہے اور یہ بھی کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر تصوف کا کوئی مقام نہیں ہے۔ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کو یہی تلقین کی گئی تھی اور آپ کا آئندہ کا طرزِ عمل اسی کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ نے ان ارشادات کو حرز جان بنایا، علماء کی صحبت اختیار کرتے رہے اور احادیث واخبار پر پوری توجہ دیتے رہے اسی طرح علم فقہ اور علم تصوف کا باہم ربط پیدا ہو گیا جو نقشبندیوں کی شناخت ہے۔

حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے استقامت کے ساتھ حضرت امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ سے کسبِ فیض کیا مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اکابر مشائخ کی نظر ہمیشہ ہی آپ پر رہی۔ خواجہ بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ تو بچپن سے بلکہ اس سے قبل دعاؤں سے نواز رہے تھے لیکن سلسلہ کے روح رواں حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ بھی آپ پر ہی تھی۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ تمام اکابر کی توجہ کا مرکز تھے۔ اور وہ اپنے نمائندے کے طور پر ان کی تربیت پر توجہ فرما رہے تھے۔ اسی روحانی فیض کی کثرت کے باوجود حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ ظاہری رابطوں اور حسی فیوض سے بھی غافل نہ تھے۔ اسی لئے مختلف آستانوں پر حاضر ہوتے رہے، تصوف کی معراج، ہی انکسار ہے جس کا آپ نے ہمہ وقت اظہار فرمایا۔ اگرچہ حضرت امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ نے

اپنے مرشد کی وصیت پر حرف بحرف عمل کیا اور اپنی طرف سے پوری توجہ کے ساتھ تربیت فرمائی مگر دیگر آستانوں پر حاضر ی ں نہ روکا کہ یہ انا کا مسئلہ نہ تھا، یہانتک کہ اُس کے دیگر اکا ر ں کی بھی نصیحت کی۔ حضرت خواجہ نقشبند ؒ نے بھی اس سلسلے میں کوئی کوتاہی نہ کی، جہاں شمع علم جلتی تھی وہیں پروانہ وار گئے اور جہاں روح کی دنیا آباد محسوس کی اُس در پر حاضر ہو گئے۔ اس طرح آپ کئی سال طلب علم، معرفت میں سرگرداں رہے مثلاً

حضرت شیخ عارف دیک کرانی ؒ جو حضرت سید کلال ؒ کے ہی فیض یافتہ تھے اور خلیفہ اعظم شمار ہوتے تھے، اُن کی خدمت میں سات سال گزارے اور روحانی ارتقاء کے کئی جلوے دیکھے۔

حضرت شیخ قثم ؒ جو حضرت خواجہ احمد یسوی ؒ کے خاندان سے صاحب عزیمت بزرگ تھے۔ آپ کے ہاں حضرت خواجہ ؒ چند ماہ رہے۔

حضرت سلطان خلیل اتا ؒ جو ایک نامور بزرگ تھے ماوراء النہر کے تاجدار تھے مگر درویشی میں فرق نہ آیا ان کے تربیت کدے میں حضرت خواجہ نقشبند ؒ تقریباً بارہ سال رہے۔ پہلے آستانے کے درویش بن کر اور جب حکومت ملی تو مصاحب بن کر، حکومت کے کاموں میں بھی معاون رہے مگر خلوت کی مجلس کے بھی ساتھی رہے۔

حضرت خواجہ نقشبند ؒ نے دو حج کئے، حج کے سفر جہاں فریضے کی ادائیگی کی خاطر تھے وہیں اس تلاش میں تھے کہ مردانِ باصفا سے ملاقات بھی ہو جائے چنانچہ پہلے حج سے لوٹ رہے تھے کہ امیر حسین والی ہرات کا ایک قاصد ملا اور عرض کیا

کہ امیر شرفِ ملاقات چاہتا ہے سو چا کہ حکم ہے۔

وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ (الضحیٰ: 10)

کہ جہاں تک سائل کا تعلق ہے تو اُسے نہ جھڑکو۔

چنانچہ ہرات چلے گئے، بادشاہ نے کچھ سوالات کئے جو معلومات کی افزائش کے لئے تھے مثلاً پوچھا کہ کیا یہ بزرگی آباء واجداد سے ورثے میں ملی ہے۔ جواب تھا نہیں۔

سوال تھا کہ کیا سماع کے قائل ہیں اور ذکر بالجہر کرتے ہیں جواب تھا نہیں کہ اُن کی نسبت حضرت عبدالخالق غجدوانی ؒ کے ساتھ ہے اور وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ یہ سوال اس لئے ہوا کہ حضرت محمود انجیر فغنوی ؒ سے ذکر بالجہر شروع ہو گیا تھا اور یہ ذکر بالجہر حضرت علی رامیتنی ؒ حضرت بابا سماسی ؒ اور حضرت سید کلال ؒ تک جاری رہا تھا مگر حضرت خواجہ نقشبند ؒ ذکر خفی کرتے تھے کہ آپ مرشد بزرگ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی ؒ کے طریقے کو پسند کرتے تھے مگر اپنے مرشد سید کلال ؒ کے احباب کی محفل ہیں کچھ نہ کہتے ہاں خود اٹھ جاتے جس پر شکایت بھی ہوئی مگر مرشد کریم اس رویے کو جانتے تھے اور اعتراض نہ کرتے تھے۔

بادشاہ نے سوال کیا کہ جب جذب کی ایسی محفلیں نہیں ہوتیں تو کیا ہوتا ہے۔ فرمایا

ہمارا طریقہ ہے۔ ظاھراً با خلق، باطناً با حق۔

کہنے لگا کہ ایسا ممکن ہے تو فرمایا اس پر تو نص موجود ہے۔ قرآن مجید

میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ۔

(النور:37)

''کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت اور خرید وفروخت انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے''۔

فرمایا خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت اسی لئے ہمارے اکابر نے راہنمائی کے بعض اصول وضع کئے ہیں پھر آپ نے وہی گیارہ اصول گنوائے جو نقشبندی طرز تصوف کی اصطلاحات کے طور پر درج کئے جاچکے ہیں، پھر ایک حکیمانہ بیان فرمایا کہ

جو حضور، ذکر بالجہر وسماع سے پیدا ہوتا ہے اس کو دوام نہیں مگر وقوف قلبی پر مداومت سے جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جذبے سے مقصود حاصل ہوجاتا ہے۔اسی طرح کئی اور سوالات بھی ہوئے۔ جب ان سب کے شافی جواب مل گئے تو بادشاہ مطمئن ہوگیا۔ اللہ اللہ صاحبانِ اقتدار بھی تربیت نفس کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ بعض کوتاہیوں کے باوجود معاشرتی زندگی میں حسنات کا غلبہ تھا۔اس اطمینان بخش سوال وجواب کے باوجود احتیاط کی حد یہ تھی کہ شاہ کے کھانے سے اجتناب کیا کہ اُس کی حلّت کا یقین نہ تھا۔اس سے اُن اصحابِ طریقت کو سبق لینا چاہیے جو درباری ضیافتوں کے فریفتہ ہیں۔

دوسری مرتبہ حج پر تشریف لے گئے تو واپسی پر مولانا زین الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے ہرات تشریف لے گئے مولانا زین الدین رحمۃ اللہ علیہ ہمہ جہت عالم

تھے اور نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے علوم ظاہریہ کے ساتھ علوم معرفت سے بھی بہرہ مند تھے۔ تین دن ہرات میں خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا قیام رہا۔ایک روز نماز فجر کے بعد باہم گفتگو ہوئی تو مولانا نے عرض کیا ''برائے ما ہم اے خواجہ نقشبند'' یعنی اے خواجہ ہمارا نقش بھی باندھ دیں۔ نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا۔ ''آمدیم تا نقش بریم''، یعنی ہم خود نقش بننے کے لئے آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہی خواہش نقشبند ہونے کا اعلان تھا۔اس گفتگو کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہوئیں اور ایک روحانی ملاقات کے بعد واپس آئے۔

سیر روحانی کا یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا۔اس میں کئی نازک مقام بھی آئے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے مقامات کی سیر کی اور آخر وہاں تک رسائی پائی جہاں سرخمیدہ حاضر ہونا ہر صاحب معرفت کی انتہائی تمنا ہوتی ہے یہ مقام متقاضی ہے کہ ادب کے تقاضے ملحوظ رکھے جائیں، فرماتے ہیں کہ وہاں میں نے سر تسلیم خم کیا اور ادب وہ روش اختیار کی جو اس مقام کا حق تھا۔اس سیر روحانی میں دو مرتبہ حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے مقام تک بھی پہنچے، فرماتے ہیں وہاں اُن کے دل میں بھی ویسے ہی کلمات کا گزر ہوا جو حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ سے سرزد ہوئے تھے، یہ کلمات سامنے آئے ہی تھے کہ فوراً منصبی احتیاط دامن گیر ہوئی کہ یہ سولی کا مقام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ ایسے کلمات کی ادائیگی سے محفوظ رہا۔ اس پر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ حقیقت حال کو واضح کرتا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ خواجگان سے کسب فیض کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو فنائی اللہ اور بقاباللہ سے مشرف ہوئے اسی مرتبہ ولایت سے مقام شہادت تک گئے، پھر وہاں سے مقام صدیقیت تک عروج فرمایا۔1

محویت کا یہ عالم اور ارتفاع منزلت کی یہ کیفیت اُن سجدوں کا نتیجہ تھی جو آپ مسلسل اپنی زندگی کا اصول بنا چکے تھے مثلاً یہ کہ

☼ تہجد کی بارہ رکعتیں چھ سجدوں کے ساتھ معمول تھا۔

☼ دعائیں مسلسل زبان پر رہتیں یہانتک کہ جب نماز فجر ادا کر لیتے اور واپس لوٹتے تو دعائیں منقطع نہ ہوتیں۔

☼ نماز اشرق بالاہتمام پڑھتے۔

☼ نماز چاشت بھی پوری پابندی اور مکمل انہماک سے ادا کرتے۔

☼ نماز مغرب کے چھ رکعات پڑھنا بھی معمول تھا۔

غرضیکہ ہر جاگتا لمحہ عبادت کے شعور سے بیدار رہتا اور جب آرام کا وقت بھی آتا تو لیٹتے اور اٹھتے وقت مقبول دعائیں ادا فرماتے رہتے۔ زندگی کا ہر ثانیہ عبادت شعار اور عبادت گزار تھا۔ کثرتِ عبادت نے عبدیت کی منزل واضح کر دی تھی اور جب بندہ اپنی عبدیت کا احساس مستحکم کر لیتا ہے تو عرفانِ معبود کی منزل آسان ہو جاتی ہے یہی ہوا کہ شعورذات نے اس قدر معرفت عطا کر دی کہ ہر سانس عبادت کی سلک مروارید میں پرو دیا گیا۔

معاشرتی معمولات:

عام تصور یہ ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ یادالٰہی میں مست ہو جاتا ہے تو دنیا ومافیھا سے غافل ہو جاتا ہے۔ عزلت نشینی معاشرتی ذمہ داریوں سے لاتعلق کر دیتی ہیں۔ اور رہبانیت کے سایے گرد وپیش منڈلانے لگتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہوتی ہے جو اصحاب طریقت کا امتحان بنتی ہے کہ ایک مومن صادق کو غاروں یا زاویوں کا ہو کر رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ تخلیق کے اولین لمحات ہی میں فرمادیا گیا کہ دنیا میں جاؤ وہاں تمہارے لئے مستقر بھی ہے اور زندگی بھر کے لئے متاعِ حیات بھی ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ دنیا سے بھی اپنا حصہ وصول کرو یہ نہ ہو کہ دنیا ساری کی ساری نافرمانوں کے لئے رہ جائے۔ حسناتِ دنیا کی دعا تو خود پروردگار نے سکھائی تھی اس لئے کامیاب درویش وہ ہے جو سربسجود بھی ہے اور سربکف بھی، جس کے عجز میں فطری انکساری ہے مگر زندہ رہنے کا حوصلہ بھی، حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ جو تاقیامت ایک سلسلہ ہدایت کے راہنما بننے والے تھے اور ایسا مشرب متحقق کرنے والے تھے جو شریعت کے سایوں میں رہے اور طریقت کے جادۂ اعتدال پر چلے اس لئے آپ کی اپنی زندگی بھی اسی توازن کی آئینہ دار تھی۔ عبادت کا انہماک حقوق اللہ کی ادائیگی کا ذوق، معاشرتی تقاضوں اور حقوق العباد کے فرائض کی نفی پر استوار نہ تھا۔ امتِ وسطیٰ کا یہ عظیم شیخ ایسی راہ متعین کر رہا تھا جو ہر طرح کے انحراف سے محفوظ ہو، یہی نقشبندیت کا سرمایہ ہے اور یہی مشائخ نقشبندیہ کے لئے راہنما اصول ہے۔

زندگی جہاں سے گزری حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ معاشرتی فرائض کا خاص

خیال رکھتے، خاص طور پر جب آخری ایام قصرِ عارفاں میں بسر ہوئے تو اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے۔ سب سے زیادہ توجہ اپنی خواہشات پر حدودِ شریعت کے نفاذ پر دیتے۔ رزقِ حلال کا بہت اہتمام کرتے حتّٰی کہ شبہات سے بھی پرہیز کرتے۔ اس حوالے سے حدیث رسول ﷺ کو اپنا راہنما بناتے۔

کہ ”عبادت کے دو اجزاء ہیں ان میں سے ایک تو حلال کی تلاش ہے اور ایک باقی ساری عبادات ہیں۔

حلال رزق بھی یوں کھایا جائے کہ ایک ایک لقمہ پر حضوری کا احساس ہو۔ دروں بینی کا جوہر اس قدر مجلیٰ تھا کہ اگر ایک بھی مہمان یا درویش کھاتے وقت سراپا نیاز نہ ہوتا تو پہچان جاتے اور بڑی حکمت سے نصیحت فرماتے، کھانے میں احساسِ شکر کا اس قدر خیال رکھتے کہ اگر کھانا پکاتے وقت کوئی باورچی یا پکانے والا سراپا رضا نہ ہوتا بادلِ نخواستہ پکاتا تو کھانا نہ کھاتے، فرماتے کہ کراہت سے پکے ہوئے کھانے میں برکت نہیں ہوتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کھانے میں کیسی خوشدلی اور احسان مندی کا عنصر شامل ہونا درکار تھا۔

ہدیہ قبول کر لینے میں سنت کی پاسداری تھی مگر ہدایا کی خواہش نہ تھی اور نہ ہی نذرانوں کی تمنا تھی اور جب کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو قبولیت کے ساتھ ہی اس کے بدلے میں کچھ پیش کر دینا ضروری سمجھتے تا کہ دل آزاری نہ ہو بلکہ دلداری ہو، مہمان کی عزت کرتے اُس کی سہولت کا بہت خیال کرتے، کھانا کم ہو تو اُس کے سامنے پیش کر دیتے، سردی سے بچاؤ کے لئے کپڑوں کی کمی ہوتی تو جو میسر آتا مہمان کے سامنے حاضر کر دیتے۔

قصرِ عارفاں درحقیقت معرفت کی تقسیم کا مرکز تھا۔ جو بھی آتا اُس کی

خدمت کرتے تا کہ یہ سہولت اُس کے دل کو نیکی کی طرف مائل کر دے، عام انسانوں کی خدمت آپ نے اپنے اوپر لازم کر رکھی تھی، چونکہ پیشہ زراعت تھا اس لئے کاشت کاری میں بھی احتیاط کرتے، جانوروں تک کو تکلیف نہ دیتے۔ یہی ذریعہ روزگار تھا جس سے اپنے گھر والوں کی اور احباب کی خدمت ہوتی۔ غرضیکہ ایک محتاط مگر مربوط نظام قصرِ عارفاں کا دستور تھا۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ گھر میں کوئی خادم نہ تھا۔ کوئی ذاتی مکان نہ تھا۔ چارپائی کا تکلف بھی نہ تھا۔ فرش پر سوتے تھے صرف ایک بوریا تھا جو بستر کا کام دیتا تھا۔ احباب پوچھتے تھے کہ اتنی حد سے بڑھی ہوئی درویشی کیوں تو بڑی خوشدلی سے جواب دیتے کہ بندگی اور خواجگی ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ یہ اندازِ زندگی مجبوری نہ تھا خود اختیار کردہ تھا کہ مزاج ہی ایسا پایا تھا۔ خواجہ عالم ﷺ کا طریق زندگی راہنما تھا مگر اس میں بھی ہمسری کا دعویٰ نہ تھا۔ عاجزانہ اتباع کا سلیقہ تھا۔ آپ کو رسول اکرم ﷺ کے معمولاتِ زندگی یاد تھے کہ

نعلین شکستہ ہے تو بوسیدہ قبا ہے
یہ بادشاہ سلطنت ہر دوسرا ہے
قاسم ہے مگر ٹکڑوں پہ کرتا ہے گزارا
سلطاں ہے مگر مجمعِ فقراء میں کھڑا ہے

بس یہ اُسوہ حضرت خواجہ نقشبند کی زندگی کا حاصل تھا۔

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اپنے سلسلے کے مجدد ہیں کہ آپ کی ہدایات کی روشنی میں سلسلہ نقشبندیہ کی تہذیب ہوئی، اصول وضع ہوئے اور ریاضت ومجاہدے کے طریق متعین ہوئے اس لئے آپ کے ارشادات وملفوظات ہر صاحب طریقہ کے لئے

راہنما اصول ہیں، یوں تو آپ کے ارشادات طریقِ زندگی کے ہر موڑ کے لئے دستیاب ہیں مگر صرف چند درج کئے جارہے ہیں تاکہ راہِ سلوک میں آسانیاں پیدا ہوں۔

اساسی اصول:

☼ طریقت ادب ہی ادب ہے۔ ادب کی کئی جہتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ کی نسبت سے ادب، رسول ﷺ کی ذات کے حوالے سے ادب، مشائخ کے حوالے سے ادب، یہ آداب اس طرح متحقق ہوتے ہیں۔

1 حق تعالیٰ کی نسبت سے ادب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں کمال بندگی کی شرط کے ساتھ اس کے احکام کی تعمیل کرے اور ماسواء سے بالکل منہ موڑ لے۔

2 رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ادب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہمہ تن متابعت اور پیروی کا پابند سمجھے اور آپ کو تمام موجودات اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ سمجھے جو کوئی ہے اور جو کچھ ہے سب کا سر آپ کے آستانِ عزت پر ہے۔

3 مشائخ کے ادب کی نسبت یہ خیال رہے کہ مشائخ کو جو مقام حاصل ہے وہ سنت رسول ﷺ کی پیروی کی وجہ سے ہے اس لئے اس نسبت کو ملحوظ رکھے۔

☼ نماز، روزہ اور ریاضت، مجاہدہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں مگر ساتھ ساتھ وجود کی نفی بھی لازم ہے کہ وجود ہی سب سے بڑا حجاب ہے۔

☼ پیر کی گاہے بگاہے زیارت جو حضورِ قلب کے ساتھ ہو ایسی زیارت سے کہیں بہتر ہے جو دائمی ہو مگر بلا حضور ہو۔

☼ اگر مقام ابدال تک پہنچنا ہے تو نفس کی مخالفت کرنا ہوگی۔

☼ یہ ضروری نہیں کہ جو دوڑے وہ گیند لے جائے مگر ملتی اُسی کو ہے جو دوڑتا ہے اس لئے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

☼ مجاز حقیقت کا پل ہے عبادات قولی ہوں یا فعلی سب مجاز ہیں سالک ان سے نہ گزرے تو حقیقت کو نہیں پاسکتا۔

☼ ذکر کی تعلیم کسی کامل سے ہونی چاہیے تاکہ موثر ہو اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو۔

☼ ہمارا روزہ ماسوئی کی نفی ہے اور ہماری نماز مقامِ مشاہدہ ہے۔

☼ سالکانِ طریقت دو طرح کے ہیں ایک وہ جو ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں اور اس کی ثمرات پاکر مقصود کو پہنچتے ہیں دوسرے وہ ہیں جو فضلی ہیں سوائے فضلِ الٰہ کے کچھ نہیں وہ تو عبادات بھی فضل ہی شمار کرتے ہیں۔ ہم تو فضلی ہیں کسی عبادت پر ناز نہیں

کرامات کے حوالے سے ارشادات:

کرامات بھی دنیائے تصوف کا ایک معروف حوالہ ہے۔ عام تاثر یہی ہے کہ کرامت ہی مرتبہ ولایت کی پہچان ہے اس لئے جب بھی کسی کی ولایت یا بزرگی کا تذکرہ ہوتا ہے تو کرامات کی ایک فہرست بیان کر دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کرامت ایک اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ کسی محبوب بندے کو عطا کرتا ہے یہ ایک منزلت ہے، جو خالق کے ہاں کسی نیک نام مخلوق کو حاصل ہوجاتی ہے یہ نہ شرطِ ولایت ہے اور نہ ولایت کی قوت دکھانے کا ذریعہ، سب سے بڑی منزلت جو مرد بزرگ کو حاصل ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ پروردگار اُسے اتباعِ شریعت کی بے پایاں توفیق عطا فرمادے بد قسمتی سے اس خارق عادت کو شرط ولایت سمجھ لیا گیا اور اس کا اظہار ہونے لگا، معجزہ یقیناً

اظہار کا متقاضی ہے کہ وہ ذات نبوت کو تسلیم کرانے کے لئے ہوتا ہے کہ وہ باب افعال سے ہے جس کی خصوصیت ہی تعدیہ ہے جبکہ کرامت تو کرم سے ہے جس کی خاصیت ہی لزوم ہے کرامت کے حوالے سے کئی غیر یقینی خیالات عام ہو رہے تھے اس لئے حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے اس حوالے سے صراحتہً گفتگو کی اور کرامت کا مقام متعین کیا۔ اس سلسلے میں متعدد ارشادات ہیں صرف وضاحت کے لئے دو تین کا حوالہ درج کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے کرامت کا مطالبہ کیا گیا تو جواباً فرمایا۔

’’ہماری کرامت تو سب پر ظاہر ہے کہ باوجود اتنے گناہوں کے زمین پر چلتے ہیں اس میں دھنس نہیں جاتے‘‘۔

غور فرمایئے کس حکمت سے ولایت کے حوالے سے کرامت کے مطالبے کو رد کیا۔ پھر اس بارے میں وضاحت فرمادی۔

✲ کرامات اور خوارق کے ظہور کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل چیز استقامت ہے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ

✲ طالبِ استقامت رہو نہ کہ طالب کرامت، اللہ تعالیٰ کو استقامت مطلوب ہے جبکہ تیرے نفس کو کرامت مقصود ہے۔

کس صراحت کے ساتھ اظہار کرامت کی خواہش کو نفس کا مقصود قرار دے دیا، یہاں تک فرمایا۔

✲ کہ اگر کوئی ولی کسی باغ میں جائے اور ہر درخت اور ہر پتے سے یا ولی کی آواز آئے تو اس پر التفات نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہر لحظہ بندگی و نیاز مندی میں کوشاں رہنا چاہیے۔

✲ کرامت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: کرامتوں کا کیا ذکر جو کچھ ہے کلمہ توحید کی حقیقت کے مقابلہ میں نفی ہے اصحاب کرامت سب کے سب محجوب ہیں اور عارف کرامت کی طرف نظر رکھنے سے دور رکھے جاتے ہیں پھر فرمایا

✲ مرید سے احوال کا ظاہر ہونا شیخ کی اصل کرامت ہے یعنی کرامت یہ ہے کہ مریدوں کی یوں تربیت کی جائے کہ اُن پر باطنی احوال طاری ہو جائیں اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ

✲ اولیاء کو اسرار کی اطلاع دی جاتی ہے مگر وہ بلا اجازت اس کا اظہار نہیں کرتے جو رکھتا ہے وہ چھپاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ چلاتا ہے۔

ان ارشادات سے حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بالکل عیاں ہو جاتا ہے اور یہی نقشبندیت کی شناخت ہے۔

سماع کے بارے میں فیصلہ:

سماع جو اکثر مسالک صوفیاء میں رائج ہے اگرچہ یہ اختلاف ضرور رہا کہ مزامیر سے مباح ہے یا نہیں مگر نقشبندی اسلوب تصوف میں سماع کا کوئی مقام نہیں ہے ہاں یہ رعایت ضرور رہی کہ مجوزین کے حوالے سے احتیاط کی گئی، حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی معمول تھا، چنانچہ روایت ہے کہ ایک بزرگ خواجہ مسافر خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ اکثر آپ کے ہاں آیا کرتے تھے اُن کا میلانِ طبع سماع کی جانب تھا۔ ایک روز احباب کے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اس کا عملی اظہار کیا جائے چنانچہ وہ قوالوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت کی محفل میں دف کے ساتھ سماع شروع کر دیا آپ مجلس میں بیٹھے رہے۔ منع بھی نہ کیا۔ محفل

برخاست ہوئی تو اس حوالے سے سوال ہوا تو جواب دیا۔

''نہ ایں کاری کنم نہ انکاری کنم''

''میں یہ کام تو کرتا نہیں اور نہ ہی اس کا انکار کرتا ہوں''

اس مسلک اعتدال کا رویہ نمایاں ہوا۔

نقشبندی طریقِ سلوک:

حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ طریقہ نقشبندیہ کے عملاً بانی ہیں اس پر انہیں اعتماد بھی تھا اور فخر بھی اس اعتماد کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''ہمارے خواجگان کی نسبت چار جہت سے ہے ایک حضرت خضر علیہ السلام سے دوسرے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے، تیسرے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی معرفت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے اور چوتھے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے۔''

حضرت نے نسبتِ صدیقی پر زیادہ اعتماد کیا اور اسی نسبت کی ترویج فرمائی مگر اس نسبت کے باوجود جو بنیاد بنائی وہ آپ کا وہ طریقہ تھا جسے آپ عروۃ الوثقٰی قرار دیتے ہیں یعنی وہ طریقہ جو اتباعِ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے اس لئے مزید فرماتے ہیں کہ اس طریقہ میں کچھ عمل زیادہ ہے مگر متابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرط ہے۔

کرامات:

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ ایک واصل باللہ شیخ تھے۔ ولایت کے تمام آثار آپ کی ذات سے ہویدا تھے۔ لازم ہے کہ ایسے باعمل شیخ کے ہر ہر

رویے سے ہدایت کا پیغام ملے اور سامعین پر اثر انداز ہونے کے لئے خوارق کا بھی ظہور ہو، روایات میں بہت سی کرامات کا ذکر ہے مگر ان سب روایات کو سچا ماننے کے باوجود درج نہیں کر رہے کہ حضرت کا کبھی بھی ان کے اظہار کا ارادہ نہیں ہوا۔ صرف ایک روایت درج کرتے ہیں تا کہ قارئین کو جلالتِ شان کا اندازہ ہو جائے۔

ایک دن خواجہ علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہاں حاضر تھے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا انہوں نے عرض کیا ابھی نہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا ذرا آسمان کی طرف تو دیکھو۔ انہوں نے ارشاد کی تعمیل کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں فرشتے نماز ظہر میں مشغول ہیں فرمایا تم تو کہتے ہو کہ وقت نہیں ہوا۔

اس روایت سے بصارت کی آسمانوں تک رسائی کا اظہار بھی ہوا اور دوسروں کی نظروں پر قوت کا بھی پتہ چلا، درویشی کا یہ اعلیٰ نمونہ تھا کہ آپ کی راہنمائی کا مرکز کہاں ہے اور اطاعت کے لئے نمونہ کہاں سے مہیا ہو رہا ہے۔

وفات:

حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات کا ذکر کرتے رہتے تھے اس دوران میں کہتے کہ جب وقتِ اخیر آیا تو سب کو مرنا سکھاؤں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وقتِ آخر آیا تو دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا لئے، دیر تک دعا مانگتے رہے حتّٰی کہ جب دعا ختم کی، چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے تو وصال بالحق ہو چکے تھے، 73 سال کی عمر پائی۔ 3 ربیع الاوّل 791ھ پیر کے روز انتقال فرمایا اور قصر عارفاں میں دفن ہوئے جہاں ایک عالیشان مزار اب زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ ''قصر عارفان'' سے تاریخ وفات

نکلتی ہے۔ وصیت فرمائی تھی کہ جنازے کے آگے یہ رباعی پڑھتے جانا۔

مفلسانیم آمدہ درکوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بردست و بربازوئے تو

دلیل العاشقین اور حیات نامہ آپ سے منسوب تحریری یادگار ہیں۔

خلفاء:

شاہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے فیض پانے والوں کا کوئی شمار نہیں، اپنے دور ہی میں مصدرِ فیض سمجھے گئے اور دور دور سے متلاشیانِ سلوک حاضر ہوتے رہے، وہ چند افراد جو شہرت کے آسمان پر چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر چمکے اُن میں۔

حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ علاؤالدین غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ

کو سلسلہ نقشبندیہ کے نمائندہ صوفیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔

خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ نقشبندیہ کے اکابر خلفاء میں سے تھے، مرشد کریم کا یہ ارشاد تو اعلانِ عظمت ہے اور "فقیر خواجگان سے وصول کی ہوئی امانت اور جو کچھ اس راستہ سے فقیر نے کمایا ہے وہ سب تمہارے سپرد کرتا ہے"۔

صاحبِ حال اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے، یہاں تک کہ مرشد گرامی نے فرمایا جسے مجھے دیکھنے کی رغبت ہو وہ محمد پارسا کو دیکھ لے" حج بیت اللہ کو تشریف

لے گئے، پھر عازم مدینہ منورہ ہوئے، روضہ اقدس پر حاضری دی اور وہاں ہی 73 سال کی عمر 822ء میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت خواجہ علاؤالدین غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت تھی مگر وفات کے بعد خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے، صاحب حال بزرگ تھے خوش گفتار تھے 852ھ کو 90 سال کی عمر میں وفات پائی۔

حوالہ جات

1 جواہر نقشبندیہ ص: 205

17۔ حضرت خواجہ محمد علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ
(802ھ)

حضرت خواجہ علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے محبّ خاص اور معتمد خلیفہ تھے آپ کا نام مبارک محمد بن محمد بخاری تھا، آباء واجداد کا تعلق خوارزم سے تھا، ابھی بچپن ہی تھا کہ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی نظران پر پڑی جوہر قابل دیکھا تو آپ کی والدہ سے کہا کہ جب یہ بالغ ہوجائے تو اطلاع کرنا جب حضرت علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو آپ نے تحصیل علم کا پختہ ارادہ کرلیا۔ والد گرامی کی وراثت سے کچھ نہ لیا اور بخارا کے ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ علمِ حاصل کرنے میں بڑا انہاک دکھایا، مدرسہ میں ایک روز خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے، دیکھا کہ آپ نے میلا کچیلا لباس پہن رکھا ہے۔ ایک بوسیدہ بوریے پر لیٹے ہیں، ایک اینٹ کا تکیہ بنا رکھا ہے اور مطالعہ میں مشغول ہیں، اسی اثناء میں خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سامنے آگئے، ادب و تعظیم کے ساتھ کھڑے ہو گئے پھر پاس بیٹھ گئے اور محبت بھری گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند جملوں کا ہی تبادلہ ہوا تھا کہ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا علاؤالدین، میری ایک ہی بیٹی ہے وہ اب بالغ ہے، میری خواہش ہے کہ اس کا نکاح تمہارے ساتھ کردوں، عرض کیا میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے مگر میرے پاس تو کوئی سامان نہیں، نہ دولت ہے اور نہ کوئی جائیداد، گزر بسر کیسے ہوگی، مردحق آگاہ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''میری بچی کی قسمت میں رزق مقرر ہے۔ وہ خزانہ غیب سے پہنچتا رہے گا تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں''۔

اللہ اللہ توکل کی حد تھی اور ذات رازق پر اس قدر بھروسہ تھا کہ نکاح ہوگیا۔

اس تعلق کے بعد قرب کا وسیلہ پیدا ہوگیا۔ اور خواجہ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں ہی رہنے لگے۔ نظر عطا ہر وقت تھی، مسلسل قربت حاصل تھی۔ ساتھ بٹھاتے اور مسلسل توجہ فرماتے پوچھا گیا کہ اس خصوصی توجہ کا محرک کیا ہے فرمایا۔ اس کے نفس کا بھیڑیا گھات میں ہے۔ قریب اس لئے رکھتا ہوں کہ نفس کا بھیڑیا اسے کھانہ جائے، نفس کے تقاضے انسان کو پریشان کرتے ہیں۔ مرشد کریم نے انہیں کا سدباب کردیا یہ اسی مسلسل پناہ کا فیض تھا کہ خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ جلد سلوک کی منزلیں طے کرگئے، اس قدر راہ یاب ہوگئے کہ پیرومرشد اپنی حیات ظاہرہ ہی میں طالبانِ طریقت کو آپ کے سپرد کرتے اور فرماتے۔

''علاؤالدین نے ہمارا بوجھ ہلکا کردیا ہے''

ایک سالک راہ طریقت کے لئے مرشد گرامی کا یوں اظہار خیال کامیاب سفر کا مژدہ ہوتا ہے اس لئے ہم مکتب ساتھیوں نے بھی عقیدت واحترام کا اظہار فرمایا اور اپنا راہنما تسلیم کرلیا حتّٰی کہ خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ نقشبندیہ کے نمایاں شیخ ہیں جن پر مرشد کریم کی نظر عنایت بھی بہت تھی فرمایا کرتے تھے ''جو مجھے دیکھنا چاہے وہ محمد پارسا کو دیکھ لے''۔ نے بھی آپ کی عظمت وبرتری کو تسلیم کیا اور صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت شیخ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے مسندِ سلوک کو وہ وقار بخشا کہ بڑے بڑے نامور بزرگ اس کا اعتراف کرتے رہے۔ سید شریف الدین جرجانی رحمۃ اللہ علیہ جو

درسیات کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور لائق اعتماد شارح مانے جاتے ہیں فرمایا کرتے تھے۔

''جب تک میں شیخ زین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حضور حاضر نہ ہوا رفض سے رہائی نہ ملی اور جب تک میں حضرت خواجہ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے فیوضات سے مشرف نہ ہوا خالق کو نہ پہنچا''۔

طریقت میں دو طرح کے بزرگ پائے جاتے ہیں، ایک گروہ اُن بزرگوں کا ہوتا ہے جو جذب وشوق میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ اربابِ سُکر میں شمار ہوتے ہیں دوسرا گروہ جذب ومستی کے باوجود سلوک کی منزلوں میں ظاہری شریعت کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس حوالے سے بھی خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ پہلے گروہ سے وابستہ تھے اور خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ دوسرے گروہ سے منسلک تھے، یہ باخبر سالکین کا فیصلہ ہوتا ہے کہ کس بزرگ کو مسندِ ارشاد عطا فرمائی جائے حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ شریعت بزرگ تھے اس لئے آپ نے آئندہ کے لئے بھی فیصلہ اسی نقطہ نظر سے کیا اگرچہ خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ بھی شریعت کی پاسداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے۔ کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو آپ کے ہاں فرائض کی ادائیگی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استخراج سے ملتی ہوگی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شریعت پر عمل کی اُن کے نزدیک کس قدر اہمیت تھی۔

حضرت خواجہ علاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ راہِ سلوک میں ایک خاص روش کے قائل تھے جس کا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات جلد اول مکتوب 290 میں بڑی تحسین کے ساتھ ذکر کیا ہے یہ طریقہ علائیہ کہلایا اور بزرگوں کے ہاں لائق اتباع رہا۔

مقصود اس طریقہ کا بھی روحانی منزل تک پہنچنا ہے، ایک طریقہ اُس جذبے سے عبارت ہے جو بیعت کی راہ سے حاصل ہوتا ہے اور طریقہ علائیہ ایسے جذبے کا متلاشی ہے جس کا حصول محبوبیت ذاتیہ کی راہ سے ممکن ہے۔

حضرت شیخ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی سایوں میں نقشبندیت کی ترویج واشاعت میں مشغول رہے۔ آخری لمحات میں بھی احباب سے یہی ذکر کیا فرمایا۔ تم لوگ رسوم وعادات کو چھوڑو۔ خلق کی رسوم وعادات کے خلاف عمل کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت رسوم وعادات اور بشریت کے تقاضوں کو توڑنے کے لئے تھی۔ تمام کاموں میں عزیمت پر عمل کرو اور سنت مطہرہ پر مداومت رکھو۔ یہی نصائح فرماتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے 18 رجب 802ء کو عشاء کی نماز کے بعد وفات پائی اور چغانیاں جو ماوراء النہر کا قصبہ ہے میں دفن ہوئے یاد رہے کہ اسی قصبے میں ہی زیادہ تر زندگی بسر کی تھی۔

آپ کے ارشادات وملفوظات اور کرامات کا اربابِ سیر نے بڑا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ہم مُشتے از خروارے چند کا ذکر کرتے ہیں۔

☼ مرشد کے ساتھ تعلق حقیقت میں غیر سے تعلق ہے اس لئے آخر کار اس کی بھی نفی کردینا چاہیے ابتداء میں یہی وصول الی الحق کا ذریعہ ہے اسلئے مرشد کی رضاجوئی حاصل کرتے رہنا چاہیے۔

☼ ریاضت سے مقصود جسمانی تعلقات کی نفی اور عالم ارواح وعالم طریقت کی طرف مکمل توجہ ہے۔ سلوک سے مقصود یہ ہے کہ بندہ اپنے اختیار وکسب جو راہ کے موانع ہیں سے گزر جائے۔

٭ مزارات سے اسی قدر فیض حاصل ہوتا ہے جس قدر اُن پر اعتماد ہو، اگرچہ قبور کی زیارات میں ظاہری قرب کا بھی اثر ہوتا ہے مگر ارواح طیبہ کی طرف متوجہ ہونے میں ظاہری دوری مانع نہیں ہے۔ دلیل یہ حدیث ہے کہ صَلُّوْا عَلَیَّ حَیْثُمَا کُنْتُمْ مجھ پر درود پڑھو جہاں کہیں بھی ہو، مشائخ کی زیارت کا مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہو اور مشائخ کی روح کو وسیلہ سمجھے۔

٭ مراقبہ نفی و اثبات کے طریقہ سے اعلیٰ ہے کیونکہ مراقبہ سے ملک وملکوت میں تصرف کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے دلوں کو روشنی ملتی ہے اور باطن منور ہو جاتے ہیں۔

٭ عشق جتنا مضبوط ہوگا اپنے آپ سے غیابت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور ہوگا اس لئے عشق جس قدر زیادہ ہوگا اُسی قدر اپنے آپ سے عنایت اور محبوب یعنی ذات باری کا حضور زیادہ ہوگا۔

حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ ایک کشفی حالت کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ وفات سے سات سال قبل حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تشریف لے گئے۔ شعبان کا آخر تھا وہاں پورا رمضان اور اول شوال رہے عید کی رات ایک درویش نے دیکھا کہ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ باہر آئے تو بہت خوش تھے فرمایا مجھے یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ جو شخص میری قبر کے گرد سو فرسنگ کے اندر دفن ہوگا میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اُس کی سفارش کروں گا۔ حضرت علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کو قبر کے گرد چالیس فرسنگ تک شفاعت کا مرتبہ ملا ہے اور میری پیروی کرنے والوں کو ایک ایک فرسنگ تک شفاعت کا رتبہ ملا ہے۔

اس سے ان قبروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، یہ وہی فیض ہے جو ایک بدوی کی زبان سے جاری ہوا تھا اور آج تک مواجہ شریف پر کندہ ہے۔ کس قدر خوش نصیب تھا وہ عقیدت مند جس کا نام بھی معلوم نہیں مگر عقیدت زندہ ہے کہا تھا۔

نَفْسِی فِدَاءٌ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاکِنُہٗ   فِیْہِ الْعَفَافُ وَفِیْہِ الْجُوْدُ وَالْکَرَمُ

18۔ حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ

(م 851ھ)

حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ کے ایک نامور بزرگ اور صاحب تصنیف شیخ تھے یعقوب بن عثمان نام ہے اور نواح غزنی (افغانستان) کے رہنے والے ہیں وہاں مضافاتی قصبہ چرخ میں 762ء میں پیدا ہوئے اس لئے چرخی کہلائے۔ علمی گھرانہ تھا اور والد گرامی شریعت وطریقت میں لائق استناد تھے اس لئے صاحبزادے کو بھی تحصیل علم کی راہ پر لگایا۔ جامعہ ہرات میں ابتدائی اسباق پڑھے اور پھر تکمیل درسیات کے لئے دیار مصر تشریف لے گئے کہ اُن دنوں یہ علاقہ علماء کا مرکز تھا، وہاں ماہر اساتذہ سے ایسا ذوق علمی پروان چڑھا کہ یہ نشہ عمر بھر نہ اُترا، حضرت شیخ زین الدین خوانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہم درس رہے۔ اساتذہ میں حضرت مولانا شہاب الدین سریامی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے درسیات سے فارغ ہوئے تو علماء بخارا سے فتویٰ نویسی کی اجازت بھی حاصل کی۔ طلبِ علم کا یہ دورانیہ اور آپ کا یہ انہماک ظاہر کرتا ہے کہ آپ اپنے دور کے مستند علماء میں سے تھے، یہ بنیاد، سلوک کی منزلیں آسان کرتی ہے اور جادۂ مستقیم پر گامزن رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ شرف بھی سلسلہ نقشبندیہ کو حاصل رہا ہے کہ زہد وتقویٰ کی کثرت ہمیشہ علم کے سایوں میں رہی ہے یہی کامیاب صوفی کے اوصاف ہیں۔

حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان طبع شروع ہی سے روحانیت کی

جانب تھا۔ حضرت خواجہ نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت اور منزلت کا احساس تھا اور خواہش تھی کہ حاضرِ دربار ہوں۔ بخارا سے تکمیل درسیات کے بعد واپس چرخ جانے لگے تو حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں حضوری کی تڑپ پیدا ہوئی۔ فوراً چل پڑے حاضری کے اشارے آپ کو ملتے رہے تھے۔ روایت ہے کہ بخارا میں حضرت سید جلال الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ایک شام حاضر تھے کہ اندر سے ایک داعیہ اٹھا کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہونا چاہیے چنانچہ چل پڑے، راستے میں ایک مجذوب ملا، کہا جاتا ہے کہ یہ مجذوب حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کو بڑا پیارا تھا۔ مجذوب نے دیکھتے ہی کہا کہ جلد قدم بڑھاؤ۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ تم مقبولانِ بارگاہِ الٰہی میں شمار ہونے لگو، چنانچہ حاضر ہو گئے اور نسبتِ ارادت کی خواہش کی، اس پر حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہم خود تو کسی کو قبول نہیں کرتے، بارگاہِ ایزدی سے اجازت ملے تو قبول کر لیتے ہیں اس لئے انتظار کرو، یہ انتظار کی رات بڑی کڑی تھی، ظن وتخمین اور یقین کی پل صراط تھی۔ سراپا نیاز بنے رات گزاری اور صبح کو پھر حاضر ہو گئے۔ دیکھتے ہی مسکرائے اور فرمایا۔ مبارک ہو، قبولیت کا اشارہ ہو گیا۔ اور شرفِ بیعت سے سرفراز ہو گئے۔ وقوفِ عددی کی تاکید فرمائی کہ یہ علم لدنی کا پہلا سبق ہے جو حضرت خواجہ خضر علیہ السلام نے حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کو پڑھایا تھا۔

حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت بخارا کے قصر عارفاں میں مرشد کریم کے پاس رہے، سلوک ومعرفت میں تربیت فرمائی اور پھر رخصت عطا فرما دی، بوقتِ رخصت اعلان فرمایا کہ

ہم سے جو کچھ تمہیں ملا ہے اس کو بندوں تک پہنچاؤ تا کہ سعادت کا موجب بنے۔ 1

رخصت پا کر واپس چلے اور کش کے مقام پر کچھ عرصہ قیام کیا، یہاں ہی تھے کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر ملی۔ پریشان خاطر ہوئے مگر واسطہ مستحکم تھا اس لئے بشارت سے نوازے جاتے رہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشارہ پایا کہ دین تو ایک ہی ہے۔ اس سے سمجھ گئے کہ یہی نسبت برقرار رہنی چاہیے، ایک اور مرتبہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ایسا عمل پوچھا جو قیامت میں انہیں پالینے کا ذریعہ بنے تو فرمایا ''شریعت رسول اکرم ﷺ پر عمل کرنے سے'' تم مجھے پالو گے۔ پھر بدخشاں آ گئے۔ دل مضطرب تھا کہ مسلسل راہنمائی کیسے حاصل رہے۔ وہاں ہی تھے کہ حضرت خواجہ علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا خط ملا کہ ایسے عالم میں میری متابعت کرتے رہو یہی حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے۔ اس پر فوراً چغانیاں روانہ ہوگئے اور حضرت خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضر ہوگئے، کافی عرصہ وہاں گزرا اور صحبتِ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یاب ہوتے رہے حضرت علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا 802ھ میں انتقال ہوگیا تو واپس گئے اور مسند ارشاد بچھائی۔ تعلیم و تربیت سے اک جہان فیض یاب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پچاس سال تک حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی اس نصیحت پر عمل پیرا رہے۔

''جو کچھ تمہیں ہم سے ملا ہے اسے بندوں تک پہنچا دینا، حاضرین کو بطریق خطاب اور غائبین کو بذریعہ خط وکتابت''۔ 2

پچاس سال تک یہ رشد وہدایت کا سلسلہ پوری آب وتاب سے جاری رہا۔ سلسلہ نقشبند کا علمی و عملی فیضان اور سلوک ومعرفت کا تسلسل اس طرح جاری رہا کہ عقائد میں بھی اعتماد آیا اور اعمال میں بھی استقامت پیدا ہوئی، ساری عمر حضرت خواجہ

چرخی رحمۃ اللہ علیہ رزق حلال کے طلب گار رہے اور متوسلین کو بھی یہی نصیحت کرتے رہے فرمایا کرتے۔ ''رزق حلال سالک کے لئے بنیاد ہے۔ سالک جب حرام میں مبتلا ہوجاتا ہے تو رجعت قہقہری کرتا ہے۔ اور راہ مستقیم کے سلوک سے منحرف ہوجاتا ہے۔ 3

حضرت خواجہ چرخی رحمۃ اللہ علیہ نے 5صفر 851ھ میں وفات پائی اور بلفتو تاجکستان میں دفن ہوئے اور وہیں مزار ہے۔ آپ صاحب علم شیخ تھے اس لئے متعدد تصانیف آپ کے سیال قلم سے معرضِ وجود میں آئیں مثلاً

تفسیر چرخی: جو تعوذ، تسمیہ، فاتحہ اور آخری دو پاروں کی تفسیر ہے مکمل اسلئے نہ ہوسکی کہ حیاتِ مستعار نے وفا نہ کی کئی بار چھپ چکی ہے۔ لکھنو، قندھار اور لاہور سے چھپی ہے۔

رسالہ نائیہ: مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے دیباچہ کی شرح ہے۔

انسیہ: اس میں فضیلت دوامِ وضو، نفلی نمازیں، خاتم اور بعض دیگر فوائد کا تذکرہ ہے، کئی بار چھپا، مکتبہ نبویہ لاہور سے 1981ء میں اردو ترجمہ بھی چھپا ہے۔

شرح رباعی ابوسعید ابوالخیر: مرکز تحقیقات فارسی ایران، پاکستان اسلام آباد میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

ابدالیہ: اثبات وجود اولیاء اور اولیاء کے مراتب ہیں، فارسی نسخہ بھی مرکز تحقیقات فارسی نے 1978ء میں شائع کردیا تھا۔ اردو ترجمہ بھی اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور

نے 1978ء ہی میں شائع کیا تھا۔

شرح اسماء اللہ: اسماء اللہ کی فارسی شرح ہے۔ گولڑہ شریف کے کتب خانہ میں اور مکھڈ شریف کے کتب خانہ میں نسخے موجود ہیں۔

قرآن پاک کا تاجک زبان میں ترجمہ: حضرت خواجہ چرخی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ منفرد کارنامہ ہے کہ تاجک زبان میں پہلی مرتبہ قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔

رسالہ دربارہ اصحاب وعلامات قیامت: یہ بھی مخطوط کی شکل میں تاشقند میں موجود ہے۔ مولانا محمد صادق قصوری مدظلہ لائق ستائش ہیں کہ آپ نے خواجہ چرخی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات وتالیفات پر بڑی محنت سے کام کیا ہے اور یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے آمین۔

مختصر یہ کہ حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ ایک متبحر عالم اور واصل باللہ شیخ تھے۔ ایسے بزرگ ہی اسلام کی حقانیت کی دلیل ہوتے ہیں اور انہیں کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ پر آپ کی عظمت ہر دور میں آشکار رہے گی اور ہر صاحب علم ومعرفت آپ کی ذات سے کسب فیض کرتا رہے گا۔

حوالہ جات

1 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص 230
2 تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص:299
3 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص:217

19۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ
(م 895ھ)

سلسلہ نقشبندیہ کے ایک اور نامور شیخ جن کی جدوجہد نے عام انسان سے لے کر حکمرانوں تک، نیم خواندہ سے لے کر دنیائے علم وادب کے روشن ستاروں تک کو متاثر کیا۔ ایک پراثر شخصیت جن سے گردونواح ہی نہیں۔ دور دور کے متلاشیانِ سلوک بہرہ ور ہوئے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی متعین راہ پر پورے اعتماد سے چلنے والے وہ شیخ ہیں جنہوں نے طریقہ نقشبندیہ کو وقار اور تمکنت عطا فرمائی، ایک انتشار پذیر ماحول جس میں مادی گرسنگی عروج پر تھی اور سیاسی انحطاط اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ ایک استحکام کی علامت بن کر ابھرے اور مسلم معاشرے کو سیاست گردی کی لپیٹ سے بچا لیا۔

حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا اصلی نام عبید اللہ محمود شاشی تھا کہ تاشقند سے نسبت تھی، لقب ناصر الدین تھا مگر جس نام سے عرب وعجم میں معروف ہوئے وہ خواجہ احرار تھا جو بعض اوقات صرف احرار کہا جاتا ہے۔ احرار سے مراد تھی کہ ایسا وجود جو غیر اللہ سے مطلقاً آزاد ہے۔ کیونکہ آپ کا ہر رویہ صرف اور صرف اطاعت الٰہی کا شہکار تھا اس لئے یہی لقب زیبا رہا، تاشقند کے ایک گاؤں باغستان کے رہنے والے تھے وہاں رمضان 806ھ میں پیدا ہوئے۔ گھرانے پر دینی اثرات نمایاں تھے آپ کے دادا محترم خواجہ شہاب الدین اپنے دور کے نہایت نیک بزرگ تھے اور اولیاء اللہ میں

شمار ہوتے تھے۔ایسے گھرانے میں ایک نیک سیرت بچہ طہارت و پاکیزگی کی قبا پہنے ہوئے آیا کہتے ہیں چالیس روز تک ماں کا دودھ نہ پیا کہ زچگی کے یہ ایام، ایام طہارت نہیں ہوتے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے پاکیزگی کا حصار قائم کر رکھا تھا جس میں اس نومولود نے آنکھیں کھولی تھیں، دادا کے کریمانہ سلسلے میں پرورش پانے لگے تھے کہ ابھی بچپن ہی تھا کہ دادا کا وقت آخر آ گیا۔انہوں نے اپنے سارے پوتوں کو بلایا تا کہ آخری مرتبہ شفقت کا اظہار کر سکیں، خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کم سنی میں حاضر ہوئے تو حیرت ہوئی کہ دادا باوجودیکہ نقاہت تھی اور بزرگ بھی تھے آپ کے احترام کے لئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اس فرزند کے بارے میں مجھے نبوی بشارت ہوئی ہے کہ یہ عالمگیر پیر ہوگا اور اس سے شریعت وطریقت کو رونق ملے گی اور فروغ حاصل ہوگا، یہ تمہید تھی اُس منزلت کی جو آپ کو حاصل ہوئی۔

ابھی تین چار سال کے ہی تھے کہ مکتب جانے لگے اور حصولِ علم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔آپ علم حاصل کرتے مگر طبعی ذوق تصوف کی جانب تھا۔بچپن میں ہی مرحوم مشائخ کے مزارات پر حاضری دینے لگے۔اس معمول میں زندگی کے ابتدائی ایام گزرے، بائیس سال کی عمر میں سمرقند تشریف لے آئے تا کہ دائرہ علم اور وسیع ہو جائے۔سمرقند میں خوش قسمتی سے حضرت علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے اُن سے تعلق جڑ گیا۔مولانا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ مکاشفوں اور مراقبوں کے بعد بار بار اعلان کراتے تھے کہ یہ ہونہار وجود ساری دنیا پر محیط ہو جائے گا کہ وقت کے سلاطین بھی تابع فرمان ہوں گے۔سمرقند ہی میں حضرت سید قاسم تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی کچھ عرصہ قیام رہا اور پھر بخارا کے لئے

روانہ ہو گئے راستے میں چند دن شیخ سراج الدین کلال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ٹھہرے پھر بخارا آ گئے وہاں بہت سے مشائخ رہائش پذیر تھے اُن سے صحبت رہی، ان بزرگوں میں سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مولانا حسام الدین شاشی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ علاؤالدین غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام نمایاں ہیں، خراسان بھی گئے۔مرو میں بھی قیام رہا اور پھر چار سال ہرات میں ٹھہرے جہاں شیخ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ زین العابدین خوانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کسب فیض کیا۔

کہا جاتا ہے کہ خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی زیادہ توجہ علم ومعرفت کی طرف رہی اور علوم ظاہریہ پر کم متوجہ ہوئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ درسیات کی مہارت کم تھی، آپ کی پوری زندگی علمی ثروت سے بھی مالا مال ہے اس کی شہادت قاضی فضل اللہ ابو اللیثی رحمۃ اللہ علیہ جو سمرقند کے اکابر علماء میں سے تھے کی روایت میں موجود ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہمیں اتنا علم تھا کہ وہ درسیات کے علوم کو کم پڑھے تھے مگر یہ اکثر ہوا کہ جب بھی تفسیر بیضاوی کے حوالے سے کوئی اشکال سامنے آیا اور ہم اسی کے حل سے عاجز رہے تو آپ نے اُسے حل کر دیا اور جب آپ کوئی اشکال سامنے لائے تو ہم اُس کے حل میں عاجز نہ آئے ہوں، یاد رہے کہ درسیات میں تفسیر بیضاوی علمی سطوت کا نشان سمجھی جاتی ہے۔

ہرات کے قیام کے دوران میں حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بہت کچھ سنا تو اشتیاقِ زیارت بڑھا اور روانہ ہو گئے کہ چغانیاں حاضر ہو جائیں، راستے ہی تھے کہ بیمار ہو گئے اور بیس روز تک بخار میں مبتلا رہے اس لئے راستے ہی میں ٹھہرے رہے۔یہ شاید تطہیر قلب ونظر کا دورانیہ تھا، قیام کے دوران بعض لوگوں

نے خواجہ چرخی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بعض ناپسندیدہ گفتگو کی جس سے قدرے دل برداشتہ بھی ہوئے یہ بھی خیال آیا کہ واپس لوٹ جائیں مگر پھر سوچا کہ اتنا سفر تو کرلیا کچھ اور سہی چنانچہ وہاں سے روانہ ہوئے اور چغانیاں میں حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضر ہوگئے۔ اس حاضری کی ساری روداد بڑے پیار سے خود بیان کی ہے۔

آپ دربار میں گئے، سامنے ہوئے، پیشانی پر ایسا داغ دیکھا جو برص کے داغ کے مشابہ تھا اس لئے کچھ کراہت پیدا ہوئی مگر جلد ہی ایسی صورت سامنے آئی کہ دل خمیدہ ہونے لگا، حضرت نے ہاتھ بڑھایا کہ بیعت کرو، یہاں خود سپردگی کا مرحلہ آچکا تھا، ہاتھ تھام لیا اور فرمایا کہ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کا ہاتھ یونہی پکڑا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ ”تیرا ہاتھ میرا ہاتھ ہے“ جس نے تیرا ہاتھ پکڑا اُسی نے میرا ہاتھ پکڑا، اسی لئے اب تم خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑلو، اس پر حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کا ہاتھ تھام لیا اور بیعت فرمالی۔ روایت ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں تمہیں وقوفِ عددی یعنی شغل نفی واثبات کی اجازت دیتا ہوں یہی مجھے خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم فرمایا تھا یہ فرمایا کہ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ تم بطریقِ جذبہ تربیت کرو۔ اس پر بعض اصحاب نے سوال کیا کہ ابھی تو یہ مرید ہوا ہے اور سلسلہ میں داخل ہوا ہے آپ نے بطریق جذبہ تربیت کا اختیار دے دیا۔ یہ کیوں، اس پر خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی کہ ان کی سب چیزیں تیار تھیں صرف اجازت کی دیر تھی، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرشد کریم نے فرمایا کہ ہر طالب جو کسی بزرگ کی صحبت میں آنا چاہیے اسے خواجہ عبید اللہ اصرار رحمۃ اللہ علیہ کی طرح آنا چاہیے کہ

چراغ، تیل، بتی سب تیار ہو، صرف دیا سلائی دکھانے کی دیر ہو۔1

اس کے بعد وہ تمام وظائف واوراد سکھائے جو سلسلہ نقشبندیہ کے لئے خاص ہیں ایک سال تک معیت میں رہے اور پھر واپس لوٹ آئے۔ کہا جاتا ہے کہ 29 سال کی عمر تھی کہ واپس لوٹے۔

تاشقند میں مستقل قیام کرلیا، زراعت کو ذریعہ معاش بنایا، اس قدر برکت ہوئی کہ ہر سہولت کی فراوانی ہوگئی نہ صرف یہ کہ معاشی خود کفالت ہوگئی بلکہ ضرورت مندوں کے لئے بھی بہت کچھ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دولت کی کثرت اپنی ذات کے لئے نہ تھی دوسروں کی مدد کے لئے تھی۔ اگر کبھی کسی کے دل میں یہ خیال گزرا کہ درویش اور اس قدر مالدار تو عملاً اس کی وضاحت بھی کردی گئی۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا شاہانِ وقت کے ساتھ رابطہ بھی اکثر موضوعِ گفتگو رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے مسلمان حکمرانوں سے نفرت یا دوری کا رویہ نہیں اپنایا۔ صوفیاء کرام کے ہاں یہ تصور عام رہا تھا کہ برسرِ اقتدار لوگوں کے ساتھ رابطہ مداہنت کا سبب بنتا ہے کہ احکام پر عمل پیرا ہونے میں اقتدار کی مصلحت آڑے آتی ہے۔ یہ تصور کسی حد تک تمام سلاسل میں قائم رہا مگر نقشبند صوفیاء اور خاص طور پر حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ اُن کے نزدیک جتنا کسی میں اثر ورسوخ زیادہ ہے اتنا ہی وہ توجہ کا زیادہ مستحق ہے کہ اُس کی اثر آفرینی کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ آخر دورِ رسالت میں شاہانِ عالم کے نام خط لکھے گئے تھے اور انہیں دعوت دی گئی تھی حالانکہ وہ مسلمان نہ تھے۔ اگر وہ دعوت کے قابل سمجھے گئے ہیں تو وہ مسلمان حکمران نصیحت کے قابل کیوں نہ سمجھے جائیں جن سے نصرتِ اسلام کی امید قوی ہے۔ ہاں یہ ضرور فرق رہے کہ

دعوت وقربت کا ہدف نشرِ حسنات ہونا چاہیے، مادی مفادات کا کوئی پہلو ان تعلقات سے وابستہ نہ ہو۔ یہ وہ ہدف تھا جس کے حصول کی خاطر ان حضرات مشائخ نے سلاطین اور عمائدین کو دعوتِ خیر دی اور خیر خواہی کے جذبات کے ساتھ دی، اس کی ایک درخشندہ مثال یہ ہے کہ

ایک مرتبہ دو درویش آپ کی زیارت کے لئے آئے مگر آپ کو نہ پایا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ حضرت بادشاہ کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ وہ درویش کچھ بگڑے اور کہنے لگے۔ کیسے شیخ ہیں کہ بادشاہوں کے دروازے پر جاتے ہیں اور دنیائے تصوف کا مشہور قول دہرایا۔ بِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰی بَابِ الْاَمِيْرِ۔ وہ فقیر جو امیر کے دروازے پر ہو بہت برا ہے۔ یہ قول اپنے درجے میں صداقت کا علمبردار تھا مگر حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نہ وہ فقیر تھے جو حاجتوں کی گٹھری اٹھائے امیروں کے دروازے پر مدد کے خواستگار ہوں اور نہ کوئی امیر انہیں ایسا حاجت مند سمجھتا تھا بہر کیف ایک طنز کا تیر تھا جو چل گیا قدرت کو یہ طرز کلام پسند نہ آیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اُسی روز بادشاہ کے دربار سے دو چور بھاگ نکلے اہل کاران کی تلاش میں سرگرداں ہوئے، اچانک یہ دونوں درویش نظر پڑے۔ شک ہوا اور پکڑے گئے۔ دربار میں پیش کئے گئے، سمجھا گیا کہ یہ وہی چور تھے۔ بادشاہ نے حکم دے دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ دربار میں موجود تھے فوراً گویا ہوئے کہ یہ دونوں تو مجھے ملنے آئے تھے، چور تو نہیں ہیں گواہی معتبر تھی چھوڑ دیئے گئے۔ مخاطب کر کے فرمایا کہ بادشاہ کے دربار میں تم جیسے بے گناہوں کو بچانے گیا تھا۔ امیر کے دروازے پر برا فقیر بن کر نہیں گیا تھا۔ عملاً واضح ہوگیا کہ فعل کی اچھائی یا برائی سیاقِ فعل سے ظاہر

ہوتی ہے، مطلقاً فیصلہ نہیں کرنا چاہیے

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی ایسا معاملہ پیش آیا جو انتباہِ شعور کا باعث بنا، ابھی زیادہ آشنائی نہ تھی کہ دیکھا آپ ایک عمدہ سواری پر ہیں اور خدّام کی ایک تعداد ساتھ ساتھ ہے یہ کروفر اور یہ شان وشوکت اچھی نہ لگی، درویشی کا جو تصور باندھا ہوا تھا متزلزل ہوگیا۔ شاعر تھے۔ حس لطیف رکھتے تھے۔ جذبوں نے جب کہرام مچایا تو وہ ایک مصرعے کی صورت زبان پر آگئے۔

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد

''مردِ درویش وہ نہیں ہوتا جو دنیا کو دوست رکھتا ہے''۔

یہ کہہ کر اپنے جذبوں کا اظہار کر گئے، وقت گزرتا گیا، شہرت کی خبر پہنچتی رہی جو دل کو متاثر کرتی رہی، آخر ایک مرتبہ حاضر ہوگئے۔ عقیدت مندی سے ملے تو فرمایا جامی ایک ہی مصرعہ کہہ کر رُک کیوں گئے۔ شعر تو مکمل کرو، اس پر قدرے شرمندہ ہوگئے کہ اب دل کی حالت اور تھی۔ آخر فرمایا ہم ہی اس شعر کو مکمل کر دیتے ہیں۔

نہ مرد ست آں کہ دنیا دوست دارد

اگر دارد برائے دوست دارد

کہ اگر دنیا کو اپنائے بھی تو دوست کی خاطر ہی اپنائے۔

شعر مکمل ہوگیا اور مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی قلبی کیفیت بھی بدل گئی اور اسیرِ محبت ہوگئے اور پھر عمر بھر سراپا نیاز رہے۔

وفات: حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ دعوت وارشاد کے مشن پر تقریباً نوے

سال کی عمر تک قائم رہے، ہفتہ کی شب تھی، مغرب وعشاء کا وقت تھا کہ جس مکان میں تھے وہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگئی، کمرہ بقعہ نور بن گیا، پھر آپ کے دونوں ابروؤں کے درمیان سے ایسا نور نکلا کہ سب روشنیاں ماند پڑ گئیں، حاضرین اس نور سے لطف اندوز بھی ہوئے اور حیرت زدہ بھی، اس نور و نکہت کے سماں میں 29 ربیع الاول 895ھ کو آپ راہی ملک عدم ہوگئے اور اپنے پیچھے اپنی مہکتی تعلیمات کا اک جہان تازہ چھوڑ گئے جس کی تازگی آج تک برقرار ہے۔ محلہ کنشیر سمرقند میں دفن ہوئے، مزار مبارک اب فیض رسائی کا باب مفتوح ہے۔

ارشادات وتعلیمات:

دنیائے تصوف میں دو وجود لائق توجہ ہوتے ہیں ایک مرشد یا پیر اور دوسرا مرید یا سالک ان دونوں کا کردار اور رویہ کیسا ہونا چاہیے، یہ اگر واضح ہو جائے تو راہِ سلوک آسان ہو جاتی ہے۔ حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی ان دونوں کے حوالے سے تعلیمات کیا ہیں۔ غور کیجئے تا کہ اس انتساب اور اس انتخاب میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔ فرماتے ہیں۔

پیر وہ شخص ہوسکتا ہے جو رسول اکرم ﷺ کی رضا میں فنا ہو گیا ہو، جو نبی کریم ﷺ کی پسند، ناپسند کا خیال رکھتا ہو، آپ کی پسند پر عمل کرے اور جس کو ناپسند فرمایا ہو اُس سے اجتناب کرے، اُس کی اپنی خواہشات اسی پسند و ناپسند میں گم ہوگئی ہوں اور وہ ایسا آئینہ ہو گیا ہو کہ اُس میں حضور اکرم ﷺ کے اخلاق واوصاف کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو، یہ وہ مقام ہے کہ جہاں وہ اوصاف نبوی ﷺ سے متصف

ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ کے تصرف کا مظہر بن جاتا ہے۔ اور

مرید وہ ہے کہ ارادت کی تاثیر میں اُس کی تمام خواہشات جل گئی ہوں، اس کے دل میں کوئی مراد باقی نہ رہی ہو اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف پیر کی طرف متوجہ ہو، یک گیر و محکم گیر کا مظہر ہو۔ مزید فرمایا کہ مرید صادق وہ ہے کہ خواہ بیس سال گزر جائیں اُس کی بائیں جانب کا فرشتہ کچھ بھی لکھنے نہ پائے۔ مراد یہ نہیں کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ جب بھی گناہ سرزد ہو فوراً اس کی تلافی کرے تا کہ گناہ نامۂ اعمال کا حصہ نہ بنے، مرید کو اپنے پیر کے پاس یوں آنا چاہیے جس طرح ایک مفلس تونگر کے پاس آتا ہے تا کہ پیر کے جذبات رحم برآفروختہ ہوں۔ اس پر اپنی مثال دی فرمایا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جمعہ کے روز ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ ہر نیک آرزو پوری ہو جاتی ہے، میں ایسی ساعت میں ارباب عزیمت کی صحبت مانگتا ہوں کیونکہ اس کے ذریعے ہر سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔

مزید فرمایا کہ رجال الغیب ایسے لوگوں کے پاس آتے ہیں جو صاحب عزیمت ہوں۔ اہلِ رخصت تو ضعیف ہوتے ہیں۔ ہمارے مشائخ کا طریقہ عزیمت کا ہے۔

خواہشات انسانی کے تقاضوں سے بچنے کے تین طریقے ہیں۔

ایک یہ کہ اعمال خیر کو لازم رکھے۔

دوسرے یہ کہ اپنی ہمت پر بھروسہ نہ کرے حق تعالیٰ سے التجا کرتا رہے کہ وہ بچالے۔

تیسرے یہ کہ اپنے مرشد سے اس نجات کے لئے مدد کا طلب گار رہے۔

پھر فرمایا میں نے تو تیسرا طریقہ اپنایا ہے کہ مرشد کو وسیلہ بنایا ہے یہی زیادہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

شریعت، طریقت اور حقیقت تفہیم کے مدارج ہیں، نقشبندیت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ شریعت کی پاسداری اس طرز سلوک میں ہمیشہ قائم رہی ہے۔

حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ظاہر پر احکام جاری کرنا شریعت ہے جمعیتِ دل کے ساتھ عمل طریقت ہے اور اس جمعیت میں رسوخ حقیقت ہے، اس کی عملی مثال یہ ہے کہ جھوٹ ممنوع ہے، اگر یہ کوشش رہے کہ زبان پر جھوٹ جاری نہ ہو تو یہ شریعت ہے، اگر دل سے بھی جھوٹ کا تصور مٹتا ہے تو یہ طریقت ہے اور اگر یہ کیفیت ہو جائے کہ خواہ اختیار ہو یا نہ ہو دل و زبان سے جھوٹ ادا ہی نہیں ہوتا تو یہ حقیقت ہے۔

فرمایا کہ اگر تمام احوال و مواجید حاصل ہو بھی جائیں مگر اہل سنت کے عقائد سے آراستہ ہونا نصیب نہ ہو یہ بجز خرابی کے کچھ نہیں اور اگر احوال و مواجید کی تمام کیفیات حاصل نہ بھی ہوں مگر اہل سنت و جماعت کے عقائد پر یقین ہو تو سب خیر ہی خیر ہے استقامت ہر حال میں ضروری ہے یعنی ضرورت سے تجاوز نہ ہو اور افراط و تفریط سے محفوظ رہیں۔ یہی اصل ہے کرامت و خارق عادت کا اعتبار نہیں، حدیث میں جو آیا ہے کہ شَيَّبَتْنِي سُوْرَةُ هُوْدٍ۔ مجھے سورہ ھود نے بوڑھا کر دیا یہ اس لئے کہ اس میں استقامت کا حکم ہے۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ۔ استقامت اختیار کرو جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

تعظیم سادات کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ جس بستی میں سادات

رہتے ہوں میں اُس میں نہیں رہتا کیونکہ ڈر ہے کہ میں اُن کی تعظیم و تکریم کا حق ادا نہ کر سکوں گا اس پر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک مجلس میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کئی بار اٹھے اور بیٹھے، کسی نے پوچھا کہ اس کا سبب کیا تھا فرمایا ان کھیلتے والے لڑکوں میں ایک سادات کا لڑکا بھی ہے۔ وہ لڑکا جب قریب آتا تو میں تعظیماً اٹھ جاتا ہوں۔

فرمایا ہر لقمے اور طعام میں احتیاط کی ضرورت ہے، چاہیے کہ کھانا پکانے والا باوضو ہو، وہ شعور و آگہی سے چولہا جلائے، جس پکانے میں غصہ یا پریشان باتیں ظہور میں آئیں اُس کھانے کو حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نہ کھاتے تھے۔

فرمایا: لوگوں کا خیال ہے کی شاید کمال "انا الحق" کہنے میں ہے، ایسا نہیں کمال تو انا کو مٹانے میں ہے۔

فرمایا۔ ہر روز سونے سے پہلے اپنے گذشتہ اعمال کو یاد کرو وہ کیسے تھے اگر اطاعت میں نہ ہوں تو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔

فرمایا۔ آداب طریقت میں یہ بھی ہے کہ ہمیشہ باوضو رہا جائے۔ ہمیشہ وضو رہے تو رزق کی فراخی ہوتی ہے۔

فرمایا۔ اعمال و صحبت کا اثر جمادات پر بھی ہوتا ہے مثلاً اگر نماز ایسی جگہ پڑھی جائے جہاں بداعمالیاں ہوتی رہی ہوں تو نماز بھی بابرکت نہ گی جبکہ ایسی جگہ نماز پڑھنا جہاں عارفین کی برکت کے اثرات ہوں۔ بڑی قدر و قیمت والی ہے، حرم پاک کی دو رکعت نماز دوسرے مقامات کی نماز سے کئی گنا زیادہ بابرکت ہے۔

فرمایا۔ بعد از نماز عشاء نیند سے پہلے سورہ اخلاص، سورہ الفلق اور سورہ الناس

تین تین بار پڑھ کراس کا ثواب تمام اہل قبور کو بخش دینا چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت فرمائے، قبروں والے زندوں کے ان تحائف کے منتظر رہتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ کہ "اِرْحَمْ تُرْحَمْ" رحم کر تا کہ تجھ پر رحم کیا جائے۔

ایک مرتبہ آیت کریمہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کی وضاحت میں فرمایا کہ اس کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ اہل صدق کی معیت اختیار کرے، صحبت کو محض آنکھ سے دیکھنے تک محدود نہ کرے، باطن سے ربط ہو تو صحبت دائمی ہو جائے گی اور باطن کا باطن کے ساتھ اتحاد قائم ہو جائے گا۔

الغرض حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے سالکین کو ایک ایسی شاہراہ کا راہی بنایا جو ہر حال میں مقصود آشنا ہے۔ ارباب حکمت حاضر ہوئے اور خلافت سے بھی نوازے گئے۔ خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور مرید جو علم وادب اور سلوک کے مردیگانہ تھے حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو مشائخ کے ایک عظیم تذکرے "نفحات الانس" کے مولّف ہیں، باکمال شاعر ہیں اور درسیات کی معتبر کتاب شرح جامی کے مصنف ہیں، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے یہ فیضان نظم ونثر میں فروغ پذیر رہا اور خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا نام روشن سے روشن تر ہوا۔

حوالہ جات

1 تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص:204

2 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:249

20۔ حضرت خواجہ محمد زاہد وخشی رحمۃ اللہ علیہ

(م 936ھ)

حضرت خواجہ محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ بخارا کے علاقہ کے ایک قصبہ وخش میں پیدا ہوئے 14 شوال 852ھ تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائے عمر سے ہی علم دوست اور معرفت آشنا تھے اس لئے عموماً آپ کے نام کے ساتھ مولانا لکھا جاتا ہے۔ اُن دنوں خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین دور ونزدیک اصلاح وفلاح کا کام کر رہے تھے۔ آپ بھی نوعمری ہی میں اس تحریک سے متاثر ہو گئے اور حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے کسی مرید سے جذب وشوق کی منزلیں طے کرنے لگے۔ خاندانی وجاہت بھی حاصل تھی اور خون میں حسنات کی فروانی تھی کہ حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز تھے بلکہ بعض تذکرہ نگاروں نے نواسہ لکھا ہے۔ سعادت مندی کے حصار میں جوان ہوئے تو حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت سے مانوس ہوئے، متوسلین سے حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس قدر سنا کہ زیارت کے لئے بے قرار ہو گئے اور سمرقند کے لئے رخصت سفر باندھا، وہاں مولد وانسرائے میں قیام کیا، اس مقام سے حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کا مرکزِ یقین صرف تین کوس کے فاصلے پر تھا یہ پڑاؤ ٹھہرنے کے لئے نہ تھا۔ حاضری کے لئے تیاری کا دورانیہ تھا آخر ایک دن تیار ہوئے کہ حاضر ہو جائیں۔ خوب تیار ہوئے لباس تک بدل ڈالا اور چل پڑے اُدھر حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی نورانی بصیرت باخبر ہوگئی کہ ایک مرد درویش آرہا ہے۔ یہ نہایت سعادت کی بات تھی کہ خود حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ استقبال کے لئے چل پڑے،

مریدوں کی ایک جمعیت ساتھ تھی، اونٹ پر سوار تھے، تھوڑا ہی فاصلہ تھا۔ اونٹ جلد ہی رک گیا اور طالب و مطلوب سامنے تھے خوش بختی کی انتہا تھی کہ مطلوب خود طالب کی تلاش میں تھا۔ آمد کی خبر ملی تو مولانا زاہد رحمۃ اللہ علیہ بے اختیار دوڑے۔ قدم بوسی کی اور خلوت خانے میں چلے گئے مرشد کریم مائل بہ عطاء تھے اور طالب صادق کا کشکولِ دل سراپا التجا تھا۔ چند لمحوں ہی میں کاسہ دل لبریز ہوگیا۔

حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے لمحوں میں ثمر بار کردیا حتّٰکہ خلافت بھی عطا فرمادی۔ ساتھ آنے والے مرید حیران تھے کہ عطاء کے لمحات اتنے مختصر نکلے، کچھ خیال آیا کہ ہم بھی تو عقیدت مند ہیں۔ سراپا خدمت گار ہیں ہمیں اس قدر نہیں نوازا گیا ایک نووارد کو اس عجلت میں مالا مال کردیا گیا جبکہ وہ ابھی حاضر دربار بھی نہ ہوا تھا خود بڑھ کر سرفراز کردیا، حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ اس وسوسے سے آگاہ تھے فرمایا مولانا زاہد چراغ، تیل، اور بتی ساتھ لائے تھے ہم نے تو صرف آگ دکھائی ہے۔ یہ تو خود جل اٹھنے کو تیار ہو کر آئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر تیار تھے کہ منزل تک رسائی کا بھی انتظار نہ ہوا۔ راستے ہی میں فیض یاب کردیئے گئے۔ سعادت مند روحوں کا یہی امتیاز ہوتا ہے کہ وہ لمحوں میں نوازے جاتے ہیں۔

حضرت خواجہ محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ راستے سے ہی واپس آگئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ اپنے علاقے میں جاری فرمایا۔ بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے اور سلسلۂ نقشبندیہ کا فیضان مسلسل جاری رہا، اسی سال سے زائد عمر پائی اور آخر یکم ربیع الاول 936ھ میں اپنے قصبے وخش ہی میں وفات پائی، مزار بھی وہاں ہے جو فیض رسائی کا منبع تھا اور ہے۔ بہت سے متلاشیانِ علم و معرفت نے آپ سے نسبت ارادت قائم کی جن میں حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ کو شرفِ خلافت اور مسند نشینی بھی حاصل ہوا۔

21۔ حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ

(م 970ھ)

حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ کو سلوک و مستی گھر سے ہی حاصل ہوگئی تھی کہ آپ مولانا محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے جس گھر میں چشمہ فیض دن رات جاری ہو تو وہاں کے نونہال کیسے پیاسے رہ سکتے ہیں۔ اسی پارسائی کے ماحول میں 16 شوال 846ھ کو پیدا ہوئے درویشی کا سایہ عاطفت فیض رساں ہوا، اس لئے ابتدائے عمر ہی میں زہد و ریاضت کی منزلوں سے آشنا ہوگئے، خلوت نشینی کا ذوق بچپن ہی سے حاصل تھا، صحراؤں اور ویرانوں میں نکل جاتے اور کئی کئی روز کھائے پیئے بغیر مشغولِ عبادت رہتے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ صحرا میں تھے۔ کھانے کی کوئی چیز پاس نہ تھی، بھوک شدت اختیار کر گئی، قدرے بے چینی ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ حضرت خضر رحمۃ اللہ علیہ آگئے اور مولانا محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ کو در نیاز پر حاضر ہونے کا اشارہ دیا کہ وہاں جاؤ صبر و قناعت کا طریقہ سکھا دیں گے، حاضری کے لمحے سے پہلے تک پندرہ سال ریاضت و مجاہدے میں گزرے تھے اس لئے کندن تو بن چکے تھے اشارہ ملنا تھا کہ اپنے ماموں کے پاس حاضر ہوگئے۔ عالم روحانیت کی تمام منزلیں اپنے شیخ کے زیر سایہ طے کئیں اور جب مرشد کریم کا انتقال ہوگیا تو اُن کی مسند کے وارث ہوئے اور یہ سلسلہ فیض اسی قوت کے ساتھ جاری رہا، تنہائی پسند تھے، اختلاط ظاہری کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے اس لئے عام لوگوں کو آپ کی منزلت کی خبر نہ تھی۔

آپ درویشوں کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی ذات کو چھپانے

میں لذت پاتے ہیں آپ نے مسندِ ارشاد بچھانے کے بجائے بچوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا کہ عوام ایک قاری و استاد سمجھیں مگر نگہت کو کس قدر بھی اسیر کیا جائے وہ مہک دینے لگتی ہے۔آپ کے صاحبزادے اور مستقبل کے مسند نشین حضرت خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ایک درویش نے والد گرامی کے سامنے شیخ نورالدین خوانی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا، تذکرہ اس قدر دلپذیر تھا کہ میرے والد گرامی فرمانے لگے کہ بیٹا جب کبھی یہ بزرگ اس علاقے میں آئے تو ضرور ملوں گا، یہ ارادہ اتنا قوی تھا کہ جلد ہی خبر ملی کہ شیخ نورالدین خوانی رحمۃ اللہ علیہ آئے ہوئے ہیں، فوراً ہی ملاقات کے لئے تیار ہو گئے۔لباس تک تبدیل نہ کیا۔وہاں پہنچے تو شیخ نے بڑی محبت سے معانقہ کیا اور بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔پھر دونوں دیر تک مراقب رہے، کافی دیر کے بعد اجازت چاہی تو شیخ نے بڑی محبت سے رخصت کیا، بعد میں شیخ نے حاضرین سے پوچھا کہ اس علاقے کے طالبان حق خدمت میں آتے ہوں گے، عرض کیا گیا یہ کوئی شیخ تو نہیں ہیں استاد ہیں بچوں کو پڑھاتے ہیں۔شیخ نورالدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بڑے افسوس کا اظہار فرمایا اور سخت لہجے میں فرمایا کہ یہاں کے لوگ بھی کس قدر بے بصر ہیں کہ ایسے شیخ کامل سے استفادہ نہیں کرتے۔بس پھر کیا تھا شہرہ ہو گیا اور لوگ جوق در جوق حاضرِ خدمت ہونے لگے۔مجبوراً جلوت کا سماں پیدا ہو گیا مگر مزاج میں خلوت پسندی ہی رہی۔لوگوں سے ملتے تھے مگر ذاتی ذوق عزلت نشینی ہی میں تھا۔

حضرت شیخ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ اسم بامسمیٰ تھے، درویشی طبیعت کا اقتضاء تھی مگر پھر بھی جو حاضر ہوتا سلوک کی منزلیں اُس کے لئے آسان ہو جاتیں، لمبی عمر پائی اور ایک جہان کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔آخر 19 محرم 970ھ ماوراء النہر کے علاقے استفرار میں وفات پائی، یہ مقام جواب تک راہ حق کے مسافروں کے لئے جادۂ ہدایت ہے۔

22۔حضرت مولانا خواجگی امکنگی رحمۃ اللہ علیہ

(م 1008ھ)

حضرت خواجگی امکنگی رحمۃ اللہ علیہ امکنہ حدود بخارا میں ایک مرکزِ ولایت گھرانے میں پیدا ہوئے ولادت 918ھ کی ہے والد گرامی حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے خواجگی کہلاتے تھے۔امکنہ جائے ولادت کے حوالے سے امکنگی کہے گئے خاندان کی شہرت ایک علمی و دینی گھرانے کی حیثیت سے تھی جس میں شریعت کی پاسداری کا بڑا اہتمام تھا۔اس لئے طلبِ علم میں منہمک ہو گئے۔خوش قسمتی یہ ہوئی کہ درسیات کا علم گھر سے ہی دستیاب ہو گیا۔علوم دینیہ میں مہارت حاصل کی تو روحانیت کے فیضان کی طرف متوجہ ہوئے۔یہ کرم بالائے کرم ہوا کہ طریقت کی بھی ساری منزلیں اپنے والد گرامی سے ہی حاصل ہو گئیں اور انہیں کے مرید ہو گئے۔حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ اخلاص ومحبت کے تمام مقام طے کئے کہ قرب وجوار میں نیک نام ہوئے۔اگرچہ آپ کی طبیعت میں نمود ونمائش کا میلان نہ تھا مگر اربابِ سلوک نے پہچاننے میں دیر نہیں کی کہ یہ صداقت مسلمہ ہے۔

''مشک انست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''

والد گرامی کے انتقال پر مسند ارشاد کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور تقریباً اڑتیس سال تک اس پر متمکن رہے۔یہ عرصہ اشاعتِ دین، نشرِ خیر اور اصلاح عوام وخواص کا دورانیہ تھا۔ضعیف ہو چکے تھے مگر خدمتِ خلق کا جذبہ جوان رہا ہر آنے والے کی

خدمت کے لئے مستعد رہتے، مہمانوں کا بھی خیال رکھتے حتّٰی کہ اُن کی سواریوں پر بھی توجہ دیتے نقشبندی بزرگ تھے اس لئے نقشبندیت کی شناخت کا ہمیشہ خیال رکھتے۔ اپنے معمولات میں خواجہ نقشبند ؒ کی تقلید پر زور دیتے اس لئے ذکر بالجہر جو بعد کے مشائخ کے ہاں رائج ہو چکا تھا سے کلیتہً انکار کرتے اور ذکر خفی کو نقشبندیت کی شناخت قرار دیتے۔ اس طرح نماز تہجد جو خالصۃً بندے اور پروردگار کے درمیان کا معاملہ ہے۔ بعض صوفیاء کے ہاں اس کی جماعت کا رواج ہو گیا تھا مگر آپ نے اس کا بھی سختی سے رد کیا اور اسلاف کے طریقے کو حجت قرار دیا۔

ایک مرتبہ تین طالب علم اپنے دل میں الگ الگ خواہشات لئے حاضر ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کی روحانی منزلت کا اندازہ لگایا جائے۔ آپ نے دو طالب علموں کی دلی تمناؤں کو تو پورا کر دیا کہ ایک کی خواہش عمدہ کھانا تھا اور دوسرے کی اچھا پھل، یہ اگرچہ دربار سلوک کے مناسب خواہشات نہ تھیں مگر ان میں کوئی قباحت بھی نہ تھی اس لئے پورا کر دیا گیا، تیسرے کی خواہش نفسانی تھی کہ کوئی حسین سامنے آ جائے تو اسے پورا نہ کیا بلکہ فرمایا کہ یاد رکھو درویشوں نے جو کمالات بھی پائے ہیں وہ صاحب شریعت ﷺ کی اتباع میں پائے ہیں اس لئے ان سے کوئی کام خلاف شریعت سرزد نہیں ہو سکتا۔ واضح کر دیا کہ درویشی تو سراسر اتباع شریعت کا نام ہے۔ مزید فرمایا کہ کسی مباح کام کے لئے بھی حاضر نہ ہونا چاہیے کہ شاید توجہ نہ دی جائے اور آنے والا بددل ہو کر صحبت کی برکات سے محروم رہ جائے۔ پھر ایک واضح ارشاد فرمایا کہ اصحابِ معرفت کے ہاں کرامات کا اعتبار نہیں ہوتا اس لئے ایسی خواہش ہی نہ کرنی چاہیے۔

روایت ہے کہ رات کے وقت کہیں جا رہے تھے ایک ساتھی کے پاؤں ننگے تھے اچانک کانٹا چبھ گیا اور وہ درد محسوس کرنے لگا اور خیال کیا کہ اگر جوتا نصیب تھا تو یہ تکلیف نہ ہوتی اس پر فرمایا۔

"اے برادر جب تک کانٹا نہیں لگتا پھول ہاتھ نہیں آتا"

حضرت خواجگی امکنگی ؒ ایسے درویش تھے کہ اپنے اظہار سے بچتے تھے مگر آپ کی عظمت و شان کا ہر ایک کو اعتراف تھا۔ سلسلہ نقشبندیہ کا عمومی دستور یہ رہا ہے کہ اس کے مشائخ کا رابطہ شاہانِ وقت سے بھی استوار رہا ہے کہ ان کے خیال میں ایک امیر یا بادشاہ کا راہ راست پر آ جانا بہت سی حسنات کا سبب بنتا ہے لیکن ان رابطوں میں مادی خواہشات اور دنیاوی ضروریات کے حصول کا مقصد نہ ہونا چاہیے، دین کا فروغ اور نیکی کی اشاعت ہی مطلوب رہے اور اس حوالے سے کئی مشکل مقامات بھی آتے ہیں کہ درباروں میں شر پھیل رہا ہو تو اُس کا روکنا بھی صاحب دل کا فرض ہوتا ہے۔ ایسا فرض نبھانے میں کئی جان لیوا مراحل بھی آ سکتے ہیں اس لئے درویش کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

خواجگی امکنگی ؒ کے دور میں والی ماوراء النہر پیر محمد خاں نے والی سمرقند باقی خان پر حملہ کیا یہ دو حکمرانوں کا ٹکراؤ تھا۔ مسند نشین بوریا نشین ایسے تصادم سے کنارہ کش رہتے ہیں مگر یہ ایسا حملہ تھا جو ہوس جاہ کا شاخسانہ تھا کہ ایک طاقت ور اس زعم میں حملہ کر دے کہ مقابل کے پاس صرف چودہ ہزار سپاہ ہے۔ اور وہ پچاس ہزار کا لشکر رکھتا ہے یہ طاقت ور کا کمزور پر حملہ تھا۔ کمزور گھبرا کر حضرت خواجہ امکنگی ؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت خواجہ ؒ نے ایک ہوس ناک یلغار کا مقابلہ کرنے کا

فیصلہ کرلیا، جارح کو سمجھایا گیا کہ یہ طرز جفا مناسب نہیں ہے مگر اقتدار کا نشہ خود فریبی کو جنم دیتا ہے۔ جب ظالم کا یہ رویہ دیکھا تو ظلم کے سامنے آنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

تخت و تاج تو نہ تھا۔ ایک پاکیزہ مسند تھی اس پر بیٹھ کر اپنے رب کو پکارا اور باقی محمد خاں کی مدد کا اعلان کردیا۔ اعلان سے پہلے وعدہ لیا گیا کہ خلوص دل سے سابقہ اعمال کی توبہ کرو، آئندہ عدل و انصاف قائم کرنے کا عہد باندھو۔ بس یہ وعدہ کرلو تو جاؤ کامیابی تمہاری ہوگی۔ کس طرح سمجھا دیا گیا کہ آخری کامیابی ظلم سے توبہ اور انصاف کے بول بالا کرنے سے آتی ہے۔ لشکر مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ اور خود حضرت امکنگی رحمۃ اللہ علیہ اپنے درویشوں کے ساتھ ہم سفر ہوئے، اعتماد تھا کہ یہ صورتِ کامیابی ہے۔ آخر ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی تائید تو کفر کی مجموعی یلغار کو روکنے میں کامیاب ہوگئی تھی بس پھر کیا ہوا۔ حضرت ایک مسجد میں اپنے خالق و مالک کے حضور گریہ کناں ہوئے اور نصرت نے بڑھ کر لشکر کے قدم چوم لئے اور اس واقعہ میں کئی باتیں نصیحت افروز تھیں ایک یہ کہ لشکر کم بھی ہو تو گھبرانا نہیں چاہیے، استقامت چاہیے اور نیکی کے فروغ کا عزم چاہیے۔ دوسرے یہ کہ لشکر آگے بڑھے تو اس کا پشت پناہ وہ ہونا چاہیے جس کا خلوص بارگاہِ صمدیت میں مقبول ہے۔

عبداللہ خاں والئ توران کو بھی خواب میں طاقت کا نشان ایک تلوار بارگاہِ رسالت سے لے کر عطا کی، صاف پیغام تھا کہ قوت کا اظہار بھی فرمانِ رسالت کے مطابق ہونا چاہیے کہ تخت و تاج ذاتی نمود کا ذریعہ نہیں ہوتے، دین کی قوت کے ہم عناں رہنے جائیں۔ اس عملی اصلاح کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوت عوام کی محافظ بن گئی اور دین کو فروغ حاصل ہوا۔ حضرت نے 90 سال عمر پائی یہ سارا عرصہ عوام و خواص کی

اصلاح کے لئے کوشاں رہے۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ جنہیں آپ کا جانشین ہونے کا اعزاز حاصل ہے کو ایک خط لکھا جو دراصل الوداعی خطاب تھا۔ اس خط میں دو شعر بھی درج کئے جو مطابق حال تھے فرمایا۔

زماں تازماں مرگ یاد آیدم — ندانم کنوں تاچہ پیش آیدم

خدائی مبادا مرا از خدا — دگر ہر چہ پیش آیدم شایدم

مجھے ہر لحظہ موت یاد آرہی ہے — میں اب نہیں جانتا کہ کیا پیش آئے گا

مجھے خدا سے خدائی نہیں چاہیے — اس کے علاوہ جو بھی پیش آئے منظور ہے

ایک روایت میں دوسرے شعر کا پہلا کلمہ خدائی کے بجائے جدائی ہے جس سے یہ مفہوم بنے گا کہ مجھے خدا سے جدائی نہیں چاہیے باقی جو کچھ بھی ہو مجھے منظور ہے۔

اس خط کے لکھنے کے بعد صرف حضرت باقی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچنے کا انتظار کیا جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ آپ نے امکنہ ہی میں 22 شعبان 1008ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

23۔حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

(م 1012ھ)

تصوف کی جو تحریک ابتدائے اسلام ہی میں توجہ کا مرکز بن گئی تھی آہستہ آہستہ حالات کے تقاضوں کے تحت فروغ پذیر رہی۔اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے اکابر نے حصہ لیا۔حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے سلسلہ نقشبندیہ کا آغاز ہوا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قادری، چشتی ،سہروردی سلاسل کی ابتداء ہوئی۔اسلام کا پیغام جن جن خطوں تک پہنچتا رہا ،صوفیاء کرام بھی ساتھ ساتھ تقویم دین کا فریضہ نبھاتے رہے، برصغیر پاک وہند جب اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہوا اور محمد بن قاسم کے بڑھتے ہوئے قدم برصغیر کے بہت سے علاقوں میں انقلاب اسلامی کے محرک بنے تو نومسلموں کا اسلام کے عقائد وارکان پر اعتماد راسخ کرنے کے لئے صوفیاء کرام بھی برصغیر آنے لگے۔خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اہل نظر عرب علاقوں سے باہر بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھانے لگے، جہاں جہاں اسلام معاشرتی حقیقت بنتا گیا صوفیاء کی مساعی نمایاں ہونے لگی۔اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس دور تک عالم اور صوفی کے درمیان خط تفریق اتنا گہرا نہ تھا جو بعد میں محسوس ہونے لگا۔حضرت اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ متقدمین میں سے ہیں جن کے وجود میں شریعت وطریقت ایک اکائی کی طرح نمایاں رہے۔شیخ حسام الدین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی صوفیاء میں سے تھے۔ان کے بعد ایک ایسا وجود سامنے آیا جہاں تمام

اہل نظر نیاز مندی کو اپنی سعادت سمجھتے رہے حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ۔431ھ میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ لاہور تشریف لائے تو برصغیر میں تصوف کی تحریک کا باقاعدہ اجراء ہوا۔پھر راستہ کھل گیا۔حالات بھی موافق ہو گئے کیونکہ عالم اسلام چنگیز خاں اور ہلاکو خان کی ستم رانیوں کا نخچیر تھا، اسلامی تہذیب کے مراکز اجڑ رہے تھے، علماء تختہ ستم بن رہے تھے، قتل وغارت کا ایسا بازار گرم تھا کہ اشاعتِ اسلام کے لئے جو سکون درکار تھا ناپید ہو گیا تھا اس لئے علماء وصوفیاء مراکز تبدیل کر رہے تھے۔اُس دور میں برصغیر ہی وہ خطہ تھا جہاں راحت وسکون میسر تھا اس لئے صوفیاء کرام برصغیر کا رُخ کرنے لگے، ہر سلسلہ تصوف یہاں وارد ہوا۔حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ۔(م 632ھ) چشتیہ سلسلہ کا فیضان لئے براستہ لاہور اجمیر آ گئے اور فروغ اسلام کے مشن کے لئے ہمہ تن وقف ہو گئے پھر آپ کے خلفاء نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں وہ خدمات انجام دیں کہ سلسلہ چشتیہ تمام سلاسل کا پیش رو قرار پایا اور تعلیمات تصوف عمومی ایقان کا ذریعہ بنیں، آپ کے کچھ عرصہ بعد سہروردیہ سلسلہ کے سرخیل حضرت خواجہ بہاؤالدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ۔(م 661ھ) ملتان شریف لے آئے۔ان کی آمد سے شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ۔(م 632ھ) کی تعلیمات سے برصغیر متعارف ہوا۔یہ دونوں سلاسل برصغیر میں خوب پھیلے بعد میں خلفاء عظام نے یہ روحانی پیغام قریہ قریہ بستی بستی پھیلا دیا ان سے کچھ سالوں بعد سلسلہ قادریہ بھی پورے جلال کے ساتھ برصغیر میں وارد ہوا۔شاہ محمد غوث قادری رحمۃ اللہ علیہ۔(887ھ) نے اُچ کو اپنا مرکز بنایا۔اور یہ سلسلہ برصغیر کے کونے کونے میں پہنچا۔

برصغیر میں یہ تینوں سلسلے بیک وقت نشر اسلام کے لئے وقف تھے برصغیر کا

عمومی ماحول اسلامی تعلیمات سے آشنا ہو چکا تھا اس لئے تبلیغ دین کو بڑا موافق ماحول ملا، سلاطین کا دور تصوف کے پھیلاؤ کے لئے خاص طور پر معاون تھا۔ بڑے بڑے سلاطین درگاہوں پر حاضری دیتے، عقیدت کا اظہار کرتے اور مصائب کے وقت چارہ سازی کے لئے اعانت کے طلب گار ہوتے، التمش کا دور تو خصوصیت سے ساز گار تھا کہ وہ خود سراپا عقیدت تھا حتّٰی کہ ننگے پاؤں استقبال کو جاتا اور مسندِ اقتدار کو فرشِ عقیدت بنا دیتا جب عالم اسلام ظالمانہ یلغار کی زد پر تھا۔ بڑے بڑے مقتدر پابند سلاسل ہو رہے تھے۔ گردنیں کٹ رہی تھیں۔ صرف بغداد میں لاکھوں معصوم لوگ تہہ تیغ کر دیئے گئے تھے، منگول حکمران ہر مخالفت کا علاج صرف اور صرف گردن زدنی سمجھتے تھے، علماء کی کثیر تعداد شہید ہوئی حتّٰی کہ شاعر تک مارے گئے، ایسی زبوں حالی میں امت مسلمہ کو ایک ہی پناہ گاہ نظر آ رہی تھی اور وہ برصغیر میں تھی۔ اس لئے قافلہ در قافلہ طبیبانِ قلب ونگاہ برصغیر آئے۔ التمش ان سب کا استقبال کر رہا تھا اور مطلق العنان حکمران ہونے کے باوجود ہر آنے والے کے سامنے بچھا بچھا جاتا تھا۔ یہی روش اُسے اہل دل کے قافلے کا ایک فرد بنا گئی۔

سلاطین کے بعد مغلیہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ عقیدت مندی میں مغلیہ حکمران بھی کم نہ تھے۔ مگر مرکز سے دوری اور ماوراء النہر کی بدحالی کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ برصغیر کا غیر مسلم بھی بیدار ہو چکا تھا اور اپنی پوری طاقت اسلامی تعلیمات میں انتشار پیدا کرنے پر لگا رہا تھا۔ ہمسائیگی کے اثرات بھی گھمبیر تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہی ایوانوں میں غیر مسلموں کی آمد ورفت ضرورت سے بڑھ گئی تھی۔ اس لئے نظریات وعقائد میں جھول آ رہا تھا۔ یہ بھی قدرت کا عجب

فیصلہ ہے کہ جب نشرِ دین کی مہم کامیاب ہو چکی تھی۔ اور چشتی، سہروردی اور قادری صوفیاء تبلیغِ اسلام کے مشن میں سرخرو ہو چکے تھے اب جو مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اشاعت سے زیادہ ترسیخ عقائد کا تھا کہ ہندو ویدانت اور مقامی جدلیّت نے ذہنوں کو الجھا دیا تھا۔ مسلمان تو سب کہلانے لگے تھے مگر اسلامی تعلیمات من پسند تاویلوں کے حصار میں تھیں۔ نت نئے فرقے پیدا ہو رہے تھے جو باطل نظریات کو اسلامی نظریات کے ساتھ یوں جوڑ دیتے تھے کہ ذہنی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ اب ایسے سلسلہ تصوف کی ضرورت تھی جو صیانت عقائد اور تطہیر اعمال کا فریضہ انجام دے۔ قدرت کا فیصلہ تھا کہ اب سلسلہ نقشبندیہ برصغیر میں متعارف ہو جس کی صدیوں سے شناخت یہ تھی کہ وہ کشف وکرامات کو شریعت مطہرہ کا پابند سمجھتا تھا جس کے نزدیک خوارقِ عادات منزلت کی دلیل نہیں تھے بلکہ علامتِ شرف اتباعِ سنت ہے۔ غیروں کو دعوتِ اسلام دینا لازم ہے کہ اسلام تمام انسانیت کا دین ہے۔ مگر یہ بھی ضروری ہے کہ جو حظیرہ اسلام میں آئے وہ اپنے سب سابقہ عقائد واعمال سے یکسر تائب ہو کر آئے اور اسلام لا کر ایک نئے وجود کی صورت سامنے آئے تاکہ اسلام کا مطلوب انسان ظہور پذیر ہوا۔ نقشبندی صوفیاء کی شناخت ہی یہ تھی اس لئے حکمت الٰہی یہی تھی کہ یہ اُس وقت برصغیر آئیں جبکہ ان کی ضرورت کا ہر کہیں احساس نمایاں ہو۔ برصغیر میں اسلام کی بقا کا انحصار اشاعت سنت پر تھا۔ اس پر ہر سلسلہ تصوف توجہ دیتا رہا ہے کیونکہ تصوف کا مقصود ہی اسلامی اقدار ونظریات کی تعمیر وحفاظت ہے۔ مغلیہ دورِ حکومت اپنی ہزار توانائیوں کے باوجود ایسے دھندلکوں کا شکار ہوا جا رہا تھا جہاں نام تو باقی تھا مگر روح مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ اکبر کا دور اس حوالے سے خصوصی توجہ کا مستحق تھا کہ

بے علمی طاقت کا خمار اوڑھے یلغار کر رہی تھی۔ دینِ الٰہی ایک ملغوبہ تھا جو بھگتی تحریک کا حکومتی بروز تھا۔ دین خالص مطلوب نہ رہا تھا۔ ایک معجون تیار کیا جا رہا تھا جو بد مست کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ توحید کا عقیدہ بھی تعدد الٰہ کے حصار میں آ رہا تھا اور ایمان بالرسالت کا لزوم معرضِ خطر میں تھا، بدقسمتی سے کئی ایک گروہ دریافت ہو گئے۔ جو نعرہ تو وحدانیت کا لگا رہے تھے مگر اسلام کے تصور توحید سے کوسوں دور تھے۔ ایک اور قیامت یہ جنم لے رہی تھی کہ تلاشِ الٰہ میں عقیدہ رسالت نظر انداز ہو گیا تھا۔ شریعت کی پاسداری لازم نہ رہی تھی بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ شریعت تو مبتدیوں کے واسطے ہے۔ طریقت وحقیقت کے راہی، شریعت کے پابند نہیں ہیں۔ ایسے خیالات آہستہ آہستہ اس قدر قوی ہو گئے کہ نبوت کی ضرورت سے بھی انکار ہونے لگا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی میں ہی ایسے باطل نظریات کا احساس ہو گیا تھا جس پر آپ نے سخت ردعمل بھی دیا تھا مگر یہ ابھی ابتدائی نوعیت کا انحراف تھا، مغلیہ دور میں یہ انحراف، اسلام کے مدمقابل آ گیا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جو تطہیر اذہان کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے لئے قدرت نے نقشبندی طرز سلوک کی صورت میں حفاظت کا سامان پیدا کر دیا۔ ان باطل نظریات کا توڑ کیسے ہوا اور صوفیاء کی تگ ودو کا حاصل کیا ہوا۔ یہ ہم آئندہ گفتگو میں واضح کریں گے۔ ابھی ہماری گفتگو کا دائرہ کار اُن صوفیاء کے بارے میں تعارف تک محدود ہے جو صیانت دین کی جدوجہد کا ہر یاول دستہ بنے۔ ان میں اولیت حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، انہیں کے حالات کے تذکرے سے ابتداء کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ 5 ذوالحجہ 971ھ کو کابل میں پیدا ہوئے والد گرامی

کا نام قاضی عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ سمرقند کے رہنے والے تھے مگر کابل میں رہائش پذیر تھے۔ زہد وتقویٰ کے حامل یہ بزرگ صاحب کرامت تھے اور کابل کے صاحب درد میں شمار ہوتے تھے، کابل میں مستقل سکونت کی یہ وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہاں آپ نے شادی کر لی تھی۔ خود قریش کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر بیوی، حضرت شیخ عمر یاغستانی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے تھی جو حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے نانا تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ نانا خاندان سادات میں سے تھے۔ اس طرح یہ خاندان نجیب الطرفین تھا جو ورع اور حسن معاشرت میں نیک نام تھا، قاضی عبد السلام شیخ وقت تھے اور صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔

خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ بچپن ہی سے نیک خصال تھے، طبعی رجحان سے ہی نجابت وشرافت کے نشان ہویدا تھے، تنہائی پسند تھے اور غور وفکر کی عادت تھی، والد گرامی نے حفظ قرآن پر لگا یا۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا، پھر والد گرامی کابل کے ایک نامور عالم مولانا محمد حلوائی کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔ قرآن مجید حفظ تھا اور ضروری فقہی مسائل بھی خواجہ سعد کے مکتب سے سیکھ آئے تھے اس لئے علمی پیش رفت قابل اعتماد تھی۔ مولانا صادق حلوائی کچھ عرصہ بعد کابل سے ماوراء النہر منتقل ہو گئے تو آپ بھی ساتھ ہی چلے گئے وہاں طلب علم میں مصروف ہو گئے۔ جلد ہی متداول علوم پر دسترس حاصل ہو گئی ہم مکتب طلبہ میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی، ابھی اور پیش رفت درکار تھی مگر طبیعت کا رجحان بدل گیا، عزلت نشینی کا ذوق فراواں ہوا، کہا جاتا ہے کہ اسی کشمکش میں تھے کہ علم کا حصول جاری رہے یا ریاضت کی دنیا آباد کی جائے کہ ایک دن اچانک ایک مجذوب نے یہ شعر سنایا۔

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را

آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

کہ کنز الدقائق اور ہدایہ میں تو خدا نظر نہیں آتا

دل کا آئینہ دیکھو کہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے

طبیعت پہلے ہی اس راہ پر چل پڑی تھی۔اس شعر سے مہمیز ملی اور درسیات سے الگ ہو کر کسی مرشد کی تلاش میں نکل پڑے۔اس تلاش میں کہاں کہاں گئے اور کن کن سے ملے،اس کا احوال خود بیان کیا ہے۔کہ

خواجہ عبید اللہ ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ سمرقند میں تھے،اگرچہ حضرت خواجہ آپ کی نوعمری کے باعث ابھی راہ سلوک پر گامزن نہ کرنا چاہتے تھے مگر ارادے کی پختگی اور مقصد کی شدید دھن دیکھی تو استقامت کی دعا فرمائی حضرت امیر عبداللہ خلجی ؒ کی خدمت میں بار بار حاضری دی ،مختلف درویشوں سے شرف ملاقات کے بعد 999ھ میں کشمیر آ گئے اور حضرت بابا والی ؒ کی خدمت میں حاضر رہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ تلاشِ مرشد میں دہلی بھی آئے تھے۔یہ بھی روایت ہے کہ لاہور میں بھی قیام رہا تھا اور یہاں کے درویشوں اور مجذوبوں کی تلاش جاری رہی تھی،پھر لاہور سے واپس ماوراء النہر تشریف لے گئے بلخ و بدخشان بھی گئے اور سمرقند بھی۔اثنائے سفر میں ایک آواز آئی کہ ”اے بیٹے ہماری نظریں تمہارے انتظار میں ہیں“ یہ آواز خواجہ امکنگی ؒ کی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔فوراً خواجہ امکنگی ؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے،تین دن صحبت میں رہے،عنایات کی بارش ہونے لگی اور سلسلہ نقشبندیہ کے سلسلۃ الذھب کا حصہ بن

گئے یہ برصغیر کا دوسرا سفر تھا جو حضرت خواجہ امکنگی ؒ کے حکم پر کیا،فرمایا ہندوستان چلے جاؤ تاکہ وہاں کے متلاشیان راہ طریقت آپ کی رہنمائی میں یہ سفر مکمل کر سکیں۔آپ پہلے بھی ہندوستان آ چکے تھے اور سپاہ میں شرکت کی ترغیب بھی ملی تھی مگر ابھی سفر باقی تھا اس لئے واپس چلے گئے۔اب دوبارہ حکم ملا تو تردد ہوا۔کہتے ہیں استخارہ کیا ایک خوبصورت طوطی شاخ پر بیٹھا دیکھا،خواہش ہوئی کہ میرے ہاتھ پر آ جائے اور وہ اڑ کر آ گیا۔فرماتے ہیں میں نے اُس کے منہ میں لعاب دہن ڈالا اُس نے میرے منہ میں شکر ڈالی ،اس استخارہ کا حضرت خواجہ امکنگی ؒ کے ساتھ ذکر ہوا تو فرمایا طوطی ہندوستان کا پرندہ ہے۔ چلے جاؤ کہ وہاں تمہاری برکت سے ایک مرد بزرگ کا ظہور ہو گا۔اس سے تم بھی بہرہ مند ہو گے۔بس یہ پیغام کافی تھا آپ روانہ ہوئے اور برصغیر آ گئے ایک سال لاہور میں قیام کیا پھر دہلی روانہ ہو گئے ،دہلی میں قلعہ فیروز شاہ میں رہے۔ایک مسجد میں ڈیرا لگایا اور وہیں چشمہ فیض نقشبندیت جاری ہوا،اس فیض کا شہرہ جلد ہی پورے برصغیر میں پھیل گیا۔عوام اور خواص سبھی در پر حاضر ہونے لگے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ برصغیر کے دینی وسماجی ماحول سے آگاہ تھے کہ پہلے بھی برصغیر آ چکے تھے مگر اب مستقل سکونت کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔برصغیر کا سماج مسلم اور غیر مسلم میں منقسم تھا مگر بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ مسلم معاشرہ بھی غیر مسلم تہذیبی روایات کا نخچیر ہوتا جا رہا تھا اس لئے آپ کو سماجی تناظر کے مطابق حکمت عملی طے کرنا تھا آپ نے اصلاحِ معاشرہ کی اساس تین ستونوں پر رکھنے کا عزم کر لیا خود فرماتے تھے کہ ہمارے طریقے کا مدار تین باتوں پر ہے یعنی

1۔اہل سنت کے عقائد پر ثابت قدمی۔ 2۔آگہی۔ 3۔عبادت

اس لئے آپ کی خصوصی توجہ عقائد کی تقویم پر رہی فرماتے ہیں ''درست عقیدہ، احکام شریعت کی رعایت، اخلاص یعنی حق تعالیٰ کی طرف دائمی توجہ سب سے بڑی دولت ہے، کوئی ذوق ووجدان اس نعمت کے برابر نہیں''۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

''جو شخص درست اعتقاد اور صحیح نیت کے ساتھ شریعت پر عمل کرے تو اگرچہ اُسے اس زندگی میں ذوق ووجد حاصل نہ ہو، موت کے بعد ضرور عطا ہوں گے'' اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ

''ایسے شخص کو اس جہاں میں سکرات الموت کے وقت یہ شرف حاصل ہوجائے گا''۔

اخلاق وعادات:

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ تقریباً تین سال دہلی میں مسند ارشاد پر متمکن رہے، بظاہر یہ عرصہ بہت مختصر ہے کہ فیض وعطا کی ترسیل کو ایک وقت درکار رہتا ہے مگر آپ نے وہ کام جو چالیس پچاس سالوں کی محنت سے سرانجام پاتا ہے تین سالوں میں کر دکھایا، کام کی عظمت یہ ہے کہ آپ کی آمد سے نقشبندی سلسلہ ابتداء کر رہا تھا اور آپ کی زندگی ہی میں یہ سلسلہ شرق وغرب پر محیط ہوگیا تھا اس عمومی پذیرائی کے تمام اہل دانش ومعرفت گواہ ہیں شیخ محمد بن فضل اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

''آپ کی بزرگی کا یہی نشان کافی ہے کہ آپ تین چار سال سے زیادہ

بندگان خدا کی ہدایت میں مشغول نہیں رہے مگر آج تک آپ کے آثار وبرکات روز افزوں ہیں۔1

یہ برکات آپ کے درجہ رسوخ کا نتیجہ تھیں، ذاتی طور پر تنہائی پسند تھے، اپنے حوالے سے بلند بانگ دعاوی سے اجتناب کرتے اگر کوئی شخصیت کے آثار دیکھ کر حاضر خدمت ہو بھی جاتا تو حتی المقدور کوشش کرتے کہ کسی اور کے پاس بھیج دیں، روایت ہے کہ ایک خراسانی نوجوان حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر معتکف تھا اور راست روی کا طلب گار تھا ارشاد ہوا کہ ایک نقشبندی بزرگ شہر میں آئے ہوئے ہیں اُن کو اپنا پیشوا بنالو، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے حسب معمول کسر نفسی سے کام لیا اور کسی اور دربار میں حاضری کا ارشاد فرمایا۔ وہ رات بھر پھر راہنمائی کا طالب ہوا تو اشارہ تھا کہ یہی وہ بزرگ ہیں یہ اظہار عجز ہے کہ فروتنی اُن کی عادت بنے وہ پھر آیا اور آپ کے دربار کا ہوکر رہ گیا۔

رحم وکرم صوفیاء کے مزاج کا حصہ ہوتا ہے آپ کی طبیعت میں یہ صفات اس قدر نمایاں تھے کہ ہر حاضر ہونے والا اس سے فیض یاب ہوتا۔ شرط صرف یہ تھی کہ سالک، شریعت مطہرہ پر کاربند ہو۔ حکومتی وزراء اور عمائدین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر آپ کی شان بے نیازی بہر صورت قائم رہی۔ وہ لوگ تحائف پیش کرتے مگر آپ قبول کرنے میں تامل فرماتے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ عبدالرحیم خان خاناں نے ایک لاکھ سکہ رائج الوقت خدمت عالیہ میں پیش کیا کہ لنگر وغیرہ کے لئے کام آئے گا مگر آپ نے نہایت محبت ومتانت سے واپس کر دیا کہ رعایا کا اس قدر مال اپنے تصرف میں نہ لانا چاہتے تھے۔ عقیدت مند جب بھی کوئی ہدیہ پیش کرتے تو اول تو معذرت

کرتے اگر مجبور ہوجاتے تو اُس سے زیادہ اپنے پاس سے اُس میں ملا کر حاجت مندوں کو تقسیم فرمادیتے اور اپنے اسلاف کی بے نیازی کو قائم رکھتے، یہی بے رغبتی تھی جو ہر معاملے میں جاری رہی، کھانے میں کسی تکلف کو ملحوظ نہ رکھتے بلکہ غیر مرغوب کھاتا بھی سامنے آجاتا تو ناپسندیدگی کا اظہار نہ فرماتے۔ لباس کے بارے میں بھی کسی خاص اہتمام کا خیال نہ فرماتے رہائش بھی سادہ سی تھی دہلی میں سارا قیام ایک معمولی سے گھر میں رہا۔

جذب ووجد کا اظہار نہ فرماتے مگر طبیعت میں ایسا خروش تھا کہ مصاحبین کو اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا۔ کتنی مرتبہ حاضر دربار ہونے والے آپ کی کشش باطنی سے گھائل ہوئے حتّٰکہ نماز کی حالت میں پہلو بہ پہلو کھڑے ہونے والے اندرونی جذبوں کے اسیر ہوجاتے اور بعض تو اس کی تاب نہ لاسکتے، خود اپنا عمل بھی عزیمت کا تھا، رخصت کو اپنے لئے وجہ جواز نہ بناتے، ذکر خفی کے قائل تھے۔ ذکر بالجہر تو دور کی بات تھی اسم ذات اللہ کو بھی بلند آواز سے پکارنا مناسب نہ سمجھتے تھے ایک مرتبہ حاضرین میں سے ایک نے مستی میں آکر زور سے پکارا ''اللہ'' آپ نے فوراً روک دیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس آیا کرو تو مجلس کے آداب کا خیال رکھا کرو۔

آپ فقہی مسلک کے حوالے سے خالصۃً حنفی تھے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ خیال آیا کہ سورہ فاتحہ کی بہت تاکید ہے اس لئے اس تاکید کے پیشِ نظر امام کے پیچھے پڑھنے لگے تو خواب میں امام ابوحنیفہ ؒ نظر آگئے فوراً فاتحہ خلف الامام کا وہ اصول اپنالیا جو مسلک حنفی کے مطابق تھا، حنفیت کا اس قدر خیال تھا کہ اپنے متوسلین کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے یہ عجب اتفاق ہے کہ مشائخ نقشبندیہ سارے کے سارے حنفی

المسلک تھے آپ نے اپنے طریقہ ارادت کو حضرت صدیق اکبر ؓ کے طریقِ ارادت کا مظہر قرار دیا ہے۔ اس لئے طریقے کے تمام وظائف واعمال کو محبت کا ہی فیضان سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

طالب اور مرشد کی مثال روئی اور آتشی شیشہ اور آفتاب کی ہے جس طرح روئی آتشی شیشہ کے مقابل ہوکر آفتاب کی حرارت وصول کرتا ہے اسی طرح سالک اور مرشد کی مثال ہے کہ سالک مرشد کے آئینے کے مقابل آکر حق تعالیٰ کی تجلیات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہ طریقہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا ہے کہ آپ کو رسول اکرم ﷺ سے محبت وارتباط کمال کی حد تک تھا اور آپ نے اسی راہ سے فضل عظیم پایا تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ نے صرف چالیس سال کی عمر پائی، یہ جوانی کے دن تھے آپ کے معمولات اور طرز زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے یہ مختصر سی زندگی ایک مسافر کی طرح گزاری ہے۔

کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ۔ 2

یعنی دنیا میں اجنبی یا مسافر بن کر رہو، منزلِ خلد جس کے پیشِ نظر ہو وہ دنیا بھی یوں گزارتا ہے جیسے میدانِ حشر میں کھڑا ہو۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا تھا۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْ

کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔

حضرت خواجہ ؒ کو یہ سبق حضرت سیدنا صدیق اکبر ؓ کے طرز حیات

سے ملا تھا کہ آپ کے بارے میں سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

”جو بھی یہ ارادہ کرے کہ کسی مردے کو سطح زمین پر چلتا ہوا دیکھ لے اُسے چاہیے کہ ابوقحافہ (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے یعنی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے“۔

اس قدر محتاط زندگی ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی نامہ اعمال یوں لپیٹ لیا گیا ہے جیسے مرنے والے کا لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا آخری فیصلہ بھی اُن کی زندگی ہی میں ہو جاتا ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں کھڑے یہ اعلان فرما رہے تھے کہ ابوبکر جنت میں جائے گا اور نو دیگر اصحاب کے بھی نام لئے تو کیا ثابت ہوا کہ آج تک کا نامہ اعمال ہی فیصلے کے لئے کافی ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اسی نوعیت کی زندگی گزارتے رہے۔ للہیت سے بھرپور خدمت خلق میں ہمہ تن مشغول اور مقصدیت سے ہمہ تن فیض یاب، نہ کسی انسان کو دکھ دیا اور نہ کسی حیوان کو، سراپا کرم زندگی ایسی زندگی، تھوڑی ہو تو بھی طویل لگتی ہے، ذرا سوچئے وہ کیا دردمند وجود ہوگا جو سردی کی رات لحاف سے باہر صرف اس لئے گزار دے کہ ایک بلی سردی کی وجہ سے اُس کا لحاف میں گھس گئی ہے۔ ایثار و قربانی کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ کیا ہوگا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو متوسلین کی کثرت کی حرص نہ تھی، آپ تو دامنِ کرم میں لیتے ہوئے کئی امتحانات سامنے رکھتے تھے، سابقہ گناہوں سے توبہ تعلق کی خشتِ اول تھی پھر حسبِ حال اورادوظائف تلقین فرماتے، یہ طرز تلقین اس قدر کارگر تھا کہ مبتدی چند دنوں ہی میں سلوک کی انتہائی منزلیں طے کر جاتا، زیادہ تر ذکر قلب کی نصیحت فرماتے کہ یہ نقشبندیت کی شناخت ہے تاریخ جذب گواہ ہے کہ

بعض اوقات ایک ہی نظر میں دلوں میں ہنگام بپا کر دیتے، یوں محسوس ہوتا کہ آپ کا فیضان اس قدر شعلہ بار ہے کہ لمحوں میں وجود خاکی کو خاکستر کر دیتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کئی کرامات ظہور پذیر ہوئیں اور اس تیزی سے ہوئیں کہ لمحے شمار کرنا پڑتے ہیں۔ مختصر زندگی اس قدر فیض رساں تھی کہ طوالتِ عمر بھی مقابل نہیں آسکتی، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فیض تو وہ تھا جس کی برکات برصغیر ہی میں نہیں پورے عالم اسلام تک پہنچیں، برصغیر آمد کی ابتداء ہی اس اشارے سے ہوئی تھی کہ ایک طوطی، دستِ مبارک پر چہچہائے گا۔ وہی ہوا اور شاید حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہندوستان آنا اسی تسلسلِ فیض کے اجراء کے لئے تھا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت میں جہاں آپ کے روحانی رویوں کا عمل دخل تھا وہاں وہ شہادتیں بھی تھیں جو دہلی کے کوچہ و بازار میں عام ہو رہی تھیں۔ خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ جو سلطنتِ دہلی کے روحانی تاجدار تھے کا پیغام بھی یہی تھا کہ ایک نقشبندی بزرگ صاحبِ عزیمت ہے اُن کے در پر حاضر ہو جاؤ، یہ خبر فضاؤں میں بھی تھی اور روحانیت کی جولاں گاہوں میں بھی حتّٰی کہ آپ کا ذکر ہر صاحب دل کے ہاں عام ہو گیا صاحب زبدۃ المقامات مولانا محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ ایک روز ایک مسجد کے کسی کونے میں تنہا بیٹھے تھے کچھ فاصلے پر ایک فقیر دوسرے فقیر کے ساتھ اولیاء اللہ کا تذکرہ کر رہا تھا اسی گفتگو کے دوران ایک نے کہا اُس نے اپنی عمر میں ایک شخص دیکھا ہے جو نہایت بے نفس اور بے مثل بردبار ہے۔ پھر اُس نے خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا۔ 3

اس علو مرتبت کے حوالے سے کبھی ناپسندیدہ صورتِ حال بھی پیدا ہوتی کہ

درویشوں کے مزاج میں فوری قبولیت کا میلان نہیں ہوتا مگر آپ کا طرزِ عمل ہمیشہ عاجزانہ رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ تسلیم کی منزل دشوار نہ رہی۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں ایام میں حاضر دربار ہوئے۔ دیکھتے ہی جوانی کا خواب اور سفرِ برصغیر کے حکم کی توجیہہ سمجھ میں آ گئی پھر تو آپ نے ہر آنے والے سالک کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا، حضرت مجدد کو اپنا نائب مقرر کر دیا، یہ بھی عجیب حکمت کی بات ہے کہ مختصر دورانیے میں مریدین کی تعداد اس قدر زیادہ ہوئی کہ ہر طرف نقشبندی پرچم لہرانے لگا، خلفاء کی تعداد بھی عام معمول کے مطابق زیادہ تھی۔ تعداد کے علاوہ یہ شرف بھی آپ کو ہی حاصل ہوا کہ خلفاء میں ایسے نامور بزرگ بھی شامل ہیں جو برصغیر کی علمی و فکری تحریک کے بانی قرار پائے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام دنیائے تصوف و اصلاح میں ایسا نمایاں ہے کہ آج تک فیض رساں ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات برصغیر کے علمی وقار کی علامت ہے خدمتِ حدیث میں آپ کے کارنامے تو رہتی دنیا تک تابدار رہیں گے۔ ان دو برگزیدہ ہستیوں کے علاوہ شیخ تاج الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی لائق احترام اصحاب میں شامل ہے۔

وفات:

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ کے وہ جلیل القدر بزرگ تھے کہ ان کا ایک ایک سانس معتقدین کے لئے راہنما تھا، نقشبندیت اس قدر نمایاں تھی کہ بظاہر فیض خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا مگر بباطن سارا اتصال حضرت خواجہ

نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ آپ کی مختصر سی زندگی کا ہر لمحہ سلوکِ نقشبند کا تابندہ نمونہ ہے۔ مجاہدوں اور ریاضتوں نے حصارِ جسم کو بوجھل کر دیا تھا اس لئے اکثر بیمار رہنے لگے۔ بیماری کے ایام میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی، ایسا محسوس ہوا کہ آپ کو ایک پیراہن عطا کر رہے ہیں اس کی یہی تعبیر کی گئی کہ کفن تیار ہو چکا ہے اسم ذات کا ورد کرتے رہے اور اسی عالم محویت میں دنیا سے رختِ سفر باندھا اور اپنے خالق سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

25 جمادی الاخری 1012 ھ میں نقشبندیت کا سالار اول اس جہان سے رخصت ہو گیا اور اپنے پیچھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑ گیا۔ خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبداللہ صاحبزادے تھے جو بعد میں اپنے والد گرامی کے بعد حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں رہے کہ دونوں بہت چھوٹے تھے کہا جاتا ہے کہ عمر دو یا تین سال سے زائد نہ تھی، خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار بیرون شہر، اجمیری دروازے کی طرف قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہے۔ وصیت کی تھی کہ گنبد نہ بنایا جائے اس لئے ایک بلند چبوترہ بنا دیا گیا مزار کی تزئین و آرائش آپ کے مرید و خلیفہ خواجہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے محبت و عقیدت سے کی مگر پھر بھی گنبد نہ بنایا گیا۔

ارشادات و نصائح:

حضرت خواجہ باقی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین کے لئے وقف تھا اس لئے مختصر زندگی کے باوجود سالکِ راہ کے لئے درخشندہ نقوش چھوڑ گئے، صرف چند کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سورہ اخلاص کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے سننے سے بندہ کا اعتقاد اپنے پروردگار کی نسبت شرک جلی وخفی سے پاک ہوجاتا ہے اور اس کے عمل میں اخلاق پیدا ہوجاتا ہے۔

توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شے کو بھی موثر نہ مانے، اپنی قدرت کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا اور اپنے آپ کو قدرت سے خالی جاننا توحید ہے۔

توکل یہ نہیں کہ ظاہری اسباب کو چھوڑ دیں کیونکہ یہ بے ادبی ہے۔ اسباب کو اختیار کرنا چاہیے مگر نظر مسبب پر رکھنی چاہیے سبب ایک دروازہ ہے جس کے ذریعے مسبب تک پہنچتے ہیں دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے کہ خالق اوپر سے پھینک دے۔

مراقبہ اپنے افعال وتوانائی سے باہر آنے اور فیضان الٰہی کے منتظر رہنے کا نام ہے۔

رویت اس ظاہری آنکھ کے ساتھ مرنے کے بعد ہوگی کیونکہ رویت انکشافِ تام کا نام ہے۔ اور جب تک روح کا تعلق اس بدن کے ساتھ ہے انکشاف تام ممکن نہیں، روح کسی قدر بھی لاتعلق ہوجائے، حیات کا تعلق تو باقی رہے گا۔

کشفِ قبور کا کچھ اعتبار نہیں کہ اس میں خطا ولغزش کی گنجائش ہے البتہ الہام میں خطا کو دخل نہیں ہے۔

سماع کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ صوفیاء میں سے جو لوگ سماع کے قائل ہیں ان کے خیال میں سماع سے طبیعت میں سکون وقرار آتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سماع کی شرط یہ ہے کہ سننے والے پر حق تعالیٰ کی محبت غالب ہو اور حق تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکمل اتباع ہو اور اتباع کا مقصود جنت نہیں حق تعالیٰ ہی ہو۔

آخری ایام میں فرمایا کہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ طریق توحید یعنی وحدت وجود کے سوا ایک اور وسیع راہ ہے اور وحدت الوجود کی راہ اُس شاہراہ کے مقابلہ میں ایک تنگ راستہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ خواجہ باقی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے سراپا نیاز رہے اور گاہے بگاہے آپ کی مدح میں رطب للسان ہیں مثلاً اپنی کتاب مبدأ ومعاد میں رقمطراز ہیں۔

ہم حضرت خواجہ کی ملازمت میں چار اشخاص ایسے تھے کہ باقی تمام اصحاب میں امتیاز رکھتے تھے اور ہم میں سے ہر ایک کا حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ سے جدا جدا معاملہ تھا اور یہ فقیر یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایسی محبت اور ایسی تربیت وارشاد ہرگز وجود میں نہ آئی تھی اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہیے کہ اگرچہ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے مشرف نہ ہوئے تاہم اس محبت کی سعادت سے محروم نہ رہے۔[4]

حضرت خواجہ باقی باللہ صرف مسند نشین ہی نہ تھے صاحب قلم بھی تھے آپ کی تین کتابیں دستیاب ہیں۔

1۔ سلسلۃ الاحرار، رباعیات کا مجموعہ ہے جس کی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بھی لکھی ہے۔

2۔ کلیات جو آپ کی شاعری کا مجموعہ ہے۔

3۔ مکتوبات جو چھپ چکے ہیں تفسیر قران بھی منسوب ہے اگرچہ کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔

الغرض حضرت خواجہ باقی باللہ ایک صاحب علم شیخ تھے جن کی محنت نے برصغیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو خوب فروغ دیا۔ 5

حوالہ جات

1 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:283

2 جامع الترمذی کتاب الزھد

3 حوالہ مذکورہ ص:279

4 تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص:343

5 اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 3 ص:983

24۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

(م 1034ھ)

سلسلہ نقشبندیہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے برصغیر میں آیا۔ برصغیر کا علمی اور فقہی ماحول بعض علماء کے جاہ پسندانہ رویوں سے آلودہ ہو چکا تھا انحطاط ہر علمی مسند پر نمایاں ہونے لگا تھا مگر اس ہمہ جہتی زوال میں بھی اصلاحِ احوال کی خواہش موجود تھی اس لئے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر دور بھی بارآور ثابت ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا مرد درویش اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسا مردِ حق آگاہ۔ حضرت خواجہ باقی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرکزِ ہدایت سے پیوستگی میں آسودگی محسوس کرنے لگا، وہ کیا اسباب تھے جو ان اکابر کو جو مختلف سلاسلِ تصوف سے منسلک تھے نقشبندی درگاہ تک لے آئے، ان اسباب کی نشاندہی اُس دور کے سیاسی وانتظامی مدوجزر کے مطالعہ سے ہی ممکن ہے لہذا بہتر ہوگا کہ برصغیر کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔

برصغیر میں اسلام کی آمد تو اُسی دور سے شروع ہوگئی تھی جب مسلمان ایک سیاسی اور تہذیبی قوت کے طور پر سامنے آئے تھے محمد بن قاسم کے حملے سے باقاعدہ رابطہ استوار ہوگیا تھا جس کے اثرات اُس دور کے ہر مظہر میں نمایاں ہونے لگے تھے صدیوں کا یہ تعلق باہمی اخذ وترک کی تمہید بنا تھا۔ محمود غزنوی کے حملوں نے مقامی مدافعت کو زیر کر لیا تھا اور برصغیر کا کچھ علاقہ مسلمان ریاست کا حصہ بن گیا تھا۔

محمد غوری کی دوسری یلغار نے مدّ مقابل قوموں کو پامال کر دیا تھا اس لئے برصغیر کا اسلامی تشخص آشکار ہونے لگا تھا۔ سلاطین کے دور میں تہذیبی ارتقاء اور تمدنی پیش رفت نے ترویج اسلام کے لئے موافق ماحول مہیا کر دیا تھا۔ مدافعت کی عملی قوت بکھری تو مقامی آبادی کو اپنی بقاء کی فکر لاحق ہوئی۔ سطوتِ پیکار تو حائل نہ رہی تھی اس لئے تہذیبی یلغار کا سہارا لیا گیا، ہندو تہذیب ایسی سازشوں سے آراستہ تھی اس لئے ویدانت کے سایوں میں تہذیبی جدلیت کی پناہ لی گئی اور اسلامی عقائد و اعمال کو مقامی نظریات سے آلودہ کرنے کی سازش تیار ہوئی۔ یہ تو مقامی آبادی پر واضح ہو گیا تھا کہ اسلامی تعلیمات غیر مبہم بھی تھیں اور جامع بھی اور یہ کہ ان تعلیمات کو پیش کرنے والے حوصلہ مند بھی تھے اور سلیقہ شعار بھی اس لئے اب صرف مخفی سازشیں اور نظریاتی مغالطے ہی کار آمد ہو سکتے تھے ایسے مغالطے حکمرانوں کے ہاں زیادہ اثر پذیر تھے کہ انہیں مقامی آبادی کی حمایت درکار تھی۔ بھگتی تحریک جو ایک اصلاحی تحریک شمار ہوئی دراصل ایک در پردہ سازش تھی۔ اسلام کی توحیدی تعلیمات کو مادہ پرستانہ رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی ایک فکری سازش تا کہ مسلمان اپنے مرکز سے برگشتہ ہو جائیں اور مقامی رنگ میں رنگے جائیں اس کے اثرات یہ ہوئے کہ حکمران بھی اس سازش کا شکار ہوئے، اور عوام بھی ذہنی الجھنوں کے اسیر ہوئے حتّٰی کہ علماء و صوفیاء بھی ان نظریات سے متاثر ہونے لگے، علماء نظریاتی جدلیت کا شکار ہوئے تو صوفیاء ویدانت کے نظریات کے لئے جھکاؤ محسوس کرنے لگے، اسلام کی عظمت و انفرادیت کا نقش مدہم ہونے لگا اور وحدتِ ادیان کی طرف میلان بڑھنے لگا، وحدۃ الوجود کی نت نئی تعبیریں ہونے لگیں اور اسلام کی ہمہ جہتی صداقت پر سے اعتماد اٹھنے لگا۔

یہ ماحول آہستہ آہستہ اسلامی معاشرے پر محیط ہوتا جا رہا تھا کہ اکبر کا دور آ گیا، اکبر کو مشیران نے برتری کے فریب میں ایسا مبتلا کیا کہ اُس کے اندر اکبری انا کا بُت رقص کرنے لگا، بھگتی تحریک نے ایک اور رنگ بدلا اور دین الٰہی کے روپ میں رونما ہوئی۔ یہ اکبر کی رعونت اور مفاد پرست اعیانِ حکومت کی جاہ پرستی کا شاخسانہ تھا جسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ حیرت ہے کہ ایک مسلم حکومت مسلمانوں کے قومی مفادات کا سودا کر رہی تھی اور درباری اہلِ دانش خاموش تھے بلکہ معاون بن رہے تھے۔ ایسا ماحول جس میں اسلامی اصولوں کو بالادستی حاصل تھی وہاں دینِ اسلام کے شعائر کی کھلے عام توہین ہونے لگی تھی، دربار کی خدمت میں صوفیاء نے بھی اپنا مشن قربان کر دیا اور نت نئے فرقے ظاہر ہونے لگے، شطاریہ، مداریہ، نقطویہ، روشنیہ اور اسی قسم کے گروہ تصوف کے نام پر معاشرے میں اثر و رسوخ حاصل کرنے لگے اور ایک بے سمت جدلیت کا طوفان برپا ہو گیا۔

یہ تھا ماحول جب نقشبندیت کا پیغام لے کر حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اصلاح کی ایک بھرپور تحریک اٹھی جس کی قیادت جلد ہی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنبھالی۔ پھر کیا تھا ردعمل شدید ہوا۔ حکومت کی جانب سے راستہ روکنے کی پوری کوشش کی گئی مگر تاریخ گواہ ہے کہ اندھیرے کس قدر بھی گھمبیر ہو جائیں، آفتاب کی کرنوں کو اسیر نہیں کر سکتے، روشن صبح کو طلوع ہونا تھا اور وہ ہوئی جس کی روشنی آج تک تابانیاں بکھیر رہی ہے۔

اصلاحِ تصوف کے مشن کا بانی، تقدیم عقائد اور صیانتِ اعمال کا محافظ وہ شیخ طریقت جس کی مساعی جمیلہ سے عالم اسلام بالعموم اور برصغیر بالخصوص جادہ مستقیم

پر پھر سے گامزن ہوا 971ھ کے شوال کی چودہ تاریخ کو سرہند میں پیدا ہوا۔ جمعۃ المبارک کی شب تھی کہ یہ سعادت فاروقی نسل کے ایک نیک نام خاندان کو نصیب ہوئی، اس خاندان کی نسبی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ستائیس واسطوں سے یہ سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے اگرچہ ابوالحسن فاروقی دہلوی کی تحقیق یہ ہے کہ واسطوں کی تعداد اکتیس ہے۔ پندرھویں پشت میں شیخ شہاب الدین فرح شاہ کابلی سب سے پہلے برصغیر میں تشریف لائے۔ آپ سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھے، کابل ہی میں آپ کا مزار ہے یہی شیخ بزرگ ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ نسب میں پندرھویں ہیں اور یہی وہ قرآن السعدین ہے جس پر حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب جاملتا ہے۔ پھر اس خاندان کا تعلق برصغیر سے استوار ہوگیا حتّٰی کہ نسبی اعتبار سے چھٹے نمبر پر شیخ رفیع الدین کا نام ملتا ہے جو مستقلاً برصغیر میں اقامت پذیر ہوگئے۔ آپ کی روحانی نسبت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ہاتھوں اس مسکن حیوانات جیسے شیر ہند کہتے تھے کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ سلطان فیروز شاہ تغلق کا دور تھا جو خود حضرت مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد و مرید تھا۔ اس طرح یہ شیروں کا جنگل ایک بستی میں ڈھل گیا جسے سرہند کہا جانے لگا۔ یہ فاروقی خاندان بھی یہاں ہی آباد ہوگیا اور علم و معرفت کا سرچشمہ قرار پایا۔

اسی سرہند میں حضرت شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا آپ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور بعد میں آپ کے فرزند شیخ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ سے چشتی سلسلہ کے خلیفہ مجاز بنے، کہا جاتا ہے کہ شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سلسلہ قادریہ کا فیض حاصل ہوا تھا۔ یہی شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ وہ

بزرگ ہیں جن کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سرہند ہی میں شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جمعۃ المبارک کی شب 14 شوال 971ھ میں پیدا ہوئے، روایات میں متعدد اشارات کا ذکر ہے جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے علومرتبت پر دلالت کرتے ہیں اور اُس دور کے مشائخ تصوف کی بشارتوں سے بھی مستنیر ہیں۔

آپ کا نام احمد اور لقب بدرالدین رکھا گیا مگر شہرت اور بقائے دوام حضرت امام ربانی اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے القاب سے حاصل رہی، ابھی دودھ پیتے بچے تھے کہ بیمار ہوگئے اور بیماری کی شدت بھی اس قدر ہوئی کہ سب پریشان ہوگئے، تشویش کا یہی دور تھا کہ آپ کو حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے جایا گیا۔ حضرت شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ نے نونہال کا چہرہ دیکھا تو ایک عجب سرور محسوس کیا۔ اپنی زبان مبارک حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے منہ میں ڈال دی، اگرچہ رضاعت کی عمر تھی مگر زبان کی عظمت محسوس کرلی گئی اور مدت تک چوستے رہے، حضرت شاہ کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ نے والد گرامی کو مژدہ سنایا کہ بچے کے بارے میں پریشان نہ ہوں اس کی عمر بھی دراز ہوگی اور یہ بچہ علوم ومعارف کا پیکر بھی ہوگا، تاریخ نے اس قول کی صداقت ثابت کردی۔

حضرت شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تعلیم کا آغاز گھر سے کیا، جلد ہی قرآن مجید حفظ کرلیا اور درسیات کی طرف متوجہ ہوئے علوم متداولہ اپنے والد گرامی سے ہی پڑھے یہ خوش خصالی کی تمہید تھی کہ گھرانہ ہی علوم وحکمت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ والد گرامی اپنے دور کے لائق اخذ وافادہ عالم تھے اس لئے اُن کی توجہ خاص سے

علوم ظاہریہ پر بھی دسترس حاصل کی اور علم باطن سے بھی بہرہ مند ہوئے، جب ابتدائی صلاحیت نکھر گئی اور اساسی علوم میں مہارت ہوگئی تو مزید کسب علم کے لئے گھر سے نکلے۔ ہر اُس مرکز پر حاضری دی جہاں سے ازدیادِ علم کی امید کی جاسکتی تھی، سیالکوٹ کا قیام آپ کی زندگی کا نمایاں واقعہ ہے۔ وہاں حضرت شیخ کمال کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ یہ حلقہ درس اُس دور کا مسندِ ارشاد تھا۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور وزیر سلطنت مغلیہ سعداللہ خاں بھی اسی مسند علم سے فیض یافتہ تھے۔ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کمال کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ معقولات کی تمام کتب پڑھیں۔ اللہ اللہ حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مسجد جہاں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ حلقہ درس میں رہے اب بھی موجود ہے۔ راقم الحروف دومرتبہ وہاں حاضر ہوا ہے فضا میں ایک کیف کا احساس ہوتا ہے اور مجددی مہک عقیدت مندوں کو اپنے جلو میں لے لیتی ہے وہاں دونوں مرتبہ مختصر گزارشات پیش کرتے ہوئے ایک وجد کی کیفیت طاری رہی، بار بار خیال آتا رہا کہ یہی مسجد ہوگی اور یہی صحن مسجد جہاں برصغیر پاک وہند میں روحانی انقلاب پیدا کرنے والا وجود مستقبل کی تخمینہ کاری کررہا ہوگا۔ کاش وہ مسجد اب بھی روحانیت کے فروغ اور اسلامی شریعت پر استقامت میں وہی کردار ادا کرسکے جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اس نے ادا کیا تھا۔ انسان کس قدر حسرتوں کا شکار ہوجاتا ہے جب مقدس سرزمینوں کو بے توفیق ہوتے دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس صحن مسجد کو پھر دورِ مجددی کی رعنائیاں عطا کرے آمین۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی تحصیل حضرت مولانا یعقوب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے کی، مولانا علم حدیث میں یگانہ روزگار تھے کہ حدیث کی

سماعت برصغیر کے علماء کے علاوہ عالم عرب کے جید محدثین سے کی تھی جن میں خصوصیت سے حضرت علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ یعقوب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت فیض پایا۔ صرف سترہ سال کی عمر تھی کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے اور سرہند لوٹ آئے تاکہ والدگرامی کے مشن کے معاون اور جانشین بنیں۔ اُن دنوں ایک کتاب مجالس المومنین کا بہت تذکرہ تھا کہ وہ اہل سنت کے عقائد پر بھرپور تنقید تھی۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا کہ دربار مغلیہ کے بعض اراکین اس مہم کے سرپرست تھے، جوانی تھی اور رگِ فاروقی پورے شباب پر تھی اس لئے رسالہ ردشیعہ تحریر فرمایا جس پر عوام سے ہی نہیں دربار شاہی کے اکابر کا بھی ردّعمل آیا مگر وہ مردِ حق پرست جو صداقت کا امین تھا ان معاندانہ رویوں سے نہ گھبرایا نہ مداہنت اختیار کی، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور رسائل مثلاً رسالہ تہلیلیہ اور رسالہ اثبات النبوۃ بھی اسی دور کی یادگار ہیں، یہ رسائل آج بھی شہادت دے رہے ہیں کہ تجدید دین کے مسلک کا راہنما ابتداء ہی سے کتنا ہوش مند تھا یہی ابتدائی تعلیم کا رسوخ تھا جو عمر بھر ساتھ دیتا رہا اور دین کی حقانیت کو مضبوط دلائل سے قائم کرنے پر کاربند رہنے کا حوصلہ عطا کرتا رہا۔

دارالحکومت آگرہ کا سفر:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ دربار مغلیہ کے بعض ارکان کے بارے میں جان چکے تھے کہ اُن کے خیالات بادشاہ پر کس طرح اثر انداز ہورہے ہیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہاں عقلیت کے ایسے ایسے مظاہرے ہورہے ہیں جو مسلمان عوام کے عقائد کو

متزلزل کررہے ہیں، آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اٹھتے ہوئے فتنوں کا قریب سے جائزہ لیا جائے اور وہاں کے راسخ العقیدہ علماء کی معاونت کی جائے۔ چنانچہ آپ آگرہ آگئے وہاں اُن دنوں دو بھائیوں یعنی فیضی اور ابوالفضل کی علمی سطوت کا نقارہ بج رہا تھا۔ آپ نے دونوں سے راہ ورسم پیدا کی تاکہ اصلاح احوال کی صورت گری ہو سکے۔ ابوالفضل جو اس عہد کا وہ انشا پرداز تھا کہ جس کی تحریر آج بھی سحر انگیز شمار ہوتی ہے، سے آپ کی ملاقات ہوئی، خوشگوار تعلقات بھی قائم ہوئے مگر ایک روز ابوالفضل اپنے علمی خمار میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں گستاخانہ طرز کلام کا مرتکب ہوا تو آپ برہم ہوگئے اور مجلس چھوڑ دی کہا جاتا ہے کہ اس ردعمل نے ابوالفضل کی انا کو توڑ کے رکھ دیا اور وہ معذرت کا خواستگار رہا۔

فیضی جو ابوالفضل کا بڑا بھائی تھا علم وحکمت میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا ادبیات کا ذوق اس قدر فراواں تھا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھنے پر آمادہ ہوگیا اپنی علمی ثروت کا اظہار یوں کیا کہ تفسیر کا کوئی حرف بھی نقطہ والا نہ تھا یعنی ساری تفسیر بے نقطہ حروف سے لکھنے کا التزام کیا۔ سواطع الالہام، آج بھی فیضی کی لفظی صنعت گری کا واضح ثبوت ہے کہا جاتا ہے کہ تفسیر لکھتے ہوئے ایک ایسا موڑ آیا کہ فیضی کا قلم رک گیا، علمی جدلیت کا ہر رنگ آزمایا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ انہی دنوں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ آگرہ تشریف لا چکے تھے بے بسی کے عالم میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا آپ نے مطلوبہ معانی کو بے نقطہ الفاظ میں بیان کردیا، فیضی بڑا متاثر ہوا اور پھر گاہے بگاہے علمی تعاون کا مطالبہ کرتا رہا۔ مشکل یہ تھی کہ حروف ہجاء میں سے نصف کے قریب حروف غیر منقوط تھے ان حروف پر اعتماد کرتے ہوئے مفاہیم بیان کرنا مشکل ترین کام تھا۔ فیضی کی سواطع

الالہام آج بھی طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مہارت فن کا ثبوت تو ہے تفسیر نہیں ہے کہ تفسیر کا مقصود معانی کی تسہیل اور افکار کا ابلاغ ہوتا ہے مگر یہاں تو گرہ پر گرہ ہے۔

آگرہ میں علمی مصروفیات کی کثرت نے آپ کے قیام کو طول دے دیا، جب یہ قیام حد سے بڑھا تو والد گرامی اپنی پیرانہ سالی کے باوجود آگرہ آئے اور ساتھ لے گئے واپسی سفر میں تھانیسر سے گزرے اور وہاں کے ایک بااثر رئیس حاجی سلطان تھانیسری نے میزبانی کی درخواست کی۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ حاکم تھانیسر حاجی سلطان ایک صاحب فضیلت انسان تھے اور علماء وصوفیاء کے عقیدت مند تھے حسن اتفاق یہ ہوا کہ حاجی صاحب کو چند روز قبل ایک خواب نے سراپا جستجو بنا دیا تھا۔ خواب میں حاجی سلطان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اُس سعادت مند سے کردے جس کی صورت انہوں نے خواب میں دیکھ لی تھی۔ چنانچہ وہ ایسی صورت والے کے منتظر تھے جونہی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو یقین آگیا کہ یہی وہ صاحب صورت ہے اس لئے کسی تمہیدی گفتگو کے بغیر پیشکش کردی، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی نے یہ فرماتے ہوئے پیشکش قبول کرلی کہ کون ہے وہ جو فرمان رسالت سے انحراف کا خیال بھی دل میں لائے چنانچہ پچیس سال کی عمر میں یہ شادی ہوگئی، حاجی سلطان صاحب حیثیت انسان تھے اس لئے زوجہ محترمہ کے ساتھ بہت سامال بھی حاصل ہوگیا۔ جس کو آپ نے غنیمت جانا اور واپس آنے پر سرہند شریف میں ایک نئی حویلی خرید لی اور راس سے متصل ایک مسجد تعمیر کرائی اس طرح متوسلین کی رہائش اور عبادت کا اہتمام ہوگیا۔

سرہند میں آپ کی مصروفیات میں مسلسل اضافہ ہونے لگا۔ عقائد کی ترسیخ اور اعمال کی تقویم کا کام ایک ولولہ تازہ سے شروع ہوا، عوام وخواص کی نظریں سرہند کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ اعیان حکومت بھی حلقہ ارادت میں آتے جارہے تھے، یہ کام ابھی ابتدائی نوعیت کا تھا کہ صدمات نے گھیر لیا۔ آپ کے پدر نسبتی حاجی سلطان تھانیسر میں تھے کہ اکبر اعظم کا وہاں سے گزر ہوا، حاجی سلطان کی دینداری اور راست فکری نے دین سے برگشتہ لوگوں میں ایک کدورت کو جنم دیا تھا اور وہ لوگ اکثر احتجاج کرتے رہتے تھے۔ غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں کو حاجی سلطان سے اکثر شکایت رہتی تھی اس لئے ان تمام افراد نے اکبر اعظم سے شکایت کی۔ اکبر ایسے پختہ ایمان والوں سے بیزار ہو چکا تھا اس لئے شکایت کا اثر قبول کیا، معزول کر دیئے گئے اگرچہ کچھ عرصہ بعد بحال بھی ہوگئے مگر دبی کدورت رنگ لاتی رہی، حق وباطل کی یہ کشمکش مسلسل جاری رہی حتّٰی کہ اکبر نے 2 جمادی الاخریٰ 1007ھ میں حاجی سلطان کو تختہ دار پر چڑھا دیا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کہ ایک مشفق اور صاحب علم وعمل وجود کا سایہ سر سے اٹھ گیا، انتہائی غم کی حالت تھی کی ایک اور صدمے نے آلیا، آپ کے والد گرامی جو آپ کے لئے روحانی باپ بھی تھے اور دینی تربیت کنندہ بھی اس واقعہ کے صرف پچیس دن بعد 27 جمادی الاخریٰ 1007ھ کو اسّی سال کی عمر میں انتقال فرما گئے یہ صدمہ جانکاہ تھا کہ آپ اپنے والد گرامی سے ہی ہر معاملے میں راہنمائی پاتے تھے چنانچہ اپنے رسالہ مبدأ ومعاد میں اس کا اعتراف کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ

اس فقیر کو نسبتِ فردیت کا سرمایہ جس کے ساتھ آخری عروج مخصوص ہے اپنے والد سے حاصل ہوا تھا میرے والد ماجد کو یہ نسبت اپنے ایک عزیز بزرگ حضرت

شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ سے جو جذبہ قوی کے مالک تھے اور کرامات وخوارق عادت میں مشہور تھے حاصل ہوئی تھی لیکن یہ فقیر اپنی بصیرت کی کوتاہی اور اس نسبت کے محض گاہے گاہے ظہور پذیر ہونے کی وجہ سے سلوک کی منزلیں طے کر لینے سے پہلے تک اس نسبت کو اپنے اندر نہیں پاتا تھا اور نہ اس بات کا قطعاً کوئی علم تھا کہ یہ نسبت مجھے حاصل ہے نیز اس فقیر کو عبادات نافلہ خصوصاً نفل نمازیں ادا کرنے کی توفیق بھی والد ماجد کی مدد سے حاصل ہوئی تھی اور میرے والد بزرگوار کو یہ سعادت اپنے شیخ یعنی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے صاحبزادے شاہ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی تھی جو سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ 1

خُسرِ محترم اور والد گرامی کی ایک ہی مہینے میں وفات نے قلب مبارک میں ہیجان پیدا کر دیا، اگرچہ آپ کو زیارتِ حرمین کا شوق مدت سے تھا مگر بار بار والد گرامی کی پیرانہ سالی اس سفر سے روک لیتی تھی۔ اب یہ موانع بھی نہ رہے تھے اور جذبات کی آسودگی بھی متقاضی تھی کہ دیار راحت وسکون کی زیارت کی جائے۔ 1008ھ میں اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے دہلی آئے چند احباب سے ملاقات ہوئی ان میں مولانا حسن کشمیری بھی تھے۔ دوران ملاقات مولانا حسن نے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا۔ جو نقشبندی سلسلے میں اکابر سے نسبت ارادت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ پہلے ہی دہلی میں آئے تھے۔ اور جن کے ورود سے دہلی کی روحانی فضاؤں میں ایک تازہ بہار آچکی تھی۔

سلسلہ نقشبندیہ سے پیوستگی:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ابتدائے حیات سے ہی علوم ظاہرہ کے ساتھ ساتھ علم

معرفت وسلوک کا ذوق رکھتے تھے اور اس حوالے سے کسی ایک سلسلہ تصوف کے ساتھ منسلک نہ تھے بلکہ جہاں سے بھی فیض بخشی کا امکان نظر آتا ہے وہاں ہی حاضر ہو جاتے تھے۔ آپ کا یہ سفرِ عقیدت مختلف بارگاہوں سے ہوتا ہوا حضرت خواجہ باقی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچا تھا۔ قادری سلسلہ میں بھی آپ نے شاہ کمال کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے نسبت ارادت اختیار کی تھی اور شاہ سکندر کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ سے سند ارادت وخلافت حاصل کی تھی۔ سلسلہ چشتیہ تو گھر سے ہی حاصل ہو گیا تھا کہ آپ اپنے والد گرامی حضرت شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ومرید تھے۔ اسی طرح دیگر کئی سلاسل آپ کی توجہ کا مرکز رہے تھے مگر افتادِ طبع اور ذوق ارادت کا فطری جھکاؤ نقشبندی سلسلہ کے جانب تھا یہ تڑپ کسی طور تسکین نہ پا رہی تھی برصغیر میں اس سلسلے کا کوئی مقتدر راہنما تشریف نہ لایا تھا، جب حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلی آبسے تو اس خواہش کی تکمیل اور محرومی کے ازالے کا سامان ہو گیا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ دہلی حاضر ہوئے تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے خوش کن اطلاع مل گئی تھی۔ خواجہ حسن اس رابطے کا ذریعہ اور محرّک بنے تھے۔ اُن کی تحریک پر درگاہِ باقیہ میں حاضری دی، یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اسی مرید باصفا کی تلاش میں برصغیر آئے تھے کہ پہلی ملاقات ہی شناسائی کے اتمام کا سبب بن گئی، بڑی محبت وچاہت کا اظہار ہوا۔ ارادہ سفر میں تو حائل نہ ہوئے مگر کچھ تاخیر کی خواہش کر دی اور فرمایا۔

اگرچہ تم نیک سفر مبارک کا عزم کئے ہوئے ہو تاہم کچھ مدت یعنی ماہ بھر یا کم از کم دو ہفتے فقراء کی صحبت میں گزارو تو کیا حرج ہے۔

دو ہفتے کا قیام قبول کیا، خوب مجلسیں ہوئیں طالب بھی طلب کی بے پناہ

خواہش رکھتا تھا اور مطلوب بھی بے پایاں نوازش پر مائل تھا۔ خلوت وجلوت کا قرب حاصل رہا۔ مرشدِ کریم کی بے تابانہ توجہ تھی۔ دل کی حالت بدلنے لگی۔ اور روز بروز ارتقاء کی منزلیں طے ہونے لگیں خلاف معمول پہلی ہی ملاقات میں شرفِ نسبت سے نواز دیا۔ ایک دن خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ کا حکم بیان فرمایا کہ آپ کے ارشاد کے مطابق برصغیر کا سفر کیا تھا کہ خواب میں طوطی ہند آپ کے ہاتھوں پر آبیٹھا تھا جس سے ایک مردِ بزرگ کی نسبت مراد لی گئی تھی اور واضح کر دیا کہ آپ ہی اس خواب کی تعبیر ہیں ان اشارات کی روشنی میں فیصلہ کرنا مشکل نہ تھا چنانچہ شرف بیعت سے سرفراز کیا اور تقریباً ڈھائی ماہ کرم خاص کے حصار میں رکھا۔ جب صلاحیت خوب نکھر گئی اور مرشدِ کریم کو اجرائے سلسلہ پر اعتماد قائم ہو گیا تو واپسی کی اجازت دی اور اشاعتِ دین اور نشرِ حسنات کے منصب پر فائز کر دیا سرہند واپس آئے تو ایک مسجد کی بنیاد رکھی تا کہ خیر کا یہ سلسلہ مسجد آشنا رہے، یہی مسجد بعد میں سلسلہ نقشبندیہ کی وسعت کا مرکزی مقام بنی کہ وہاں خلق کثیر نے نورونکہت کے ہالے میں زندگیاں بسر کیں، حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اس ارسال فیض پر مطمئن تھے بلکہ گاہے گاہے اس ایصالِ ولایت پر فخر بھی کرتے تھے رقعات خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے محمد یوسف مجددی، جواہر نقشبندیہ میں رقمطراز ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مخلص ساتھی کو تحریر فرمایا۔

سرہند میں بہت علم اور قوی عمل والے ایک شخص رہتے ہیں اُن کا نام شیخ احمد ہے۔ کچھ دن فقیر اُن کے ساتھ رہا ہے، ان کے اوضاع واطوار سے بہت کچھ عجائبات ظاہر ہو رہے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایسا روشن چراغ ہوں گے جس سے دنیا روشن ہو جائے گی، ان کے کمالات دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھ کو اس کا

یقین ہے آپ کے برادران اور اقرباء میں بھی نیک علماء کی جماعت میں سے ہیں، ان میں سے بعض افراد سے میری ملاقات ہوئی ہے، میری نظر میں وہ سب جواہر عالیہ ہیں عمدہ صلاحیت کے مالک ہیں، شیخ مذکور کی اولاد جو ابھی کم عمر ہیں اسرار الٰہی ہیں خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ مثل شجرہ طیبہ کے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اچھی پرورش فرمائے۔ 2

ان دعاؤں کے سایے میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سرہند شریف کو لوٹے اور وہاں مرشد کریم کی ہدایات کے مطابق متلاشیانِ راہ ہدایت کے لئے راہنمائی کا سامان کرنے لگے، ہر طرف فیض بخشی کا شہرہ ہوا تو دور و نزدیک سے لوگ حاضر ہونے لگے، شروع شروع میں آپ اپنے آپ کو اس قابل نہ گردانتے تھے کہ ایک جم غفیر کی ہدایت کی کفالت اپنے ذمے لے لیں مگر پھر انشراحِ قلب ہوتا گیا اور روحانی ارتقاء کی منزلیں طے ہونے لگیں، کچھ عرصہ سرہند شریف میں گزارا پھر بے تابی بڑھی تو دوبارہ دہلی کا رُخ کر لیا اور مزید صحبت سے مشرف ہوئے آپ کو اپنے مرشد کریم سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اُن کی خدمت میں حاضری کو اپنی انتہا درجہ کی خوش قسمتی سمجھتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، رسالہ مبدأ و معاد میں بیان فرمایا کہ

''ہم چار شخص اپنے خواجہ قدس سرہ کی خدمت میں لوگوں کے نزدیک تمام دوسرے لوگوں سے ممتاز تھے ۔۔۔ پھر فرمایا۔ یہ فقیر یقینی طور پر جانتا تھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے بعد ایسی صحبت اور ایسی تربیت ظہور میں نہیں آئی یہ اس نصرت کا شکر بجالاتا تھا کہ اگرچہ اُس صحبت سے محروم رہا، مگر اس صحبت سے محروم نہیں رہا''۔ 3

اس مرتبہ الطاف کریمانہ کی کثرت تھی، رویہ بھی کاملین جیسا تھا اور شیخ کریم

کی طرف سے نوازشات بھی بے پناہ تھیں حتّٰی کہ جب کسی اور مرید کے دل میں یہ خصوصی توجہ بار بنتی حتّٰی کہ مرشد کریم حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے کسبِ فیض کے اشارے دیتے تو بعض دلوں میں ناگواری کے داعیے بھی اٹھتے، اس پر حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''میاں شیخ احمد ایسے آفتاب ہیں کہ ہم ایسے ہزاروں ستارے ان کے ضمن میں گم ہیں ان کاملین اولیاء کے متقدمین میں ان جیسا خال خال ہوا ہوگا''۔ 4

ایسے متعدد ارشادات حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہوئے ہیں جن میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے علومرتبت کا ذکر ہے۔ دہلی سے پھر سرہند تشریف لے آئے، چندروز قیام رہا مگر دل پھر بے تاب ہوگیا تو دہلی حاضر ہوگئے، حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو آمد کی خبر ہوئی تو مرشد گرامی استقبال کے لئے پاپیادہ کابلی دروازہ تک آگئے آپ کا رویہ اپنے مرید خاص کے ساتھ مرشدانہ نہ تھا بلکہ عقیدت مندانہ تھا۔ مل کر جدا ہوتے تو الٹے پاؤں واپس جاتے۔ یہاں تک فرمایا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے میری تعظیم نہ کیا کرو تمام متوسلین کی توجہ آپ کی جانب کر دی اور سلوک کا سارا معاملہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا حد یہ کہ اپنے دونوں شیر خوار بچوں کو بھی آپ کی خدمت میں دے دیا اور توجہ کی طلب کی، فرمایا کرتے تھے۔

''ہم اس بیج کو بخارا اور سمرقند سے لائے اور ہند کی برکت والی زمین میں کاشت کر دیا۔ 5

یہ عنایات خسروانہ تھیں ان پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور بھی سپاس گزار ہوگئے مرشد کی نوازشات نے کسی قسم کا تکبر پیدا نہیں ہونے دیا، جتنی توجہ زیادہ ہوتی تھی

اتنا ہی نیاز مندی کا جذبہ فراواں ہوتا تھا۔

خواجہ حسام الدین روایت کرتے ہیں ایک روز حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے میاں احمد (یعنی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ) کو بلانے کو بھیجا، جیسے ہی میں نے جا کر کہا کہ آپ کو حضرت طلب فرماتے ہیں تو خوف سے ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور بدن پر کپکپی طاری ہو گئی"۔6

یہ دہلی کا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات ظاہری میں آخری سفر تھا، واپس لوٹنے لگے تو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور جانے کی نصیحت کی۔ چنانچہ واپس آکر کچھ عرصے کے بعد لاہور تشریف لے گئے۔ لاہور علم کا مرکز تھا، علماء وصلحاء کی ایک بڑی تعداد وہاں آباد تھی اور ان دنوں مسئلہ وحدۃ الوجود ہر مجلس میں زیر بحث تھا۔ ایک عالم اپنے علم پر ناز رکھتا تھا۔ حاضر ہوا۔ اور اسی مسئلے کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ سنتے ہی اُس کا رنگ بدل گیا۔ آپ کے زانوؤں پر ہاتھ رکھا اور رخصت ہو گیا اس طرح آپ نے جواب کو برملا ادا نہ کیا کہ عوام میں بے چینی نمودار نہ ہو جائے۔

آپ لاہور ہی میں تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر ملی جو جوان سالی ہی میں اپنے مشن کی تکمیل کے بعد راہی ملک بقا ہو گئے تھے۔ آپ نے فوراً واپسی کا اہتمام کیا مگر سفر کی طوالت کی وجہ سے جنازہ میں شرکت نہ کر سکے مزار پر حاضری دی اور صاحبزادگان سے تعزیت کی، عقیدت مندوں کو بھی تسلی دی، پہلے تو ارادہ کر لیا کہ مسند شیخ پر ہی بیٹھیں گے مگر حالات کی ناسازگاری اور کچھ حاسدین کا حسد مانع آیا اور آپ سرہند شریف واپس آ گئے، پھر ہر سال جمادی الاخریٰ میں دہلی

حاضری دیتے، چند روز قیام کرتے، فیوض و برکات سے سائلین دامن بھر لیتے تو آپ واپس سرہند شریف آ جاتے۔ عمر بھر یہی معمول رہا۔

دربار جہانگیر میں اعلائے کلمہ حق:

برصغیر کی تاریخ میں مغلیہ دورِ حکومت اپنے وسیع تر اقتدار اور حکمرانی کے دلکش مناظر سے معروف ہے۔ مغلیہ سربراہان میں اکبر کا دور ہمہ گیر پذیرائی کے حوالے سے بڑا نمایاں ہے، تقریباً پچاس سال حکمرانی کا یہ دور برصغیر کو ہمیشہ یاد رہے گا، عمومی خوشحالی اور آسودگی کے باوجود اس دور کے ساتھ دینی حوالوں سے کئی المناک داستانیں بھی جڑی ہوئی ہیں۔ باپ کی سرپرستی سے محرومی نے علم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا موقعہ نہ دیا، اگرچہ فطری ذہانت کا اظہار بھی ہوتا رہا مگر علم سے محرومی کے اثرات بھی نمایاں ہوتے رہے، شخصی وقار کی دھن نے کئی فتنے تراشے، بدقسمتی یہ ہوئی کہ چند مصاحب بھی ایسے مل گئے جو خوشنودی شاہ کو اپنے علم وتجربہ کا حاصل سمجھتے تھے۔ مباحثوں کے ایسے دور چلے جو بادشاہ کی سطح ذہنی سے ماوراء تھے مگر مسحور کن تھے، مقامی جدلیت نے بھی فعّال کردار انجام دیا اور ایک پر جوش مسلمان غرور نفس کا ایسا شکار ہوا کہ دینی راہنما بھی بن گیا۔ دین الٰہی اسی خبط کا شاخسانہ تھا جو بھگتی تحریک کا ایک سرکاری اظہار تھا۔ پھر کیا کیا ہوا اس سے تاریخ برصغیر آگاہ ہے دین اسلام اکبر کی زد پر رہا۔ اُس نے بعض احمقانہ فیصلوں سے مسلم ملت کو متنفر کر لیا مگر جبر کا یہ عالم تھا کہ جرأت اظہار کی کسی کو ہمت نہ ہو رہی تھی، ایسے ابتلاء کے وقت حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہی صیانتِ اسلام کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ کشمکش جاری تھی کہ جہانگیر تخت نشین ہو گیا،

اُسے تو وراثت میں مجددی مشن سے نفرت ملی تھی اس لئے اُس نے ابتداء ہی میں اس کے سامنے دیوار بن جانے کا فیصلہ کرلیا۔

بادشاہ کا یہ رویہ چند مصاحبین کے طرزِ عمل سے مستحکم ہوتا گیا۔ ہندو اثر و رسوخ کے خلاف جدوجہد تو جاری تھی اب شیعہ مذہب سے بھی ٹھن گئی، نورجہاں جو جہانگیر کے پردے میں حکمرانِ وقت تھی۔ اُس کا ذہنی جھکاؤ اثر انداز ہوتا گیا۔ پھر اُس کا بھائی آصف جاہ جو وزارت کے اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ ریشہ دوانیوں کا ماہر تھا۔ بھلا اس خاندان کو فاروقی نسل کا مردِ حُر کیسے پسند آسکتا تھا اس لئے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو زک پہنچانے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا، ان دنوں اراکین سلطنت کی اکثریت مجددی فکر کی حامل تھی اس لئے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا اثر و رسوخ نظر انداز نہ کیا جاسکتا تھا۔ تدبیر یہ سوچی گئی کہ ہم خیال عمائدین کو ملک کی اطراف میں پھیلا دیا جائے تاکہ ان کی طاقت مجتمع نہ ہوسکے۔ جہانگیر کو یہی مشورہ دیا گیا، خوف بھی دلایا گیا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے اس قدر اثر آفریں جانثار کہیں اکٹھے نہ ہوجائیں اور حکومت کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ جہانگیر نے یہ مشورہ قبول کرلیا کہ اقتدار کسی اور قوت کو برداشت نہیں کرتا جب اجتماعیت پراگندہ ہوگئی تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو دربار میں طلب کیا گیا۔ جہانگیر کا رویہ تو اُس کی خودنوشت تزکِ جہانگیری کی ایک سنگین عبارت سے عیاں تھا۔ لکھا اور کس قدر گستاخانہ لہجے میں لکھا کہ

’’انہی دنوں (یہ چودھویں جلوس شاہی کے دن تھے اور جمادی الاولیٰ 1028ھ تھی) مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک مکار سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر کئی نادان اور بے سمجھ لوگوں کو اپنے مکر و فریب میں پھانسے ہوئے ہے۔

ہر شہر اور علاقے میں اس نے اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو جو معرفت کی دوکانداری، معرفت فروشی اور لوگوں کو فریب دینے کی پوری مہارت رکھتے ہیں خلیفہ کے نام سے مقرر کر رکھا ہے، مزخرفات اور واہیات قسم کے خطوط اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام لکھ کر مکتوبات کے نام سے ایک مجموعہ جمع کیا ہے اس نے اس مجموعے میں اکثر ایسی فضول اور بے ہودہ باتیں لکھی ہیں جو کفر و زندیقیت تک پہنچتی ہیں۔ اس کے بعد مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط کا حوالہ ہے جس میں سیر روحانی کا تذکرہ ہے، جسے بنیاد بنا کر حکم نافذ کیا گیا۔ 7

اس اقتباس کا لفظ لفظ واضح کر رہا ہے کہ نفرت کا بیج کیسے بویا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ بادشاہ اور اُس کے مصاحب جو اس تحریر کے محرّک بنے تھے کس طرح آپ کے اثر و رسوخ سے خائف ہیں کہ یہ اثر پذیری پھیل نہ جائے، حیرت ہے کہ بادشاہ اس قدر درشت الفاظ استعمال کرتا ہے مگر سزا کے طور پر صرف قلعہ گوالیار میں قید کا حکم سناتا ہے۔ ایسے مطلق العنان حکمران تو معمولی سی مخالفت پر قتل کا حکم سناتے ہیں مگر جہانگیر نے لکھا کہ

’’میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اسے چند دن قید رکھا جائے‘‘۔ 8

یہ رویہ ظاہر کر رہا ہے کہ جہانگیر کو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے وسیع حلقہ ارادت کی خبر تھی اور وہ کوئی ایسا فیصلہ کرنے پر مائل نہ تھا جس سے ماحول بے قابو ہوجائے۔

دربار میں حاضری کا حکم اُس سیر روحانی کے مندرجات کے حوالے سے دیا گیا تھا جس پر الزام یہ لگایا گیا کہ آپ نے اپنا مقام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بلند

بتایا ہے حیرت ہے اس الزام کا تانا بانا وہ بن رہا ہے جو خلافت راشدہ کا قائل ہی نہیں ہے، مقصود صرف بادشاہ کو برافروختہ کرنا تھا، حاضر دربار ہونے کا حکم ملا تو متوسلین سہم گئے کہ کہیں کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوجائے جو غیر محمود ہو، یہ کہا گیا کہ دربار میں تو سجدہ تعظیمی کی پابندی ہے، اس کا حل کیا ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ اضطرار کی صورت میں سجدہ حرام نہیں رہتا، جہانگیر کا اپنا فرزند شہاب الدین شاہ جہان حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد تھا اور کسی صورت کسی گزند کو برداشت نہ کرتا تھا اُس نے علماء سے رائے لی، علماء نے عند الضرورت جواز کا فتویٰ دیا۔ شاہجہان کو اطمینان ہوگیا، اُس نے اس فتویٰ کو مفتی عبدالرحمن اور علامہ افضل خان کے ہاتھ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کیا تا کہ وہ دلائل کے ساتھ عرض گزار ہوں اور متوقع خطرہ ٹل جائے۔ ان مقتدر علماء نے حاضر ہو کر اپنی بساط کے مطابق دلائل دیئے اور فتویٰ پیش کیا مگر استقامت کا کوہ گراں ذرہ برابر متاثر نہ ہوا۔ جواب دیا کہ

"یہ حکم بطور رخصت و مصلحت ہے جان بچانے کے لئے لیکن بطور عزیمت حکم اٹل ہے کہ غیر حق کو سجدہ نہ کیا جائے"۔

یہ تھا مجددانہ کردار اور یہ تھی عزیمت کی لاثانی مثال، اللہ کرے کہ عصرِ حاضر کے مسند نشینوں میں بھی یہ حوصلہ پیدا ہوجائے کہ باطل کے سامنے وہ حق کی ایسی برہان بن جائیں جس سے عوام میں دینی غیرت و محبت کی نمود ہو آمین۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ شاہی دربار میں گئے مگر انداز مومنانہ خود اعتمادی کا تھا، اکیلے گئے کسی کو ساتھ نہ لیا اور روانہ ہوگئے، جہانگیر کو بتا دیا گیا کہ وہ سجدہ تعظیمی نہ کریں گے، بادشاہ کے مصاحب جو عموماً خوشنودی شاہ میں اخلاقیات بھی بھول جاتے تھے

نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ پر واضح کر دیا۔ کہ سجدہ کرنا ہوگا آپ نے فاروقی استقامت کے ساتھ ایسے کرنے سے برملا انکار کر دیا، کہا گیا کہ داخل ہوتے وقت ذرا سا سر جھکا لیں اسی کو سجدہ سمجھ لیا جائے گا مگر آپ نے ایسا کرنے سے بھی انکار کیا، کوشش کی گئی کہ ایک چھوٹے سے دروازے سے اندر آنے کو کہا جائے گا تا کہ دروازے کی ساخت مجبور کر دے کہ سر نیچا کرنا پڑے مگر آوازۂ حق بلند کرنے والے مجدد نے اس حربے کو بھی ناکام کر دیا۔ دروازہ پر آئے تو دیکھا کہ سر جھکا کر گزرنا ہوگا تو پہلے پاؤں اندر داخل کر دیا اور سر پیچھے کو جھکا لیا۔ ایسے یہ شیطانی حربہ بھی ناکام ہوا، آخر دربار میں آ ہی گئے مگر سب پر یہ واضح ہوگیا کہ یہ وجود گرامی اتباع شریعت میں آخری حد تک جا سکتا ہے اور کوئی شاہی دبدبہ یہ گردن نہیں جھکا سکتا، سامنے آئے تو مسنون طریقے سے السلام علیکم کہا اور بس، معاندین نے اس روش پر عتاب شاہی کو برافروختہ کرنا چاہا۔ جہانگیر نے پوچھا کہ آپ نے سجدہ تعظیمی کیوں نہ کیا تو جواباً فرمایا۔

"غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے"۔

بادشاہ استقامت کی ایسی مثال دیکھ رہا تھا جو اُس کے نزدیک گردن زدنی تھی، کہنے لگا، سجدہ تو نظر انداز کیا جا سکتا تھا مگر یہ اس لئے لازم ہے کہ شاہ کی زبان سے یہ حکم صادر ہو چکا ہے اس لئے تعمیل ضروری ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"تیرے حکم کی تعمیل سے زیادہ ضروری اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے"

دربار پر ایک سکتہ طاری تھا۔ بادشاہ بھی غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ حکم دیا کہ درباری آگے بڑھیں اور زبردستی گردن جھکائیں، درباری پل پڑے۔ گردن پکڑ لی، پوری قوت سے سر مبارک کو جھکانا چاہا مگر وہ نہ جانتے کہ استقامت کے کوہ

گراں کس قوت کے مالک ہوتے ہیں گردن کو نہ جھکنا تھا نہ جھکی، مایوسی و نامرادی سارے دربار پر چھا گئی تو کھمبا نوچنے کی نوبت آ گئی، کہا گیا کہ آپ کا وہ مکتوب جو آپ نے اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا ہے وہ صحابہ کرام، خصوصاً ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کا حامل ہے، اس کا کیا جواب ہے اور عقیدہ کیا ہے۔

حیرت یہ ہے کہ یہ سوال اُن لوگوں کی طرف سے ذہنِ شاہ میں ڈالا گیا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت تو کیا ایمان کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے آپ کا جواب تھا کہ وہ خط میرے روحانی تجربے پر مشتمل ہے اور یہ اپنے مرشد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا گیا ہے کہ سیرِ باطنی کے بارے میں مرشد کریم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے لی جائے یہ خط عوام کے لئے نہ تھا۔ پھر یہ سیر باطنی کا حصہ ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اگر بادشاہ کسی خادم کو بلائے جو صف مصاحبین کے آخر پر بیٹھا ہو تو کیا وہ تعمیل حکم نہ کرے کہ معززینِ دربار کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو کیا اس کا مرتبہ وزراء کرام سے بالا ہو جائے گا یہ جواب حالات کے تناظر میں اس قدر واضح تھا کہ خود بادشاہ بھی مطمئن ہو گیا۔ جہاں تک حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت اور قرب نبوت کا تعلق ہے تو وہ حتمی ہے جواباً فرمایا۔

میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں جانتا، میرا دعویٰ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ذرا غور کریں تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے اس جملے کی حکمت نظر آتی ہے۔ آپ جانتے تھے کہ اس کے محرّک وہ مصاحب ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب سے افضل سمجھتے ہیں اس لئے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہی نام لیا تا کہ حقیقت بھی واضح ہو جائے اور اعتراض کے محرکین جن میں آصف جاہ نمایاں تھے کہ معتقدات کا بھی رد ہو جائے۔

گوالیار کے قلعہ میں قید:

جب ریشہ دوانیوں پر کمر بستہ امراء کا ہر حربہ ناکام ہو گیا تو مشورہ دیا گیا کہ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے آزاد رہنے سے معاشرتی بے چینی بلکہ شورش کا خطرہ ہے اسلئے آپ کو پابند سلاسل کر دیا جائے جہانگیر نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور آپ کو گولیار کے قلعے میں قید کرنے کا حکم دیا، چنانچہ قید کر دیئے گئے، نگران جیل ایک غیر مسلم شخص تھا جس کا نام "انی رائے سنگھ دلن" تھا شاید یہ بھی مقصود تھا کہ نگران جیل کو کسی قسم کی ہمدردی نہ **ہونے پائے کہ اگر مسلمان** مقرر ہو تو خیالاتِ مجدد سے متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ قید میں کیوں ڈالا گیا اس کی وجوہ کا ذکر خود جہانگیر نے کیا ہے۔

"میں نے اُس کی اصلاح کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اُسے قید رکھا جائے تا کہ اُس کے دماغ کی شوریدگی اور اُس کے ذہن کی آشفتگی دور ہو اور عوام میں اس کے مذخرفات کی وجہ سے جو شورش چل رہی ہے وہ رک جائے"۔ [9]

اس حکم نامے سے جہانگیر کا خوف نمایاں ہے اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے وسیع دائرہ اثر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ مطلق العنان حکمران جس کے منہ سے نکلا ہوا لفظ لائق تعمیل سمجھا جاتا تھا اور جو ہر قسم کا حکم صادر کرنے پر قادر تھا آخر یہ مداہنت کیوں دکھا رہا ہے۔ مورخین اس کا سبب اُن سرکردہ عمائدین کی موجودگی قرار دیتے ہیں کہ بڑے بڑے سپہ سالار حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں سے تھے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف کوئی بھیانک اقدام ملک گیر شورش کا محرّک بن سکتا تھا۔ حالات کا رُخ ایسا ہی تھا اور یہ دلیل بھی کمزور نہیں ہے مگر ان واقعات سے

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی وقار اور شخصی دبدبہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جہانگیر آپ کی صداقت کا دل سے قائل ہو چکا تھا مگر اُسے بھی مصاحبین کی دلجوئی مقصود تھی بلکہ نور جہاں اور اُس کے بھائی آصف جاہ کا جہانگیری اقتدار میں اثر ورسوخ بھی تحریک دے رہا تھا۔ جہانگیر نے حالات کو کچھ دیر کے لئے ٹالنا چاہا تھا اس لئے قتل کے بجائے قید کا حکم دیا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ دو سال تک قلعہ گوالیار میں قید رہے مگر آپ کی متانتِ طبع اور روحانی ریاضت کی عادات میں کوئی فرق نہ آیا دل برداشتہ ہوئے نہ مستقبل سے ناامید بلکہ پورے عزم کے ساتھ مشن جاری رہا۔ صرف جولان گاہ بدل گئی کہ اب پیش نظر قیدی تھے جو مختلف جرائم میں گرفتار تھے آپ نے سعی مسلسل سے ان گنہگاروں کے رویے بدلے حتّٰی کہ غیر مسلم عملے پر بھی اثر ہوا کہ متعدد اہل کار دامنِ اسلام میں آ گئے، جہانگیر کا خیال تھا کہ عوام تک رسائی نہ ہوگی مایوسی پیدا ہوگی اور اس اصلاحی تگ ودو کا خاتمہ ہو جائے گا مگر نتیجہ برعکس نکلا۔ تبلیغ جاری رہی حاضر ہونے والے متوسلین کی اصلاح بھی جاری رہی اور کوئی ذہنی تناؤ یا کوئی قلبی خلفشار پیدا نہ ہوا۔ سچ کہا تھا حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہ

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرّم
کیا غنچے سے چھینے گا کوئی ذوقِ شکر خند

دل آزاد رہیں تو ظاہری جسم کی اسیری کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔ رہا اولاد اور مقربین کا غم تو وہ لمحاتی عمل ہے اصل یہ ہے کہ اطاعت شعاری سے کامیابی نصیب ہو۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب اس حوالے سے بڑا اہم ہے کہ آپ کس طرح

اسیری میں بھی تربیت اولاد کا حق ادا کر رہے ہیں۔ مکتوب کا حرف حرف آپ کی استقامت پر شہادت دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اے فرزندانِ عزیز، ابتلاء کا وقت اگرچہ تلخ و بے مزہ ہوتا ہے لیکن اگر فرصت دیں تو غنیمت ہے، تم کو اب فرصت مل گئی ہے اللہ تعالیٰ کی حمد بجا لا کر اپنے کام میں لگے رہو اور ایک دم بھی فراغت و آرام اپنے لئے پسند نہ کرو اور تین چیزوں میں سے ایک میں ضرور مشغول رہو، قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ لمبی قرأت کے ساتھ نماز ادا کرو۔ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا تکرار کرتے رہو۔ کلمہ لا الٰہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے سوا تمام جھوٹے خداؤں اور اپنے نفس کی نفی کرنی چاہیے اور اپنی تمام مرادوں اور مقصودوں کی نفی کرنا چاہیے کیونکہ اپنی مراد کو پیشِ نظر رکھنا اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے (پھر مسلسل نصائح اور آخرت کی فکر کی تائید ہے) پھر فرماتے ہیں۔

تمام نفسانی خواہشوں کو جو جھوٹے خدا ہیں لا کے نیچے لا کر سب کی نفی کر دو اور کوئی مراد و مقصود سینے میں نہ آنے دو حتّٰی کہ میری خلاصی بھی جو کہ تمہارے لئے نہایت ضروری ہے تمہاری مراد مطلوب نہ ہو اور حق تعالیٰ کی تقدیر اور فعل اور ارادہ پر راضی رہو۔

نصیحتوں کی بے پناہ قوت کے بعد فرماتے ہیں۔

"باقی رہی ایک دوسرے کی ملاقات اگر حق تعالیٰ کو منظور ہو تو ہو رہے گی ورنہ اُس کی تقدیر پر راضی رہو اور دعا کرو کہ دار السلام میں سب جمع ہوں اور دنیاوی ملاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں"۔ 10

دو سال کی قید کے بعد رہائی ملی تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشن پر پھر سے گامزن ہو گئے۔ یہ سوال کہ جہانگیر نے آپ کو رہا کرنے کا حکم کیوں دیا؟ قرائن

بتاتے ہیں کہ جہانگیر کا آپ کو قید کرنا بھی ایک حکومتی مجبوری تھی اس لئے وہ اس قید پر دل سے خوش نہ تھا، اب جبکہ قید میں تھے تو وہ عقیدت مند جو اقتدار کے محافظ تھے اور بڑے با اثر تھے مضطرب ہو گئے تھے ایک دوسرے سے مشورے ہونے لگے اور اجتماعی بغاوت کی تحریک جاری کرنے کا سوچنے لگے اس میں سپہ سالار بھی شریک ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے مقتدر افراد میں خانخاناں خان اعظم ،سید صدر جہاں مہابت خاں کے علاوہ متعدد صاحبانِ اقتدار شامل تھے حتّٰی کہ شاہجہان جو شہزادہ تھا اور مستقبل کا حکمران بھی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کی تدبیریں کر رہا تھا۔ ان حالات نے جہانگیر کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کا فرمان جاری کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر ایک شرط لگا دی کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ لشکر شاہی کے ساتھ ساتھ رہیں اس سے بھی جہانگیر کا مقصود تعلقاتِ عامہ سے روکنا تھا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے لئے قید یا رہائی کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے اس لئے رہائی کے لئے چند شرائط پیش کیں یہ شرائط بھی واضح کر رہی ہیں عمر قید کے حکم پر پشیمانی تھی، تعجب کی بات یہ ہے کہ جہانگیر نے تمام شرائط تسلیم کر لیں، شرائط دین کے حوالے سے حکمران کے لئے ایک دستور عمل تھیں جن کے اثرات مسلسل ظاہر ہوتے رہے۔ شرائط یہ تھیں جن پر احکام جاری ہوئے ایک ایک نقطہ پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ تبلیغ کا دائرہ اثر ایوانوں تک بھی جا پہنچا ہے اور وہ مغلیہ حکومت جو مطلق العنانی کی حد پر کھڑی تھی کس طرح شریعت کے سامنے سرنگوں ہو گئی ہے۔ جہانگیر کا شاہی فرمان جاری ہوا کہ

دربار میں سجدہ تعظیمی قطعاً بند ہے۔

گائے کشی جو ہندوؤں کے دباؤ کے تحت حکماً بند کر دی گئی تھی پھر سے جائز

قرار پائی اس پر عمل یوں ہوا کہ ہر رکن دربار نے دربار شاہی کے سامنے ایک ایک گائے ذبح کی اور گوشت کے کباب بنا کر سب نے کھائے۔

مسمار کی گئی مسجدیں دوبارہ تعمیر کرنے کا حکم صادر ہوا۔

دربار سے متصل بھی ایک مسجد تعمیر کرنے کا فرمان جاری ہوا جس میں اراکین دربار بلکہ خود جہانگیر نماز ادا کرتے تھے۔

شرعی قوانین کا دوبارہ اجراء ہوا اور فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔

یہ اور اس قسم کے متعدد فرامین واضح کر رہے ہیں کہ مرد درویش کی مساعی کس حد تک کامیاب قرار پائی ہے کفر کا چلن اب شریعت کی پاسداری میں ڈھل گیا ہے۔ دو سال کی قید اور تین سال شاہی لشکر کی معیت نے ایسے دور رس نتائج مرتب کئے کہ مغلیہ حکومت اسلامی ریاست کے قالب میں ڈھلنے لگی۔ شاہجان کا رویہ تو نمایاں تھا کہ وہ حلقہ مریدین میں سے ہو گیا اور نگ زیب تو ان مساعی کا مصداق بن کر سریر آرائے سلطنت ہوا وہ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا تھا۔

سفرِ آخرت:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ شاہی لشکر سے علیحدہ ہو کر سرہند تشریف لے آئے اور اپنے مشن کے لئے ہمہ تن مشغول ہو گئے اب تو شہرت بام عروج پر تھی۔ دور و نزدیک سے لوگ آتے اور حلقہ مجددیہ میں شامل ہوتے ، یہ فیضان برصغیر سے نکل کر عالم اسلام کے ہر مسلمان کے لئے وجہ قرار بنا، آپ نے خلفاء کی ایک بڑی تعداد کو برصغیر کے کونے کونے میں برصغیر کے باہر تعینات کیا تا کہ وہ مجددی طریقہ کی تبلیغ کریں کیونکہ

یہ مجددی سلسلہ سراپا شریعت کا پاسدار تھا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنا مشن مکمل کر چکے تھے۔ سرہند، دہلی اور لاہور آتے جاتے رہے کہ ان مقامات سے ہدایت کے چشمے جاری ہو چکے تھے، طبیعت کی ناسازی بڑھنے لگی تھی کہ 1032ھ میں اجمیر شریف کا سفر کیا، وہاں پر ہی ایسے آثار نمودار ہوئے جو سفر آخرت کی نشاندہی کر رہے تھے واپس آئے تو نقاہت نے جسم کے ہر حصے پر ڈیرہ ڈال لیا وقت کی نزاکت بھانپتے ہوئے خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کو تمام معمولات کا نگران مقرر کر دیا، یہ خلافت اور مسند نشینی کے اشارے تھے۔

ایام علالت میں فرائض واجبات بلکہ سنن و مستحبات بھی ترک نہ ہوئے۔ علاج جاری تھا کہ افاقہ کی کوئی صورت نہ بنی۔ ایک مرتبہ خود ہی فرمادیا کہ اب تو چالیس پچاس روز ہی باقی رہ گئے ہیں کسی معالج نے لونگ کے استعمال کا مشورہ دیا آپ نے کسی عقیدت مند سے منگوائے تو وہ چھ دانے تھے قدرے ناخوش ہوئے اور فرمایا اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ طاق پسندیدہ ہیں، متابعتِ سنت کا یہ شعور عمر بھر رہا حتّٰی کہ لمحہ آخر تک بھی یہ ولولہ تازہ رہا۔

وہ فیصلہ جو کائنات کے ہر فرد کے لئے ازل سے جاری ہے وہ فیصلہ کن لمحہ آ گیا بہت سے اشارات بھی حتمی خبر دے رہے تھے اور مسکنِ آخر بھی دکھا دیا گیا تھا صرف ایک تمنا تھی جو عشقِ رسول اکرم ﷺ کا برتر حوالہ تھی کہ ایام حیات رسول ﷺ سے زیادہ نہ ہوں کہ یہ آخری سنت بھی ادا ہو جائے۔ آخری ایام میں صدقہ و خیرات میں بھی بہتات آئی، معمولات حسبِ عادت جاری رہے۔ اپنے جانے کی خبر بھی دیتے رہے اور استقامت کی تلقین بھی کرتے رہے۔

آخر وہ لمحہ آخر آ ہی گیا وہ رات ذکر و افکار سے عبارت تھی وہ دعائیں لب پر رہیں جو مسنون ہیں اور کتب صحاح نے روایت کی ہیں۔ تہجد حسب معمول ادا کی اور فرمایا کہ یہ آخری تہجد ہے بھلا ایسے انسانوں کو موت کا کیا ڈر جو موت کی آمد کا لمحہ مشاہدہ کر رہے ہوں، نماز فجر باجماعت ادا کی۔ اشراق کی نماز بھی نہایت دلجمعی سے ادا کی، پیشاب کی حاجت ہوئی تو طشت منگوایا مگر اس میں خادم نے ریت نہ ڈالی تھی۔ فرمایا ایسا نہ ہو کہ چھینٹے اڑیں اور کپڑوں کو ناپاک کر دیں، عرض کیا گیا دوسرا طشت لے آتے ہیں تو فرمایا اب رہنے دو اس سے وضو جاتا رہے گا اور اب وضو کا وقت نہیں رہا اور آپ دربار الٰہی میں بے وضو جانا نہ چاہتے تھے۔ پھر بستر پر لیٹ گئے لیٹنے میں بھی سنت رسول اکرم ﷺ کا خیال دامنگیر رہا۔ دائیں جانب رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر لیٹ گئے اچانک سانس دھکنے لگا اور اللہ اللہ کی مدہم صدائیں آنے لگیں اور آخر ملت اسلامیہ کا مجدد جس نے ملت کو شعور ذات دیا اور جس نے تحفظ دین کو زندگی کا معمول بنائے رکھا۔ سراپا اطاعت بنا وجود حاضر دربار ہو گیا 28 صفر 1034ھ اشراق کی نماز کے بعد واصل باللہ ہو گئے، مرقد مبارک کے لئے تو پہلے ہی اہتمام ہو چکا تھا کہ بڑے صاحبزادے محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن فرما کر ایک قبہ تعمیر کر دیا تھا، اسی قبہ کے اندر ابدی نیند سو گئے اور عالم اسلام کو غمزدگی کا گہرا داغ دے گئے کہ آج تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متمنی آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج کا تصوف مجددی راہ سلوک کی راہنمائی کا محتاج ہے کہ یہی راہ سلوک اس شجر طیب کی فرع ہے جو مدینہ منورہ میں آج بھی فیض بخشی کا کفیل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ عمر بھر نبی اکرم ﷺ کی اداؤں کے متوالے رہے۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ

خواہ وہ سرہند میں گزرے یا قید خانے میں یا لشکر شاہی کی مصاحبت میں ، نشر خیر کا موجب تھا سنت کی پاسداری کا ہر لمحہ خیال رہتا تھا متوسلین کو بھی اسی جانب متوجہ کرتے رہے تھے اور برملا فرماتے تھے کہ مرشد کی اقتداء اُسی وقت تک ہے جب تک وہ سنت رسول اکرم ﷺ پر عمل پیرا رہے کہ مرشد ایسا راہنما ہے جو متوسلین کا ہاتھ تھامے اور دربارِ رسالت میں حاضر کردے، یہ مسند نشینی کوئی جائداد نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ مفادات کی پیوستگی ہے۔ تصوف خالصتہً راہ سلوک ہے جو مسافران تصوف کو دربار عالی میں لے جانے کا ذریعہ ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ یقیناً مجدد تھے کہ دین کی عظمت وشوکت کے لئے بے پایاں خدمات انجام دیں ان خدمات کا اعتراف ہر دور میں ہوا۔ ہم عصر علماء وصوفیاء نے آپ کی رفعتِ شان کو برملا تسلیم کیا ہے۔ اُس دور کے سب سے بڑے عالم جن کی علمی سطوت کا آج تک اعتراف کیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی سب سے پہلے آپ کو ''مجدد الف ثانی'' کے نام سے یاد کیا تھا یہ عصر موجود کا وہ خراجِ عقیدت تھا جو نام کا لاحقہ بن گیا۔ آج بھی جب مجدد کا کلمہ ادا ہوتا ہے تو ہر صاحب علم وعرفان اس سے آپ کی ذات ہی مراد لیتے ہیں۔ تاریخ مناقب میں اس قدر توصیفی حوالے ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ

متصوفین اسلام میں دو حضرات بہت عظیم المرتبت ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ ان میں سے کون برتر ہے۔ 11

یہ رائے ہے اس دیدہ ور کی جو برصغیر میں علم ودانش کا ایک کوہ گراں ہے یہ

عقیدت مندانہ اظہار بغیر سوچے سمجھے نہیں تھا کہ یہ گھرانہ ہی تحقیق وتدقیق کا عمومی حوالہ رکھتا ہے اس اظہار کی عظمت مسلم مگر خود مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا انکسار اور عقیدت دیکھئے کہ کبھی بھی برتری کا دعویٰ نہیں کیا یہ سوال سامنے آیا کہ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ورتبہ کیا ہے تو برملا فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو فیض جاری ہوا تھا اور اماموں کے ذریعے قوم تک پہنچتا رہا ہے۔

''حتی کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی نوبت آ پہنچی اور منصب مذکور اس بزرگ کے سپرد ہوا مذکورہ بالا اماموں اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی شخص اس مرکز پر مشہود نہیں ہوتا اسی راستہ میں تمام اقطاب ونجباء کو فیوض وبرکات کا پہنچنا حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے وسیلہ شریف سے مفہوم ہوتا ہے کیونکہ یہ مرکز حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کسی کو میسر نہیں'' 12

یہ بڑوں کی نیاز مندی ہے اور اکابر کا اکابر کی عظمت کو تسلیم کرنا ہے راہ سلوک اسی عجز اور اسی اعتراف سے منزل آشنا ہوتا ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پُر آشوب دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور کفر، نفاق، بدعقیدگی اور بدعملی کے چوبائی حملوں کا مقابلہ کیا۔ تقریر سے بھی ہدایت کو عام کیا، تحریر سے بھی منزل تک رسائی کا راستہ آسان کیا، آپ نے حسبِ ضرورت مکاتیب لکھے اور بعض رسالے بھی ترتیب دیئے جس کی نہایت اختصار کے ساتھ وضاحت کی جارہی ہے۔

تصانیف:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ حاملین قرطاس وقلم بزرگوں میں ہیں۔ آپ کا قلم سیال بھی ہے اور حروف آشنا بھی، عربی، فارسی دونوں زبانیں اُس دور میں علمی سطوت سے سرفراز زبانیں تھیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے موقع محل کے مطابق ان دونوں زبانوں کو اپنے خیالات ونظریات کی نشرواشاعت کا ذریعہ بنایا۔ یوں تو یہ تصانیف ایک ایسے صوفی کی ہیں جو تصوف کے رموز سے آشنا ہے اور سیر افلاکی کی قوت رکھتا ہے مگر پھر بھی ان تصانیف کو اشاراتی طرز ادا کا اسیر نہیں سمجھا جاسکتا مطلوب اشکال کی وضاحت ابہام کی تشریح اور خلقِ خدا کی راہنمائی تھا اس لئے ان تصانیف کی پیشکش کا انداز نہایت اثر آفرین ہے، تاریخ ہند شاہد ہے کہ آپ کا فیضان برصغیر کے کونے کونے میں پہنچنے کے علاوہ برصغیر کے باہر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس عمومی قبولیت کے وجوہ متعدد ہیں مگر بلاشبہ ایک وجہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تحریری کاوشیں بھی ہیں، آپ نے اپنے مشن کے اجراء کے ساتھ ہی سلگتے ہوئے مسائل پر قلم اٹھایا اور بلاشبہ حق ادا کر دیا۔ آپ کی تصانیف میں جن کا متن محفوظ ہے اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں ان میں سے نمایاں تصانیف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

1۔ رسالہ تہلیلیہ:

انتہائی مختصر رسالہ ہے کہ صرف بارہ صفحات کا ہے مگر اس میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کلمہ طیبہ کے حوالے سے جو عارفانہ گفتگو کی ہے اُس کی افادیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ یہ رسالہ دراصل کلمہ طیبہ کی تشریح ہے جس میں توحید پر اٹھنے والے اعتراضات کا

جواب بھی ہے یہ رسالہ نظریہ توحید کو ہر قسم کے اغیار سے پاک کرنے اور ہر طرح کے اشکالات کے رد میں ہے یہ اُس دور کا تقاضا تھا کہ مقامی آبادی کے زیر اثر توحید کے حوالے کئی مشرکانہ نظریات سامنے آرہے تھے۔

2 رسالہ اثباتِ نبوت:

یہ رسالہ رسالت کے لزوم کو ثابت کے لئے تھا یہ بھی دور کا تقاضا تھا کہ وحدتِ ادیان کی لہر جو بھگتی تحریک سے ابھری تھی وہ ضرورت نبوت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے نبوت کی اہمیت وضرورت پر اپنی تصنیف میں زور دیا ہے کہ دین کی اشاعت کے حوالے کے بغیر اسلام کی خدمت نہیں ہوسکتی، اس رسالہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی نظر ہر اُس مسئلے پر تھی جو قوم کے عقائد میں الجھاؤ پیدا کر رہا تھا ایسے ہی کارنامے تو مجددیت کا نشان بنتے ہیں۔

3 رسالہ دررد شیعہ:

یہ رسالہ ردّروافض بھی کہلاتا ہے یہ شیعہ حضرات کے ایک رسالے کا رد ہے، یہ رسالہ بھی اُسی دور کی ضرورت تھا کہ ہمایوں کی ایران میں جلاوطنی اور تقریباً پندرہ سال وہاں کے ماحول میں اقامت کے اثرات بادشاہوں کے رویوں میں نمایاں ہونے لگے تھے جہانگیر کے دور میں نور جہاں کا در پردہ حکمرانی کا شوق بھی معاملات حکومت پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف درباری مصاحبین کی سازش کا اصل محرک آصف جاہ ہی تھا جو نور جہاں کا بھائی تھا۔ بعد میں وہ شاہجہاں کا سسر بھی بنا کہ اُس کی بیٹی ممتاز محل ملکہ بنی، معاشرتی اثر ورسوخ عقائد پر حملہ آور تھا

اس لئے مجدد وقت کے مشن کا تقاضا تھا کہ جواب لکھا جائے اور قوم کو راہِ راست دکھاوی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ تینوں رسائل حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے اُس وقت نکلے تھے جب آپ ابھی نقشبندیہ حصار میں نہیں آئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پیش پا مسائل خاص طور پر نظریاتی بے راہ روی کے مسائل پر آپ کی نظر شروع سے ہی تھی۔ آپ اگرچہ نقشبندی سلسلے میں داخل نہ بھی ہوئے تھے مگر نقشبندی طریق ہدایت آپ کے کردار میں شروع سے ہی نمایاں تھا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے نقشبندیہ سلوک اختیار کرنے کے بعد اُس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض رسائل تحریر کئے جو آج تک اصحاب علم ودانش کے ہاں مقبول ہیں اور عقلی تطہیر کا کام کررہے ہیں ان رسائل کے نام ہیں۔

4 معارف لدنّیۃ:

رسالے کا موضوع عنوان سے ہی ظاہر ہے۔

5 مکاشفات عینیہ:

جسے آپ کی مرید خاص خواجہ محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب دیا تھا۔

6 رسالہ مبدأ ومعاد:

7 رسالہ درشرح بعض رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

یہ رسالہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ادبی ذوق کا ترجمان ہے ان رسائل کے علاوہ بھی متعدد رسائل آپ کے فیض آثار قلم سے نکلے اور اصلاح احوال کا موجب بنے تقریباً

بائیس رسالوں کے نام ملتے ہیں ان سب رسائل کی افادیت کے باوصف یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت اور بقائے دوام کا سبب آپ کے مکتوبات ہے۔

8 مکتوبات:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ محسوس کررہے تھے کہ حکومت تو مسلمانوں کی ہے اور حکمرانوں کا یہ دعویٰ بھی ہے مگر معاشرتی زندگی بتدریج ہندوعقائد کی زد میں آرہی ہے اس لئے آپ نے فیصلہ کیا کہ اصلاح کی تحریک شروع کی جائے اراکین حکومت اور معاشرہ میں برتر وجود کا اس بگاڑ میں زیادہ حصہ ہے اس لئے اولین توجہ ان پر دی جائے کہ اگر یہ لوگ جو عقل وشعور کی دولت کے امین ہیں، راہ راست پر آجائیں تو معاشرتی انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے اس فیصلے کے زیر اثر آپ نے سالاروں اراکین حکومت اور بعض بااثر افراد کو نصیحت آموز خط لکھنے شروع کئے۔ پھر جو لوگ اس معاشرتی ناآسودگی کے باعث سلامتی ایمان کا جذبہ رکھتے تھے مگر چاہتے تھے کہ کہیں سے راہنمائی نصیب ہوجائے ان کے اشکال بھی موصول ہوتے تھے اور مکتوب کی شکل میں جواب ارسال کئے جاتے تھے۔

مکتوبات کا سلسلہ جب چل نکلا تو یوں محسوس ہوا ہر خط اپنے اندر نشرِ خیر کا سامان رکھتا ہے تو انہیں محفوظ بھی کرایا گیا، اسلاف سے عقیدت اور رفتگاں سے دلچسپی اس تجمیع میں نمایاں ہوئی 1025ھ میں مکتوبات کا پہلا مجموعہ تیار ہوگیا اس میں تین سو تیرہ مکتوب ہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اس تعداد پر دفتر اول کو بند کرنے کا حکم دیا کہ یہ اصحاب بدر کی تعداد بھی ہے اور رسولانِ گرامی کی بھی، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو یقین تھا کہ یہ تعداد بھی اثر انداز ہوگی کہ ان کی نسبت بڑی ہے اور وہی ہوا پورے برصغیر

میں مکتوبات کا شہرہ ہوا حتّٰی کہ بیرون ملک بھی ان کا فیضان پہنچا۔

مکتوبات مسلسل جاری رہے جب پہلی جلد کے بعد کے مکتوبات کی تعداد 99 ہوگئی تو پھر اس پر اکتفا کرنے کا حکم دے دیا کہ مکاتیب کی تعداد اسماء حسنیٰ کے برابر ہوگئی ہے اور یہ نسبت باعثِ برکت رہے گی۔ یہ 1028ھ کا واقعہ ہے۔

مکتوبات کی تیسری جلد کی تکمیل 1031ھ میں ہوئی، مکاتیب کی تعداد 114 تھی فرمایا یہ تعداد قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں سے نسبت پر ختم ہوجانی چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہوا اگرچہ اس جلد کی تکمیل کے بعد بھی چند خطوط لکھے گئے سوچا گیا کہ ان کو کہاں درج کیا جائے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ انتقال فرما چکے تھے اس لئے باہمی مشورے سے بعد کے خطوط تیسری جلد میں شامل کر دیئے گئے یوں یہ جلد ایک سو چوبیس مکاتیب پر مشتمل ہے اس طرح مکتوبات کی کل تعداد پانچ سو چھتیس ہے۔

مکتوبات کے تینوں مجموعوں کو تاریخی نام بھی دیئے گئے پہلی جلد کو ''دُرالمعرفت'' کہا گیا جس کے اعداد 1025 بنتے ہیں۔ پھر دوسری جلد کو ''نورالخلائق'' کا نام دیا گیا جس سے تاریخ ترتیب 1028 نکلتی ہے تیسری جلد کو بحر المعرفت کا عنوان دیا گیا جس سے 1031 کا عدد دریافت ہوتا ہے۔

مکتوبات کی شہرت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ہی بامِ عروج پر تھی پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ نیک نامی پورے کرہ ارض پر محیط ہوگئی کہ ان مکاتیب میں عقل وشعور کی جلا کا سامان بھی تھا اور شوق وجذبے کی تطہیر اور تشوّق کا جوہر بھی تھا، فارسی میں لکھے گئے یہ مکاتیب ہر صاحب علم کے کتب خانے کی زینت بنے، خواہش اس قدر جوان ہوئی کہ فارسی نہ جاننے والے بھی ان کی تلاش میں نکلے، نتیجہ یہ

ہوا کہ متعدد عربی تراجم بھی اشاعت پذیر ہوگئے اور عرب ممالک میں پڑھے جانے لگے، برصغیر کی عمومی زبان اردو ہے اس لئے مقامی آبادی کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے مکتوبات کے اردو تراجم بھی ہوئے اور بار بار ہوئے اس طرح حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان گھر گھر پہنچا۔ علماء کے ہاں بھی اور صوفیاء کے ہاں بھی یہ ہدایت کے نوشتے برابر مقبول رہے جس کا اظہار صوفیاء کے زبان پر بھی رہا اور علماء کی زبان پر بھی جواہر نقشبندیہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

''تصوف اسلام میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو کتابوں کا پڑا ہے اول مثنوی جس نے مجھے دہریت والحاد سے کھینچ کر اسلام کی راہ دکھائی اس اجمال کے بعد ضرورت تفصیل کی تھی یعنی اسلام کے اندر عقائد واعمال میں متعین راہ کونسی اختیار کی جائے اس باب میں شمع ہدایت کا کام مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا''۔

مکتوبات کا مطالعہ کرنے والا جس علمی سطح پر بھی ہوگا اُسی سطح کی راہنمائی پالے گا کہ یہ مکاتیب اکابر علماء اور صاحبانِ دانش کے لئے بھی اور ایک عام خواندہ کے لئے بھی ہیں، مکاتیب کی عبارت میں نہ کوئی ابہام ہے اور نہ تردد، قاری یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ صاحب قلم علم دین پر بھی دسترس رکھتا ہے اور علم سلوک پر بھی، پھر محرر کو حرف شناسی اور اختیار کلمات کا فن بھی آتا ہے یہ مکاتیب حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد ونظریات کا مرقع ہیں اور آپ کی روشِ بندگی کا روشن آئینہ ہیں۔

اولاد وخلفاء:

اولاد، والدین کی تربیت کا عکس ہوتی ہے اصحابِ عزم اپنی اولاد کو

خیرات وحسنات کی پناہ میں رکھتے ہیں کہ تربیتِ اولاد بھی ایک فریضہ ہے۔ الحمد للہ۔
حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس فریضے کو نہایت احسن طریق سے ادا کیا کہ آپ کے بعد وہ مشن جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ جیسے عبقری وجود کا مقصودِ نظر تھا وہ اُسی ولولے اور خلوص کے ساتھ اولاد کے بھی پیشِ نظر رہا، کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ اولاد کا ہر فرد مجددی سایوں میں زندگی گزارتا رہا اور نشرِ خیر کا یہ تسلسل مدت تک جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سات بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائیں ان سب پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی یکساں شفقت رہی۔ اولاد کی خوش قسمتی کہ اُن کی والدہ بھی اپنے مشفقانہ رویوں میں بے مثال تھیں ایک شہید کی بیٹی ہونے کے ناطے صبر واستقامت کا ایسا معیار بنیں کہ قرونِ اولیٰ کی صالحات کا عکس دکھائی دیتی تھیں یہ نیک رویوں کا اثر تھا کہ مجددی مشن پوری آب وتاب سے جاری رہا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

1 خواجہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ — 2 خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ
3 خوامہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ — 4 خواجہ محمد فرخ رحمۃ اللہ علیہ
5 خواجہ محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ — 6 خواجہ محمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ
7 خواجہ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ

صاحبزادیوں کے اسماء مبارکہ یہ ہیں۔

1 محترمہ بی بی رقیہ بانو جن کا شیر خوارگی میں ہی انتقال ہو گیا۔
2 محترمہ بی بی ام کلثوم جن کا چودہ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔
3 محترمہ بی بی خدیجہ بانو آپ جوانی کو پہنچیں۔ شادی بھی ہوئی اور اولاد بھی،

یہی وہ بخت آور صاحبزادی تھیں جس کی تربیت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ ہوئی اور سلوک کی منزلیں بھی طے کیں۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزدگان اپنے جذب وسلوک کے حوالے سے یہ حق رکھتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک کا تفصیلی تذکرہ ہو مگر اختصار کی خاطر صرف تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

1 خواجہ محمد صادق:

صاحبزادگان میں سے سب سے بڑے تھے۔ نوعمری ہی میں سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے تھے آٹھ سال کے تھے کہ اپنے والد گرامی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حضور حاضر ہوئے تھے اور شفقت سے نوازے گئے۔ علوم وفنون میں مہارت حاصل کی کہ بڑے بڑے علماء بھی معترف ہوئے اکیس سال یعنی 1021ھ میں خلافت سے نوازے گئے مگر عمر نے وفانہ کی، طاعون وبائی شکل میں یوں پھیلی کہ بہت سے انسانوں کو لقمہ اجل بننا پڑا ان میں حضرت خواجہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جو 1024ھ کے ربیع الاول میں طاعون کا شکار ہوئے یوں شہادت حکمی میں داخل ہوئے آپ کی قبر پر خود حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے قبہ تعمیر کرایا اور جب حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو فرزند اکبر کے قبے ہی میں دفن ہوئے۔

2 خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دوم تھے۔ مجددی نگرانی میں پرورش پائی۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ اور ایک فاضل عالم شیخ محمد طاہر لاہوری سے

درسیات کی کتابیں پڑھیں۔ نوعمری ہی میں مدرس ہوگئے۔ مشکوٰۃ المصابیح پر تعلیقات آپ کا فنِ حدیث میں یادگار شہکار ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مکاشفات پر جب معاندین کی طرف سے اعتراضات اٹھائے گئے تو دفاع میں آپ ہی نے قلم اٹھایا، زیارت حرمین کے دوران میں کئی مکاشفات کا ظہور ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر آپ سے دلی محبت رکھتا تھا اُس کے مسلسل اصرار پر آپ دہلی گئے۔ وہاں ہی بیمار ہوئے، بیماری جب زور پکڑنے لگی تو سرہند واپس آنے کی خواہش کی اور وہاں سے روانہ ہوگئے ابھی دہلی سے 36 میل ہی باہر آئے تھے کہ فرشتہ اجل آگیا اور آپ نے انتقال فرمایا۔ پالکی میں وہاں سے سرہند لایا گیا اور حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے قبہ ہی میں دفن کئے گئے۔ 27 جمادی الاخریٰ 1070ھ میں وصال ہوا۔ عمر مبارک پینسٹھ سال تھی۔ آپ کے بعد آپ کی اولاد جو آٹھ لڑکوں اور پانچ لڑکیوں پر مشتمل تھے آپ کے وارث بنے اور سلسلہ ہدایت جاری رہا۔

3 حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند سوم تھے 10 شوال 1007ھ کو سرہند شریف میں پیدا ہوئے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ آپ کی ولادت کو بہت مبارک گردانتے تھے کہ آپ کی ولادت کے بعد حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور سلسلہ نقشبندیہ سے نسبت قائم ہوئی تھی۔ ابتدائے عمر ہی میں تحصیل علم کا شوقِ فراواں تھا۔ اپنے والد گرامی، اپنے برادرِ اکبر خواجہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ اور

اس دور کے مستند عالم دین شیخ محمد طاہر بندگی لاہوری سے درسیات کی تکمیل کی۔ سولہ سال کے ہی تھے کہ اسناد سے نوازے گئے اور اپنے والد گرامی کے مشن کے سرگرم رکن بن گئے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات میں کئی بار آپ کا ذکر کرتے ہیں اور آپ کے عالی مرتبے کی نشاندہی کرتے ہیں حتّٰی کہ خلعتِ قیومیت کی بھی بشارت دی ہے۔ حرمین کی زیارت کے لئے بھی گئے اور وہاں بہت سی بشارتوں سے بہرہ مند ہوئے۔ حقیقت میں آپ ہی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند کے وارث بنے اور سلسلہ مجددیہ کی اشاعت کے نگران ہوئے۔ طویل عرصہ تک متلاشیان علم وسلوک کی راہنمائی فرماتے رہے۔ وجع المفاصل کی تکلیف تھی جو لگاتار بڑھتی گئی اور آخر 9 ربیع الاول 1079ھ میں خود سورہ یٰسین پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے اور سرہند شریف ہی میں دفن ہوئے شاہجہان کی چھوٹی صاحبزادی روشن آراء بیگم جو آپ کی انتہا درجہ کی عقیدت مند تھی نے آپ کی قبر انور پر ایک شاندار گنبد تعمیر کرایا اور دلی جذبوں کے ساتھ سونے کا کام کرایا۔ اس طرح سرہند میں ایک اور زیارت گاہ قائم ہوگئی۔

4 حضرت خواجہ محمد فرخ رحمۃ اللہ علیہ

چوتھے صاحبزادے تھے 1014ھ میں پیدا ہوئے، تربیت کے مراحل ہی میں تھے کہ گیارہ سال کی عمر میں طاعون کی وبا کا شکار ہوگئے اور اپنے دادا خواجہ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ مزار میں دفن ہوئے۔

5 حضرت خواجہ محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے پانچویں صاحبزادے تھے 1017ھ میں پیدا

ہوئے ابھی نوعمر ہی تھے یعنی صرف آٹھ سال کے تھے کہ طاعون کے حملے کی زد میں آگئے اور انتقال فرمایا۔ اپنے جدامجد حضرت خواجہ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے احاطہ میں سپرد خاک ہوئے۔

6 حضرت خواجہ محمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ

چھٹے صاحبزادے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی دو سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

7 حضرت خواجہ محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے 1024ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں تربیت پائی، علم کے حصول کا بہت شوق تھا۔ والد گرامی کی وفات کے بعد بھی یہ شوق جاری رہا اور اپنے بزرگ برادران یعنی خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا سلسلہ جاری رکھا۔ درسیات کی تمام کتب پڑھیں سب سے بڑا شرف یہ حاصل ہوا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے سند حدیث حاصل کی، ابھی بچے ہی تھے کہ حضرت شاہ سکندر کیتھلی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ کمال کیتھلی کے پوتے تھے نے آپ کو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے مانگ لیا، گود میں لیا اور اپنی نسبت عطا کی اس لئے آپ شاہ جیو کہلاتے تھے کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ جب جوان ہوئے تو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے خواجہ عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے نکاح ہوا اس طرح ۔ گھر حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کا مخزن بن گیا۔ 1067 میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ انور کے لئے اپنے برادران کے ساتھ گئے۔ دو دفعہ حج کیا، سرہند میں ایک عالی شان مسجد بنوائی اور ساتھ

ہی مدرسہ قائم کیا، غرضیکہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کی توسیع کے لئے بھرپور محنت کرتے رہے، کثیر خلق خدا آپ کے فیوض و برکات سے متمتع ہوئی آخر 27 جمادی الاخریٰ 1096ھ میں وفات پائی، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار انور سے مغرب کی جانب دفن ہوئے جس پر ایک عالیشان گنبد موجود ہے۔ سلطنت مغلیہ کے صاحب علم و عمل تاجدار اورنگ زیب عالمگیر کو آپ سے انتہا درجہ کی عقیدت تھی اس لئے وہ نذرانے پیش کرتا رہتا تھا۔

یہ تھے صاحبزدگان جو دین متین کے احیاء کی کوششوں میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ ان کے متوسلین شرق و غرب میں پھیلے، کابل وقندھار تک رحمت کے سایے ممتد ہوئے اور ماوراء النہر کا علاقہ بھی انہیں کی کوششوں سے منور ہوا۔

کارہائے نمایاں:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تریسٹھ سالہ زندگی کا لمحہ لمحہ اشاعت خیر، نشرِ حسنات اور ترسیخ عقائد کے لئے وقف رہا، دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاشرے میں برتر مقام دلانے میں آپ نے کبھی مداہنت نہ کی، جن معاملات میں رخصت کی سہولت بھی موجود تھی اس کو کبھی اختیار نہ کیا، حالات کے جبر اور بعض معاندانہ رویوں کے باوجود اعلائے کلمۂ حق کا فریضہ انجام دیا اور ہمیشہ عزیمت کی کٹھن راہ کو ہی اپنایا یہ اسی شب و روز محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ برصغیر کی فضا ویدانت کے سایوں سے پاک ہوئی، بھگتی تحریک اور دین الٰہی کے اثرات زائل ہوئے اور دین قویم کا روشن چہرہ پھر سے نور افشاں ہوا۔ یہی وہ انقلاب تھا جس کا احساس کرتے ہوئے علماء وقت نے آپ کو مجدد رحمۃ اللہ علیہ قرار دیا تھا۔

صوفیاء کے تذکروں کا جزو اعظم کرامات کا بیان ہوتا ہے۔ کسی مرض سے شفا کی دعا، کسی مشکل سے رہائی کی خوش خبری، کسی نافرمان کو دائرہ اطاعت میں لانے کی سعی، کرامات کے موضوع ہیں۔ کرامت یقیناً اولیاء اللہ کا اعزاز ہے جو پروردگار کی عطا ہے مگر یہ عطا، اطاعت شعاری کا دوام چاہتی ہے۔ جیسا کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طالب علم کے ذہن کی تسلی کے لئے فرمایا طالب علم خوارق کے ظہور پر پریشان تھا اُس کی ہدایت یوں فرمائی۔

"مولانا میں چالیس سال سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف ہوں، وہ جو کچھ فرماتا ہے میں اُس کی تعمیل کرتا ہوں اب چالیس سال کے طویل عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ طاقت عطا فرما دی ہے۔ کہ میں جو کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہی کچھ ہو جاتا ہے۔ 13

اطاعتِ مسلسل قرب الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور قرب مستجاب الدعوات بننے کا محرّک ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ ایسے واقعات کے کفیل ہوتے ہیں جو کرامات کہلاتے ہیں، کرامت عطا ہے پروردگار کا کرم ہے، یہ کوئی ذریعہ نمود نہیں، کرامات کا اظہار بھی ضروری نہیں کہ یہ ولایت کی شرط نہیں ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے شب و روز حق طلبی میں گزرتے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں بسر ہوتے رہے اس لئے آپ سے کرامات کا ظہور عین ممکن تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا، آپ کی بے شمار کرامات اور غیر محدود عنایات کا تذکرہ کیا گیا ہے مگر ہم آپ کی اُسی کرامت کو موضوع سخن بنا رہے ہیں جو امت مسلمہ کی مجموعی جمعیت کے لئے باعث کرامت تھی، ایک بیمار انسان کے حق میں دعا کرنا کہ وہ تندرست ہو جائے اور دعا قبول بھی ہو جائے تو یہ کرامت ہے مگر

یہ انفرادی کرامت محدود دائرے میں ظہور پذیر ہوتی ہے لیکن اگر کسی صاحب کرامت کی دعا اور مسلسل کاوش سے پوری قوم کی ذہنی امراض کا خاتمہ ہو جائے تو یہ کرامت معاشرتی پھیلاؤ رکھتی ہے، ایک بیمار کو شفا فراہم کرنا کرامت ہے اور اس کے لئے کسی ولی کی ضرورت ہے مگر قومی امراض کو شفا کی برکتوں سے سرفراز کر دینا کسی مجدد کا کام ہے۔ مجدد تجدید اذھان کرتا ہے، تزکیہ نفوس کا مرحلہ آسان کرتا ہے اور اُس کا مجددانہ کارنامہ پوری ملت کو محیط ہوتا ہے۔ پھر اس کرامت کے اثرات ایک ذات اور ایک عہد تک نہیں رہتے۔ اس کی آغوش میں ہر فرد ملت آجاتا ہے اور یہ فیضان صدی در صدی جاری رہتا ہے۔ اس خیال سے ہم انفرادی کرامات سے صرفِ نظر کر رہے ہیں اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی اُن کرامات کا ہی ذکر کریں گے جن سے پورا معاشرہ انقلاب آشنا ہوا۔ اور یہ انقلاب نسل در نسل منتقل ہوتا گیا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی میدان:

برصغیر مغلیہ سلطنت کے زیر نگیں تھا، مغلیہ ایک شخصی حکومت تھی جس میں کاروبار سلطنت کے ہر پہلو پر بادشاہ کی حکمرانی تھی، مغلیہ سنی مسلک مسلمان تھے اور ایسے علاقے سے آئے تھے جہاں نقشبندیہ طرز سلوک کو برتری حاصل تھی اس لئے مزاجاً یہ بادشاہ حنفی نقشبندی تھے مگر اقتدار ایک عفریت ہوتا ہے جو ہر نیک و بد ارادوں پر چھایا جاتا ہے اس لئے مجموعی روش کے برعکس شخصی رجحانات کی کارفرمائی نت نئے مسائل پیدا کر رہی تھی، بابر آندھی کی طرح آیا تھا اور بگولے کی طرح چلا گیا اس لئے برصغیر کی وہ معاشرت جو سلاطین کے دور سے مرتب ہو چکی تھی قائم رہی اور نئے

حکمرانوں کی وجہ سے کوئی معاشرتی بھونچال نہ آیا، بابر اپنے بعض خطا آمیز رویوں کے باوجود ایک مربوط شخصیت کا مالک تھا جس میں رجوع الی اللہ کے داعیات بڑے مضبوط تھے، ہمایوں کا دورِ اول کوئی نیا تاثر قائم نہ کرسکا کہ سوری حکومت آ گئی جو رفاہِ عوام کے لئے بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ ہمایوں کا تقریباً پندرہ سال ایران میں قیام متعدد ذہنی تحفظات کا سبب بنا کہ ایک سنی مسلک حکومت شیعہ نظریات کو بھی جگہ دینے لگی۔ بہت سے شیعہ علماء برصغیر آئے اور انہوں نے مقامی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے شیعہ نقطہ نظر کو فروغ دینے کی سعی کی، اکبر طویل عرصے تک حکمران رہا، والد کی تربیت کے فقدان کی وجہ سے اُس کے سارے رویے مجالس مذاکرہ کے سایوں میں ترتیب پائے تھے۔ وہ اپنے والد کی جلاوطنی کا بھی مشاہدہ کرچکا تھا اس لئے مضبوط سیاسی پیش رفت کا قائل ہوگیا تھا۔ اس کے لئے ایک مربوط حکمت عملی بھی اپنائی جاسکتی تھی مگر اُس کے نورتن اپنے اپنے مفادات کو تقویت دے رہے تھے۔ راجپوت بیگمات کا حرم پر قبضہ تھا اس لئے اکبر مذہبوں کی کشاکش کا شکار ہوگیا اور استحکام سلطنت کے لئے نئے دین کو تراشنے کی سوچنے لگا۔ بدقسمتی سے مفاد پرست علماء مقامی ویدانت سے متاثر صوفیاء اور باہر سے آنے والے شیعہ علماء نے اُس کے اندر انتشار کو جنم دیا۔ کچھ دانش کے دعویدار ایسی روشنی اپنانے کی ترغیب دے رہے تھے جو شریعت اسلامیہ کے بجائے اُن کی تاویلات کی نخچیر رہے۔ شیعہ علماء عوام پر سنیت کے غلبے میں دراڑیں پیدا کرنے میں عافیت سمجھتے تھے اس طرح حکومت کا رویہ اسلامی تعلیمات سے پہلو تہی کا ہوگیا، جہانگیر اسی ماحول میں پروان چڑھا تھا اس لئے اصلاح احوال کی مجددانہ تحریک کے خلاف کمربستہ ہوگیا۔

یہ تھا ماحول جس میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو جہاد کرنا تھا راستی کا پیغام دینا تھا اور نظریات کی اصلاح کرنا تھی آپ کی کاوشوں کے متعدد رُخ تھے اور آپ کی مجاہدانہ سرگرمیاں متنوع تھیں، تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان امت ہر دور میں ہمہ وقت جہاد و مجاہدہ کے مشن پر کاربند رہی ہے۔ اگر بدر، اور خندق دفاع ملت کے میدان تھے تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی یثرب میں تبلیغی کاوشیں جہاد باللسان کی عمدہ مثال تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا دور جہاد بالسیف سے زیادہ جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کا تقاضا کررہا تھا، بدقسمتی یہ تھی کہ قلم پر فیضی و ابوالفضل جیسے اصحاب کا قبضہ تھا، ان کو عربی زبان جو دین کی زبان تھی اور فارسی زبان جو ثقافت کی زبان تھی پر عبور حاصل تھا۔ سواطع الالہام فیضی کی پرکاری اور حرف شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دفتر ابوالفضل کا حرف حرف ابوالفضل کی سطوت تحریر پر شاہد ہے۔ جہاد باللسان پر شیخ الاسلام کی مسند کے حریص قابض تھے۔ اور نت نئے فتنے اٹھا رہے تھے۔ مشکل صورتِ حال یہ تھی کہ مد مقابل کفر کا اعلان نہ کررہا تھا بلکہ مقابلہ ملفوف کفر سے تھا یہ جہاد تیز نگاہی کا متقاضی تھا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے یہی تیز نگاہی عطا کی تھی۔

سوچئے ماحول کیا تھا، ایک مسلم حکومت جس کا مسلمان ہونے کا دعویٰ تھا جو لا الہ الا اللہ کو تسلیم کرتی تھی مگر اکبر خلیفۃ اللہ کا لاحقہ بھی چاہتی تھی۔ ایوانِ اقتدار پر جلال الدین، کا قبضہ تھا مگر دین کا جلال کہیں نظر نہ آتا تھا، کفر اس قدر طاقتور ہوچکا تھا کہ حرم سراؤں پر اُس کا قبضہ تھا۔ ماتھوں پر سجدوں کے نشان ناپید ہورہے تھے مگر تلک دمک رہا تھا۔ ہندوانہ رسوم اسلامی تہواروں پر ترجیح پارہے تھے اور معاشرے کا ہر آہنگ شرک آشنا ہوتا جارہا تھا۔ ایسے ماحول میں اُس کرامت کی ضرورت تھی جو

ایک انسان کو ہی تبدیل نہ کرے معاشرے کا رُخ موڑ دے، ایسے دل خراش ماحول میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا عزم ملت کی پناہ بنا، آپ کے سامنے نمایاں مسائل یہ تھے۔

1 کفر کے سامنے ایمان کی سطوت ماند پڑ رہی تھی۔

2 اسلامی تہذیب اپنا اصل تشخص گم کرنے لگی تھی، اعمال، کردار حتّٰی کہ شناختوں میں بھی جھول آنے لگا تھا۔

3 ایرانی اثرات نے اہل سنت کے مستند اور واضح معتقدات کو متزلزل کر دیا تھا۔

4 ویدانت کے مارے صوفیوں کی سرمستیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی افضلیت سے انکار ہونے لگا تھا خلفشار کے ان اساسی محرکات کے علاوہ علماء کی جاہ پسندی نے دوراز کار مباحث کو درباری رویہ بنا دیا تھا، بنیادی عقائد پر اس قدر خلط مبحث ہونے لگا تھا کہ نظریاتی بغاوت جنم لینے لگی تھی۔ صوفیاء ہندو ماورائیت سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ تعلیمات پر جدلیت کے سیاہ بادل چھانے لگے تھے حتّٰی کہ تصوف کے چشمۂ صافی میں ویدانت کی گدلاہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذہنی ابتری اور عملی خلفشار کا سد باب اپنے حکیمانہ اسلوب سے کیا، اس کے لئے آپ نے چار محاذوں پر داد شجاعت دی کہ کفر کی دسیسہ کاری کے لئے چہار جانب حملہ ضروری تھا آیئے ان چاروں محاذوں کا سرسری سا تذکرہ کریں تا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے دفاعی حملوں کی افادیت نمایاں ہو جائے۔

1۔ کفر کے بارے میں آپ کا رویہ تعلیمات قرآن کا عکس تھا، فرماتے ہیں۔

"ہر شخص کے دل میں کسی نہ کسی امر کی تمنا ضرور ہوا کرتی ہے، اس فقیر کی تمنا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے دشمنوں کے ساتھ سختی کی جائے، ان بدبختوں کی اہانت کی جائے اور ان کے جھوٹے خداؤں کو ذلیل و خوار کیا جائے کفر سے نفرت اُن اعمال سے اجتناب کی محرّک بنتی ہے جو کفر کی ہمسائگی یا برسر اقتدار قوتوں کی مرعوبیت سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ 14

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اُس دور کی مضبوط حکومت کو کمزور کرنے کا رویہ اختیار نہیں کیا کہ اس سے مسلمان حکومت کے زوال اور کفر کی حکمرانی کی راہ کھل جائے گی، یہ بڑا دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ دلی نفرت کے باوجود کھلے تصادم کا راستہ نہ اپنایا گیا۔ آپ نے حکمرانوں کے بجائے اعیانِ حکومت کو اسیر محبت کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ خان اعظم، خان جہاں، شیخ فرید، مرتضیٰ خان اور دیگر بلند قامت افراد آپ کی توجہ کا مرکز رہے۔ آپ نے ان کے ساتھ مراسلت کا ایک وقیع سلسلہ شروع کیا اور اُن کو ذہنی طور پر قائل کر کے ان کے اثر و رسوخ اور قوت نافذہ کو اشاعتِ خیر کے لئے استعمال کیا۔

2 آپ نے سپہ سالاروں کو اعانت خیر کی ترغیب دیتے ہوئے خط لکھے مثلاً خانِ اعظم کو لکھا۔

"جب حق تعالیٰ نے بزرگوں کی محبت کی برکت سے آپ کی بات میں تاثیر بخشی ہے اور آپ کی مسلمانی کی عزت ہم سروں کی نظروں میں ظاہر ہے تو کوشش فرمائیں اور زیادہ نہ سہی تو اس قدر تو ہو کہ اہل کفر کے وہ احکام جو اہل اسلام میں شائع ہیں معدوم ہو جائیں اور اہل اسلام اُن کے بے ہودہ عملوں سے محفوظ رہیں۔ 15

شیخ فرید کو لکھا۔

''آپ کی ذات سے امید ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کو بادشاہ کا قرب پورے طور پر بخشا ہے تو شریعت محمدی ﷺ کے رواج دینے میں ظاہر و باطن کوشش کریں اور مسلمانوں کو اس کس مپرسی سے نکالیں۔ 16

اسی طرح اکثر عمائدین کو خطوط لکھے گئے جن کے اثرات بہت جلد ظاہر ہونے لگے۔ جہانگیر جو آداب گفتگو کا لحاظ بھی نہ رکھتا تھا جب اپنے سپہ سالاروں کی نفرت کا شکار ہوا اور مہابت خاں کے سامنے سرنگوں ہو گیا تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے اس شورش سے روک دیا اس حسن سلوک کا یہ اثر ہوا کہ جہانگیر کی نخوت کا پندار ٹوٹا اور حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی شرائط کے سامنے جھک گیا۔ پھر یہ اثرات اس کے بعد شاہجہاں کے کردار اور اورنگ زیب کی سیرت میں دیکھے جا سکتے ہیں، یوں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے قلمی جہاد میں سرخرو ہوئے۔

3 اسلام دین علم و عمل ہے۔ ازدیاد علم کی دعا تو وحی الٰہی میں شامل ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں میں غیر نافع علم سے اجتناب کا بھی ذکر ہے۔ تمنائے علم اور غیر نافع سے اجتناب کی خواہش کی حدود کا احساس ہی اسلامی تعلیمات کا حسن ہے برصغیر کے ماورائی علوم نے یقین کو متزلزل کیا، اس بے یقینی میں جب نفسانی خواہشات اور مادی ترجیحات بھی شامل ہو گئیں تو عجب خلفشار پیدا ہوا۔ وہ دور ایسی ہی علمی موشگافیوں کا نخچیر تھا، دربار شاہی ہمہ وقت مناظروں اور مجادلوں کا مرکز بنا رہا، فسادِ عقلی کو سرکاری پناہ نصیب ہوئی جس سے علماء کی صفوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ یہ ماحول کسی مجدد کا منتظر تھا۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ایسا مجدد برصغیر کی مسلم آبادی کو مل

گیا۔ علمی برتری کے دعویداروں کے سامنے اب ایک ایسا صاحب علم تھا جو قرآن و حدیث کے چشمہ فیض سے بھی سیراب تھا اور منطق و استخراج کی برتر صلاحیت کا بھی حامل تھا۔ آپ نے ہر موضوع پر بے تکان لکھا اور اس وثوق سے لکھا کہ جاہ پرستوں کا ہر منطقی استخراج زیر پا آ گیا۔ حقیقت میں یہی وہ تجدیدی کارنامہ تھا جس کی بنا پر آپ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کہلائے۔ یہ مشکل جہاد تھا مگر آپ نے کمال مہارت سے اس کا حق ادا کیا کہ نہ سطوتِ علم پر زد پڑی اور نہ بے راہ روی کو استقلال حاصل ہوا۔ علم نافع کا یوں ذکر کیا کہ ایسے علماء ''انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، مخلوقات میں سے بہتر یہی علماء ہیں کہ کل قیامت کے روز ان کی سیاہی فی سبیل اللہ شہیدوں کے خون کے ساتھ تولی جائے گی تو ان کی سیاہی کا پلہ بھاری رہے گا ''نوم العلماء عبادۃ'' انہیں کے حق میں ثابت ہے۔ 17

مگر جب علماء کی علم فروشی پر نظر پڑی تو یہاں تک لکھ دیا کہ

''سمجھ نہیں آتی کہ کیا لکھوں جس طرح مخلوقات کی خلاصی علماء کے وجود سے وابستہ ہے جہان کا فساد بھی انہیں پر منحصر ہے۔ علماء میں سے بہتر تمام جہان کے انسانوں سے بہتر ہیں اور علماء میں سے بدتر عالم تمام جہان کے انسانوں سے بدتر ہے کیونکہ تمام جہان کی ہدایت و گمراہی انہیں پر موقوف ہے۔ 18

مزید ارشاد فرمایا۔

''علماء بد دین کے چور ہیں، ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلق کے نزدیک مرتبہ و ریاست و بزرگی حاصل ہو جائے۔ 19

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کی اس روش پر بڑا دکھ تھا کہ علماء خوشامدی رویوں

سے دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اس طرح وہ اُس بادشاہ کو جوسات پشت سے مسلمان اہل سنت حنفی تھا اور غلار ہے ہیں۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علم کی صیانت شریعت مطہرہ کی مطابقت سے ہی ممکن ہے اس لئے آپ نے ارشادات نبویہ کی پناہ میں رہنے کی بار بار تاکید فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین متین کا احیاء ہوا، سچی بات یہ ہے کہ فتاوی عالمگیری کا شاہکار انہیں مجددی کارناموں کا نتیجہ ہے یہ جہاد کس قدر کامیاب ہوا تاریخ برصغیر اس پر شاہد ہے۔

4۔ چوتھا محاذ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے سب سے اہم تھا یہ تصوف اور اہل تصوف کے حوالے سے تھا، تصوف جو جلائے باطن کی تحریک تھا اور ایسا چشمہ صافی تھا کہ اس میں اسلامی تعلیمات کا پورا حسن جلوہ گر تھا بدقسمتی سے عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً غیر محمود رجحانات اور مفسداتِ اعمال کی وجہ سے گدلا ہو چکا تھا، عقیدتوں کا استیصال ہو رہا تھا اور عقائد میں بے ترتیبی جنم لے رہی تھی یہ فساد متعدد جہتیں اختیار کر چکا تھا مثلاً

ا۔ احکام شریعت سے انحراف ہونے لگا تھا۔

ب۔ فساد نظری اس حد تک تھا کہ مقام نبوت سے صرفِ نظر ہونے لگا تھا، کشف وکرامات پر اس قدر بھروسہ بڑھ گیا تھا کہ وحی والہام کی حتمیت سے انکار ہونے لگا تھا۔

ج۔ ریاضتوں اور مجاہدوں نے اپنی برتری کا خمار پیدا کر دیا تھا، دعاوی اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ولایت کے دعویدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمتوں سے انکار کرنے لگے تھے۔

د۔ ہندو تہذیب وثقافت کے زیر اثر ایسے اعمال اپنائے جا رہے تھے کہ مشرکانہ رویے راہ پا رہے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت کی عظمت اور حتمیت پر اس قدر زور دیا کہ طریقت وحقیقت کے دعویداروں کو اس کی متابعت کا واضح درس ملا بار بار فرمایا کہ

''طریقِ صوفیاء پر سلوک کرنے سے مقصود یہ ہے کہ معتقدات شرعیہ جو ایمان کی حقیقت ہیں کا زیادہ یقین حاصل ہو جائے اور فقہی احکام کے ادا کرنے میں آسانی پیدا ہو''۔20

مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

''شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو محقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت حاصل ہوگئی تو گویا حق تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگئی۔21

مزید تاکید فرمائی۔

''شریعت تمام کمالات کی ماں اور تمام مقامات کی اصل ہے۔ شریعت کے نتائج وثمرات صرف اس دنیاوی جہاں پر موقوف نہیں بلکہ آخرت کے کمالات اور دائمی ناز ونعمت بھی شریعت کے نتائج وثمرات میں سے ہیں۔22

قیامت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

''جوبات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے اور احوال ومواجید، علوم ومعارف اور اشارات ورموز اگر اس متابعت کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہتر اور زہے قسمت ورنہ سوائے خرابی اور استدراج کے کچھ نہیں''۔23

آخری فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا۔

''بزرگی سنت کی تابعداری پر وابستہ اور زیادتی شریعت کی بجا آوری پر منحصر ہے مثلاً دوپہر کا سونا جو اس تابعداری کے باعث واقع ہو کروڑ کروڑ شب بیداریوں سے جو اس تابعداری کے موافق نہ ہو۔ اولیٰ اور افضل ہے اور ایسے ہی عید الفطر کے دن کا کھانا جس کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ خلافِ شریعت دائمی روزہ رکھنے سے بہتر ہے، شارع علیہ السلام کے حکم پر چیتل کا دینا اپنی خواہش سے سونے کا پہاڑ خرچ کرنے سے بزرگ تر ہے۔ 24

نظریاتی الجھنیں جو ملت اسلامیہ کو انتشار کا شکار کر رہی تھیں میں نمایاں ترین تصور بھی تھا کہ مقامِ ولایت بعض حوالوں سے مقام نبوت سے بلند تر ہے اور یہ کہ کشف کی حتمیت نبوی احکام کی طرح ہے اس پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی مضبوط گرفت دیکھئے۔

'احکام شرعی میں سے ایک حکم کا بجالانا نفسانی خواہشوں کو دور کرنے میں ان ہزار سالہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے جو اپنے پاس سے کئے جائیں کئی درجہ بہتر ہے بلکہ ایسی ریاضتیں اور مجاہدے جو شریعت شریفہ کے موافق نہ ہوں نہ کئے جائیں۔ 25

صوفیاء داعیانِ خیر ہوتے ہیں بے عملی بلکہ بدعملی کے محرک نہیں ہوتے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ سنئے۔

''نجات کا طریق اور خلاصی کا راستہ اعتقادی اور عملی طور پر صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے۔ پیر واستاد اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ شریعت کی طرف ہدایت وراہنمائی کریں اور ان کی برکت سے شریعت کے

اعتقاد اور عمل میں آسانی وسہولت حاصل ہو نہ کہ مرید جو کچھ چاہیں کریں اور جو کچھ چاہیں کھائیں اور پیر اُن کے لئے ڈھال بن جائیں اور عذاب سے بچالیں کہ یہ ایک غلطی اور بے ہودہ آرزو ہے۔ 26

حتمی اور آخری فیصلہ سناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پس صوفیاء کا جو کلام علماء اہل سنت و جماعت کے اقوال کے موافق ہے وہ قبول ہے اور جو ان اقوال کے مخالف ہے وہ مردود ونامقبول ہے۔ 27

صوفیاء کے بڑے بڑے دعوے کہ وہ رویت باری سے مشرف ہوتے ہیں۔ ہم کلام ہوتے ہیں اور اپنے مشاہدوں کو معراج نبوی سے مشابہ قرار دیتے ہیں حتّٰی کہ احکام بلا فصل کا اعلان کرتے ہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ ان تمام دعاوی کا مضبوط دلائل کے ساتھ رد کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

''صوفیاء وقت بھی اگر کچھ انصاف کریں اور اسلام کے ضعف اور جھوٹ کی کثرت کا ملاحظہ کریں تو چاہیے کہ سنت کے ماسوا میں اپنے پیروں کی تقلید نہ کریں اور اپنے شیوخ کا بہانہ کر کے امور مخترعہ پر عمل نہ کریں اتباع سنت بے شک نجات دینے والی اور خیرات وبرکات بخشنے والی ہے اور غیر سنت کی تقلید میں خطر در خطر ہے۔ 28

ایک اور مکتوب میں چلہ کشی اور من پسند ریاضتوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''صوفیاء کرام ذکر وفکر ضروری سمجھ کر فرضوں اور سنتوں کے بجالانے میں سستی کرتے ہیں اور چلہ اور ریاضتیں اختیار کر کے جمعہ وجماعت کو ترک کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ایک فرض کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا اُن کے ہزاروں چلوں سے بہتر ہے۔ 29

تصوف کے بعض دائروں میں یہ گمراہ کن خیال بھی پیدا ہونے لگا تھا کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بعض معاملات اور بعض حالات میں برتر ہو سکتے ہیں، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خیال کی تردید میں پوری قوت کے ساتھ دلائل دیئے اور واضح کر دیا کہ ولی برحق خواہ کس قدر مقام و مرتبہ کا حامل ہو وہ صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"بدنوں کے قرب کو دلوں کے قرب میں بڑی تاثیر ہے، یہ وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ باوجود اس قدر بلند مرتبہ ہونے کے چونکہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں حاضر نہیں ہوئے ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ کسی شخص نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز تو جواب فرمایا کہ وہ غبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں داخل ہوا، عمر بن عبدالعزیز سے کئی درجے بہتر ہے۔ 30

جہاں تک مقامی آبادی ہندوؤں کے نظریات وعقائد کی دخل اندازی کا تعلق ہے تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بھی نہایت واضح موقف اپنایا ہے۔ بدقسمتی سے رام وکرشن کی حکایات نے بعض دلوں میں اُن سے گرویدگی کو جنم دیا تھا جس سے وحدتِ ادیان کا تصور ابھرنے لگا تھا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا سختی سے رد کیا، فرماتے ہیں کہ

"رام وکرشن جو ہندوؤں کے معبود ہیں اللہ تعالیٰ کی کم تر مخلوق میں سے ہیں ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں رام دسرتھ کا بیٹا، لچھمن کا بھائی، عقل دور اندیش سے

کام لینا چاہیے اور ان کی تقلید پر نہ چلنا چاہیے۔ بڑی عار کی بات ہے کہ کوئی تمام جہانوں کے پروردگار کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کرے۔ 31

امتیازِ اسلام کا پرچم ہر سطح پر بلند رکھنا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا دستور تھا اس حوالے سے آپ اتنے خوددار تھے کہ ناموں کی شراکت بھی برداشت نہ کرتے تھے یہ اطلاع ملی کہ ایک مسلمان شاعر نے کفری تخلص رکھا ہے تو مضطرب ہو گئے اور واضح کر دیا کہ یہ راستہ محبتِ کفر کی طرف لے جاتا ہے رام ورحیم کی ہم منصبی پر بھی ضرب لگائی تاکہ شرک کے میلان کا ہر باب بند ہو جائے۔

الغرض حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے عقیدہ سے عمل تک علماء سے صوفیاء تک، ماورائیت سے روحانیت تک بھرپور جہاد کیا، کسی قتال کے بغیر، کسی کی جان لئے بغیر، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر الحاد و بے دینی کے طوفان سے محفوظ رہا اور مسلمان اپنے عقائد ونظریات کو بچانے میں کامیاب رہے، یہ جہاد مشکل تھا کہ مدمقابل زیادہ تر مسلمان تھے بے عمل علماء بے راہ صوفی، خودنگر اعیانِ حکومت اور مغرور ومتکبر حکمران سب سے محاذ آرائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس دور میں اسلام پر چوبائی حملہ تھا مگر برصغیر کی خوش بختی کہ دفاع میں ایک ایسا وجود موجود تھا جو نہ طاقت کے جبر سے خائف تھا اور نہ کسی دعویدار دانش کی چرب زبانی سے مرعوب تھا۔ الغرض حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے محسن تھے جن کے احسانات ہمہ گیر تھے اور آج تک ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تطہیر عقائد اور تقویم اعمال کی ذمہ داری آپ کے صاحبزادگان نے پوری شعوری قوت کے ساتھ نبھائی، خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ محمد یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں خدمتِ دین کا فریضہ

انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ آپ کے متعدد خلفاء نے اس حوالے سے نہایت کامیاب کوشش کی ۔آپ کے خلفاء کی ایک کثیر تعداد شرق وغرب میں پھیل گئی۔ برصغیر کے بھی طول وعرض میں مجددی سلسلہ کی شاخیں قائم ہوئیں اور بڑی نمایاں شخصیات اس سلسلے سے منسلک رہیں۔

خلفاء:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اشاعتِ دین اور نشرِ حسنات کے لئے اپنے متوسلین کو دور دراز علاقوں میں بھیجا ان کے علاوہ وہ ارادت مند جو اطراف واکناف سے حاضر ہوئے اُن کی تربیت کرے اپنے معیار پر تیار کیا اور واپس اپنے اپنے ملکوں میں بھیج دیا تاکہ ہر جانب ہدایت کا پیغام پہنچے۔ اس طرح متعدد عقیدت مندوں کو خلافت سے نواز کر پھیلا دیا کہ مجددی پیغام گھر گھر پہنچا۔ وہ خوش بخت جو اس کارِ خیر کے اہل گردانے گئے انہوں نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ اصلاح کو بہت تقویت پہنچائی، یوں یہ سلسلہ مجددیہ عرب وعجم تک ممتد ہوا۔ خلفاء کی تعداد بہت ہے صرف چند کا حوالہ نقل کرتے ہیں۔

میر سید محمد نعمان رحمۃ اللہ علیہ

بدخشاں کے رہنے والے تھے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تربیت کے بعد حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس طرح تربیت کے آخری مراحل حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ طے کئے، دکن میں مقبولیت پائی، برہان پور میں زیادہ قیام رہا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد مکتوبات آپ کے نام

لکھے 18 صفر 1058ھ میں وفات پائی اور اکبر آباد میں دفن ہوئے۔

شیخ نور محمد پٹنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے نمایاں خلفاء میں سے تھے، زیادہ عرصہ پٹنہ میں گزارا اس لئے پٹنی مشہور ہوئے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے چھ مکتوب آپ کے نام ہیں۔

شیخ حمید بنگالی رحمۃ اللہ علیہ

بنگال کے رہنے والے تھے، ابتداء میں سلوک کی منزلوں سے غافل تھے مگر ایک مرتبہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ لیا تو گرویدہ ہوگئے، کہتے ہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی پاپوش کو مرکز توجہ بنا رکھا تھا، وفات پر بھی سرہانے رکھ دی گئی، شاہجہان آپ کا معتقد تھا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے نام پانچ مکتوب لکھے تھے 1050ھ میں وفات پائی۔

شیخ محمد طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ

لاہور سے تعلق تھا، حافظ قرآن تھے اور علوم نقلیہ میں مہارت رکھتے تھے ابتداء میں کچھ بھٹکے مگر جلد ہی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ سے سنبھل گئے، استغناء حد درجہ کا تھا، کتابت کرکے روزی کماتے تھے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت عطا کی اور لاہور واپس بھیج دیا بلکہ لاہور کا قطب بنا دیا 1040ھ میں وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

شیخ بدیع الدین سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ

سہارن پور کے رہنے والے تھے، سرہند آگئے اور کبھی کبھی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے مسلسل توجہ نے بے خود کر دیا اور سہارن پور روانہ کر دیا،

دارالحکومت آگرہ میں قیام کا حکم ہوا مگر بغیر اجازت واپس آ گئے اگرچہ دوبارہ آگرہ چلے گئے مگر آخر کار سہارن پور ہی میں قیام کرلیا، 1042ھ میں سہارن پور ہی میں وفات پائی۔ آپ کے نام حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً دس مکتوب ہیں۔

حاجی خضر خاں افغان رحمۃ اللہ علیہ

سرہند شریف کے مضافات کے رہنے والے تھے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے اور آپ کے والد گرامی سے صحبت رہی، سچے عاشق تھے اور دربار مجددیہ میں اذان دیتے تھے، نہایت درجہ کے خوش الحان تھے اس لئے آپ کی آواز گونجتی رہتی تھی، 1034ھ میں وفات پائی اور سرہند ہی میں دفن ہوئے۔

مولانا بدرالدین سرہندی رحمۃ اللہ علیہ

سرہند شریف کے رہنے والے تھے۔ تقریباً سترہ برس حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے۔ زہد وتقویٰ مثالی تھا، صاحب تصنیف بزرگ ہیں، حضرات القدس جو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے مشائخ کے حالات پر بنیادی کتاب ہے آپ کی تالیف ہے۔ دو جلدوں میں ہے پہلے حصے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کے حالات ہیں اور دوسرے حصے میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی اولاد وخلفاء کا ذکر ہے۔

مولانا محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے نمایاں خلفاء میں سے ہیں نیک اور صاحب نسبت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے کشم جو بدخشاں کے علاقہ میں ہے کے رہنے والے ہیں،

برصغیر آئے، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ میر محمد نعمان رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق پیدا ہوا۔ اس قدر قرب ہوا کہ اُن کی بیٹی سے شادی ہوگئی، پھر اُن کی معرفت حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ ہوا جو دائمی ہوگیا، دوسال تک تو سفر وحضر کے ساتھی رہے، مکتوبات کی تیسری جلد کی تدوین انہی کی نگرانی میں ہوئی، برہان پور کو مسکن بنالیا اور وہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک کتاب ترتیب دینے لگے ابھی ابتداء ہی تھی کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا پھر تو دن رات آپ کے اور آپ کے خاندان کے حوالے سے لکھنا شروع کیا اور ایک معروف ومتداول کتاب زبدۃ المقامات مرتب کردی، اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے بعض منتشر مسودات بھی اکھٹے کئے اور مکاشفات عینیہ تیار ہوگئی عمر کا آخری حصہ برہان پور میں بسر کیا اور 1054ھ میں برہان پور ہی میں انتقال فرمایا، نہایت پاکباز وجود رکھنے والے اس مرد قلندر کی جاذبیت نے بے شمار لوگوں کو متوجہ کرلیا تھا۔

شیخ سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ

سادات خاندان کے چشم وچراغ تھے، خاندان ہجرت کر کے سرہند شریف کے مضافات بنور میں آباد ہوگیا تھا۔ جوان ہوئے تو لشکر شاہی میں ملازمت کرلی مگر جلد ہی کنارہ کش ہوگئے اور راہ سلوک اختیار کیا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حاجی خضر خان افغان رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آگئے مگر بے تابی بڑھتی گئی۔ حاجی صاحب نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کردیا جو اُس وقت اجمیر شریف میں تھے۔ بس پھر اسی دربار کے ہورہے۔ خصوصی توجہ سے نوازے گئے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی

وفات کے بعد بھی دو سال تک وہیں حاضر رہے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لاکھوں لوگ حاضر رہتے، مریدوں کی تعداد چار لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جن میں ایک ہزار کے قریب خلفاء تھے۔ 1052ھ میں لاہور تشریف لائے تو دس ہزار عقیدت مند ہمراہ تھے۔ شاہجہان نے حج پر جانے کا کہا تو روانہ ہوگئے، روضہ رسول ﷺ پر مع اہل وعیال حاضری دی اور وہیں قیام کرلیا، خوش بختی یہ ہوئی کہ مدینہ منورہ ہی میں 1054ھ میں انتقال فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روضہ کے قریب دفن ہوئے۔ عمر صرف 47 سال تھی۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں۔

ان نامور خلفاء کے علاوہ بھی کئی نام ہیں جو مختلف علاقوں میں موجود رہے ان میں ایک نمایاں نام شیخ عبدالحی حصاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے جو مکتوبات کی جلد ثانی کے مرتب ہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے نام بعض مکتوب بھی تحریر فرمائے تھے۔ شیخ احمد برکی کے نام بھی متعدد مکتوب ہیں دیگر خلفاء میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

شیخ یار محمد قدیم طالقانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ یار محمد جدید طالقانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ کریم الدین حسن ابدالی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ عبدالهادی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ حسن برکی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا امان اللہ رحمۃ اللہ علیہ

اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں صاحبزادے

شیخ عبیداللہ المعروف خواجہ کلاں رحمۃ اللہ علیہ اور

شیخ عبداللہ المعروف خواجہ خورد رحمۃ اللہ علیہ

اور کئی دیگر صاحبانِ مسند وسجادہ

اب ہم ایک ایسے نام کا تذکرہ کرنے والے ہیں جن کا سلسلہ مسلسل چلا اور موڑہ شریف اور نیریاں شریف تک پھیلا۔

حوالہ جات

1 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:207-206

2 جواہر نقشبندیہ ص:264

3 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص:410

4 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص:264

5 تاریخ مشائخ نقشبند محمد صادق قصوری ص 313

6 تاریخ مشائخ نقشبندیہ صاحبزادہ عبدالرسول ص 361

7 جواہر نقشبندیہ محمد یوسف مجددی ص 271-272

8 حوالہ مذکورہ

9 حوالہ مذکورہ ص:272

10 مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر 2

11 انوار لاثانی ص:342

12 مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر 123

13 مخزن چشت ص:220

14 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 269

15 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 65

16 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 47

17 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 33

18 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 53

19 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 164

20 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 207

21 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 36

22 مکتوبات جلد ثانی مکتوب نمبر 46

23 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 184

24 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 14

25 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 56

26 مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر 41

27 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 89

28 مکتوبات جلد دوم مکتوب نمبر 23

29 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 260

30 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 207

31 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 167

25۔حضرت خواجہ سید حسین رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یافتہ متوسلین میں نہایت اہم وجود کا نام سید حسین رحمۃ اللہ علیہ جو سادات کرام سے تھے اور حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے اخلاف میں سے تھے کہ دس واسطوں سے آپ سے منسلک ہیں۔والد گرامی کا نام سید احمد بن شریف الدین قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہے جن سے نسبتِ ارادت بھی رکھتے ہیں اس لئے سلسلہ قادریہ سے بھی فیض حاصل کیا مگر پھر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے چشمۂ فیض پر حاضر ہوگئے اور نقشبندی نسبت سے نوازے گئے مانک پور کے رہنے والے تھے،اس بعد مکانی کی وجہ سے حاضری کم رہی مگر تعلق اس قدر مستحکم تھا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جو عرضداشت مکاتیب کی شکل میں پیش کرتے تھے اُن میں حضرت سید حسین رحمۃ اللہ علیہ کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں،یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس مرید خاص کی یاد پیرکامل کے دل میں سدابسی رہی ہے۔ذکر کا مقصود صرف تعارف نہیں تھا بلکہ علو مرتبت کا اظہار تھا اور صلاحیت باطن کا اعتراف تھا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ طریقت کو اپنے احباب کے سیر وسلوک کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

عریضہ لکھنے کے دن پیر سید شاہ حسین نے اپنی مشغولی اور مراقبہ میں ایسا دیکھا کہ گویا ایک بڑے دروازہ پر پہنچا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ دروازہ حیرت ہے اس کے اندر جو نظر کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور اس خاکسار کو دیکھتا ہے اور ہر چند کوشش کرتا ہے

کہ اپنے آپ کو اس کے اندر ڈالے لیکن اس کے پاؤں یاری نہیں کرتے۔1

یہ حضرت شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص کا مظہر ہے کہ اپنے مرید کو اُس دروازہ حیرت کے قریب پاتے ہیں جہاں سے وصل کی آخری منزل نظر آتی ہے۔اس نارسائی کا مرشد گرامی کو ملال ہے کہ آپ اُس مرید صادق کو وصل کی منزل پر دیکھنا چاہتے ہیں اس کا اظہار بھی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو لکھے گئے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

''میاں شاہ حسین توحید وجودی کا طریق رکھتا ہے اور اس میں محفوظ ہے دل میں آتا ہے کہ وہاں سے اس کو نکالا جائے تاکہ حیرت تک جو اصلی مقصود ہے پہنچ جائے۔2

یہ سفر تھا توحید وجودی سے توحید شہودی کا کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید خاص کو اپنے احوال میں ضم کر لینے کی خواہش رکھتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشدِ کریم رحمۃ اللہ علیہ کو کس قدر عزیز تھے حضرت شیخ کی یہ خواہش اور یہ تمنا بہت جلد رنگ لائی اور مرید گرامی سایہ مرشد سے متمتع ہونے لگے، اس کا اظہار حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد گرامی حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مکتوب میں کیا ہے۔

''سید شاہ حسین بھی مقام جذبہ سے اخیر نقطہ تک پہنچ گیا ہے اور اس کے سر نقطہ تک پہنچ گیا ہے اور ایسے ہی صفات کو ذات سے جدا دیکھتا ہے لیکن ذات احد کو سب جگہ پاتا ہے اور ظہور سے محفوظ ہے۔''3

ان مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اپنے متوسلین کو کس

طرح راہِ سلوک کی سیر کراتے تھے اور کس طرح مبتدیئوں کو انتہائے کمال تک لے جانے کی استطاعت رکھتے تھے اور یہ بھی کہ ان کامیابیوں سے اپنے مرشد کریم کو باخبر رکھتے تھے کہ تربیتِ سالکین کے انداز واطوار شیخ کریم کی نظر میں رہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مجدد ؒ اپنے شیخ کریم کی راہنمائی میں کامیابی کے سفر کی توثیق چاہتے ہیں اور اس کے لئے اپنے متوسلین کی صلاحیت کو بطور معیار پیش کر رہے ہیں۔ اس سے سید شاہ حسین ؒ کے مقام ومرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے۔

حضرت مجدد ؒ نے اپنے طریق نقشبندیت کی وضاحت اور اس سلسلے کی عظمت کے بیان کے لئے سید شاہ حسین ؒ کو مخاطب کیا ہے۔ مکتوبات میں ایک طویل مکتوب جو نقشبندی سلسلے کے امتیازات کے بیان کے لئے وقف ہے سید شاہ حسین ؒ کو ہی لکھا ہے۔

مکتوب کی ابتداء بڑے مانوس انداز اور محبت آمیز لہجے میں ہوئی ہے فرماتے ہیں۔

''میرے عزیز بھائی! سیادت پناہ میر سید حسین نے دور پڑے ہوؤں کو فراموش نہ کیا ہوگا اور اس طریقہ علیہ کے آداب کی رعایت کو جو مشائخ کرام کے تمام طریقوں سے کئی وجہ سے ممتاز ہے، ہاتھ سے نہ دیا ہوگا، چونکہ آپ کو ملاقات کی فرصت کم ملی اس لئے مطلب کو مدنظر رکھ کر اس طریقہ علیہ کی بعض خصوصیتوں اور کمالات کو علوم بلند ومعارف ارجمند کے ضمن میں لکھتا ہے''۔ 4

پھر اس طریق کی خصوصیت اور امتیازات کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں۔

اے برادر، اس بلند طریق کے سرِ حلقہ حضرت صدیق اکبر ؓ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے بعد تحقیقی طور پر تمام بنی آدم سے افضل ہیں اور اسی اعتبار سے اس طریق کے بزرگواروں کی عبارتوں میں آیا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ ان کی نسبت جس سے مراد حضور اور آگاہی ہے بعینہ حضرت صدیق ؓ کی نسبت اور حضور ہے جو تمام آگاہیوں سے بڑھ کر ہے اور اس طریق میں نہایت اس کے ابتداء میں درج ہے۔ 5

اس کے بعد حضرت مجدد ؒ نے مکتوب الیہ کی سطوت علمی اور رفعت روحانی کے یقین کے ساتھ نقشبندیہ تصوف کے ایسے رموز سمجھائے ہیں کہ اُن کا فہم عام انسان کے بس کی بات نہیں، وصل ویاس کی وضاحت کی، تجلیات کی نہائت سے کیا مراد ہے اس پر تبصرہ فرمایا اور مشائخ کے نہایت وابتداء کی منزلوں کا ذکر کیا، سفر در وطن اور سیر انفسی کی وضاحت کے ساتھ خلوت وانجمن کے مدارج سمجھائے اور پھر ایک نقطہ کی وضاحت فرمائی۔

''اس طریق میں جذبہ سلوک پر مقدم ہے اور سیر کی ابتداء عالم امر سے ہے برخلاف اکثر دوسرے طریقوں کے اُن کے سیر کی ابتدا عالم خلق سے ہے اور اس طریق سلوک کی منزلیں جذبہ کے مراتب طے کرنے کے ضمن میں قطع ہو جاتی ہیں اور عالم خلق کا سیر عالم امر کے سیر میں میسر ہو جاتا ہے پس اگر اس اعتبار سے بھی کہیں کہ اس طریق میں انتہا ابتدا میں درج ہے تو گنجائش رکھتا ہے۔ 6

حضرت خواجہ نقشبند ؒ کا ایک ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

''ہمارا طریقہ سب طریقوں سے اقرب ہے اور فرمایا حق تعالیٰ سے

میں نے ایسا طریق طلب کیا ہے جو بے شک موصل ہو اور آپ کی یہ قبول ہو گئی ہے۔

پھر فرمایا کہ

''اس طریقہ علیہ کے بزرگواروں نے احوال و مواجید کو احکام شرعی کے تابع کیا ہے اور اذواق و معارف کو علوم دینیہ کا خادم بنایا ہے''۔7

پھر تاکیداً فرمایا:

''صوفیاء کی بے ہودہ باتوں پر مغرور و مفتون نہیں ہوتے اور ان کے احوال کو جو شرعی ممنوعات اور سنت سنیہ کے خلاف اختیار کرنے سے حاصل ہوں قبول نہیں کرتے اور نہ ہی اُنہیں چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سماع و رقص کو پسند نہیں کرتے اور ذکر جہر کی طرف توجہ نہیں کرتے''۔8

پھر حضرت خواجہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا کہ

''اس طریق میں پیری و مریدی طریقہ کے تعلم و تعلیم پر موقوف ہے نہ کلاہ و شجرہ پر جو مشائخ کے اکثر طریقوں میں مرسوم ہے''۔9

مرشد کے بعد دوسرے مرشد کی تلاش کا جو داعیہ اکثر ارادت مندوں میں پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی تجویز کے لئے علماء بخارا سے اس بات کا فتویٰ درست فرمایا تھا۔ ہاں اگر ایک پیر سے خرقہ ارادت لیا ہو تو پھر دوسرے سے خرقہ ارادت نہ لے اور اگر لے تو تبرک کا خرقہ لے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا پیر ہرگز نہ پکڑے بلکہ روا ہے کہ خرقہ ارادت ایک سے لے اور طریقت کی تعلیم دوسرے سے اور صحبتِ تیسرے کے ساتھ رکھے اور اگر یہ تینوں

دولتیں ایک ہی سے میسر ہو جائیں تو زہے قسمت و نعمت اور جائز ہے کہ مشائخ متعددہ سے تعلیم و صحبت کا استفادہ کرے۔10

پیر کیا ہے اس کی وضاحت فرمائی کہ

''پیر طریقت شریعت کا استاد بھی ہے اور طریقت کا راہنما بھی''۔

پھر مزید وضاحت فرمائی کہ

''نفسانی خواہشوں کا دور ہونا احکام شرعی کے بجالانے پر وابستہ ہے جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اس قدر ہوائے نفس سے دور تر ہوگا۔ کیونکہ نفس پر شریعت کے اوامر و نواہی کے بجالانے سے زیادہ دشوار کوئی چیز نہیں ہے اور صاحب شریعت کے سوا کسی چیز میں اس کی خرابی متصور نہیں ہے۔ وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کریں وہ معتبر نہیں ہیں کیونکہ جوگی اور ہندو و برہمن اور یونان کے فلسفی اس امر میں شریک ہیں اور وہ ریاضتیں اُن کے حق میں گمراہی کے سوا کچھ زیادہ نہیں کرتیں''۔11

مکتوب کے آخر میں خاموشی کے افادہ و استفادہ کا ذکر کیا اور فرمایا ''من عَرَفَ اللّٰہَ کَلَّ لِسَانُہٗ'' جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اُس کی زبان گنگ ہوگئی، معلوم ہوا حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کلام خاص کر بلند بانگ و عادی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس مکتوب کا حرف حرف حکمت و دانش کی تعلیم اور ریاضت و ارادت کے آداب سکھانے کے لئے وقف ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے یہ

مرید کس قدر صلاحیت رکھتے تھے کہ حضرت مجدد ؒ کا کلام مخاطب کی علمی وعلی استعداد کے مطابق ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم کہ سید شاہ حسین ؒ کو کثرت سے حاضری میسر نہ تھی مگر شیخ کریم کی توجہ اس مرید کی صلاحیت پر تھی اس لئے طریقہ نقشبندیہ کے وہ امتیازات اور رموز بیان کر دیئے جو لازم تھے اور خلیفہ کے لئے راہبر بننے کے لئے ضروری تھے۔

یہی وجہ تھی کہ سید شاہ حسین ؒ نے باوجودیکہ طریقہ قادریہ کی اجازت پائی تھی اپنا سلسلہ نقشبندی حوالے سے ہی جاری کیا اور عمر بھر اسی سلسلے کی تعلیم دیتے رہے اور یہ فیض اس قدر بار آور ہوا کہ صدیوں تک یہ سلسلہ ہدایت کا مرکز بنا رہا مگر حضرت مجدد ؒ کے ارشاد کے مطابق خامشی کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا اس لئے تذکرہ نگاروں نے اس مہر کامل کا ذکر خال خال ہی کیا ہے مگر شہرت نہ پانے کے باوجود آپ کا سلسلہ ملک ملک پھیلا اور آج تک پر بہار ہے مانک پور میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

حوالہ جات

1 مکتوبات جلد اول مکتوب نمر 3:

2 مکتوبات جلد اول مکتوب نمر 18

3 مکتوبات جلد اول مکتوب نمر 11

4 مکتوبات جلد اول مکتوب نمر 221

5 حوالہ مذکورہ

6 مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر 221

7 حوالہ مذکورہ

8 حوالہ مذکورہ

9 حوالہ مذکورہ

10 حوالہ مذکورہ

11 حوالہ مذکورہ

26۔ خواجہ عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ

میر سید حسین مانک پوری کے صاحبزادے ہیں والد گرامی سے ہی نقشبندیت کا فیض پایا ہے علم وعمل اور سلوکِ معرفت میں کامل تھے۔ نقشبندیت کی کہیں سے بھی کوئی فیض کی کرن نکلتی دیکھی وہاں کا ہی رُخ کرلیا، یہاں تک کہ ترکستان تک جا پہنچے کہ وہاں نقشبندیت کی مہکار صدیوں پر محیط تھی، ہجرت گاہ کو ہی وطن بنالیا اور وہاں پر ہی تعلیم معرفت کی بساط بچھالی حتٰکہ وہاں ہی انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے کہ تار تار جو ترکستان کا ایک گاؤں تھا وہاں پر مزار ہے۔

خواجہ عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ بزرگ کس طرح معلوم دنیا کے گوشے گوشے دین کی تبلیغ اور مخلوقِ خدا کی ہدایت کے لئے پھرتے تھے تاکہ دنیا کا کوئی کونہ ہدایت کی روشنی سے محروم نہ رہ جائے اس حوالے سے انہیں بہت **سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا مگر انہیں اپنی ذات کی تکلیف کی پرواہ نہ تھی مشن تھا تو صرف یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا پیغام سب تک پہنچے اور کوئی بھی نارسائی کا شکوہ نہ کرے اسی لئے حضرت** خواجہ عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ذات کے اظہار سے بے نیاز ہو کر تبلیغ دین کا کام کیا یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل سفر میں رہے اور جہاں بھی گئے دین کا پیغام پہچانتے رہے۔ شائد یہی سبب ہے کہ ان کے مزار کے بارے میں بھی مختلف آراء ہیں۔

27 خواجہ سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد گرامی سید عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یافتہ تھے اور انہیں سے خلافت پائی تھی۔ والد گرامی کے ساتھ ترکستان میں قیام رہا اور وہاں ہی اپنے والد گرامی کے ساتھ اشاعت طریقہ میں کام کیا، نہایت پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ متوسلین کا آپ کے گرد جھمگٹا رہتا تھا خالص نقشبندی مشرب کے پیروکار اور شریعت مطہرہ پر کار بند رہنے والے بزرگ تھے۔

سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے والد محترم سید عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ برصغیر سے نسبت رکھتے تھے مگر یہاں سے ترکستان چلے گئے تھے اس لئے ان کے حالات پردہ خمول میں رہے اور برصغیر کے اکابر ان کی مساعی سے کماحقہ آگاہ نہ ہو سکے مگر یہ ضرور واضح رہا کہ ترکستان میں نقشبندیت کے فروغ میں اس خاندان کا بڑا ہاتھ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اپنے دادا میر سید حسین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھی مگر سلوک کی منزلیں اپنے والد گرامی سید عبدالباسط رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی طے کیں ایک روایت کے مطابق ترکستان میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے مگر بعض تذکرے آپ کی برصغیر واپسی کی خبر دیتے ہیں اور مزار مبارک بھی پیر کوٹ ضلع جھنگ میں بتاتے ہیں۔

28 خواجہ سید محمود رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ سید محمود رحمۃ اللہ علیہ نے نقشبندیہ سلوک اپنے والد گرامی سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور ان کی زیرنگرانی روحانی ارتقاء کی منزلیں طے کیں اپنے والدگرامی کے ہی خلیفہ ہوئے۔ قادری سلسلہ کی بھی آپ کو اجازت حاصل تھی کہ یہ سارا خاندان دونوں نسبتیں رکھتا تھا جو روایات اس سلسلے کو ترکستان ہی میں شمار کرتی ہیں اُن کے نزدیک آپ کی وفات ترکستان میں ہوئی ہے مگر جو روایات اس خاندان کو وطن مالوف کی جانب رجعت پر یقین رکھتی ہیں اُن کے مطابق آپ برصغیر آ گئے تھے اور جونا گڑھ میں قیام کر لیا تھا، آپ کی وفات بھی وہیں ہوئی ہے اور مدفن بھی جونا گڑھ میں ہے۔

خواجہ سید محمود رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسلاف کی طرح دین حق کی ترویج کے لئے شہر شہر اور قریہ قریہ گھومتے رہے تا کہ کوئی متلاشی حق نعمتِ اسلام سے محروم نہ رہ جائے روایات میں ترکستان سے برصغیر تک کا سارا علاقہ آپ کی جولاں گاہ رہا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان علاقوں میں نقش بندیّت کا پیغام عام ہوا اور کثیر تعداد مسلمان اس سلسلے سے منسلک ہوئے۔ آج بھی یہ علاقہ نقشبندیوں کی تعلیمات سے جگمگا رہا ہے۔ یہ دراصل ان بزرگوں کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ نقشبندی طریقِ فکر اب تک اپنے سطوت جمائے ہوئے ہے۔

29 خواجہ سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ

سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سید محمود رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہوئے اور خلیفہ قرار پائے اپنے خاندان کی روایت کے مطابق زہد وتقویٰ میں نہایت عالی مرتبت تھے، خاندان کا یہ شرف تو نمایاں تھا کہ یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہے اس لئے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فیوضات سے یہ خاندان ہر دور میں متمتع رہا ہے۔ شریعت کی پاسداری، زہد وتقویٰ پر مداومت اور خلق خدا کی علمی وروحانی راہنمائی اس خاندان کا وصف رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ٹھٹھہ (سندھ) میں کوہ مکلی پر مصروفِ ریاضت تھے کہ برہمنوں کا ایک گروہ وہاں آ ٹھہرا۔ یہ لوگ اشنان کے لئے وارد ہا جا رہے تھے مگر رات بھر کا قرب تقدیر بدل گیا، کچھ باہمی گفتگو ہوئی۔ اپنے بت پرستانہ خیالات کا اظہار کیا مگر سامنے ایک مرد قلندر تھا جس کے پاس تمام توہمات کا حقیقت پسندانہ جواب تھا کچھ مادی تمنائیں بھی سامنے آئیں مگر جب شیخ کریم کے فیض کا دریا جولانی میں دیکھا تو سب مسلمان ہو گئے سچ کہا تھا علامہ اقبال نے

''پیر روی خاک را اکسیر کرد''

پیر اس سطوت کے ہوں تو تقدیریں بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔

آپ کا خاندان منبع علم وحکمت بنا، صاحبزادگان بھی تقویم عقائد کے مشن پر کاربند رہے، آپ کے بڑے صاحبزادے ابوالبرکات سید حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا فیض دور ونزدیک پھیلا اور سید حسن کی نسل نے اولیاء کاملین کا ظہور دیکھا۔ لاہور کے مشہور

محدث، صوفی اور صاحب فیض بزرگ شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ اسی صاحبزادے کے لخت جگر ہیں یوں شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں ان کا فیض لاہور کے ہر صاحبِ ارادت کو پہنچا ہے اور اب تک جاری ہے۔

حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھٹھہ ہی میں انتقال فرمایا اور وہاں کے مشہور قبرستان جو کوہ مکلی میں واقع ہے میں دفن ہیں کہا جاتا ہے کہ یہی سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کی عقیدت اس قدر عام ہوئی کہ لوگ انہیں عبداللہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنے لگے یہ مشہور روایت ہے اگرچہ اسے تاریخی اعتماد دینا مشکل ہے۔

یہ دعویٰ کہ خواجہ سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ وہ بزرگ ہیں جن کی شہرت عبداللہ صحابی کے حوالے سے بہت معروف ہے بعض سیرت نگاروں کے نزدیک حتمی نہیں ہے اگرچہ بعض سوانح نگار اس کا تذکرہ کرتے ہیں بہر حال کوئی روایت بھی درست ہو یہ حقیقت ہے کہ خواجہ سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اس قدر بلند مرتبت تھے کہ ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔

30 خواجہ سید عنایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا ہیں شاہجہاں آباد (دہلی) آپ کا وطن مالوف ہے، ابتدائے عمر ہی میں مرشد کی تلاش میں سرگرم تھے آخر سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ پر یقین ہوگیا کہ یہی اُن کی راہنمائی کے کفیل ہو سکتے ہیں، خدمت میں حاضر ہوئے اور ریاضت کی تمام منزلیں شیخ مکرم کی زیر نگرانی طے کیں، تمام سلاسل میں اجازت مرحمت فرمائی اور خلافت عطا کی اور دینِ حق کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے تبلیغ کا فریضہ برصغیر کے مختلف علاقوں میں انجام دیا، خصوصیت سے وادی کشمیر کو اپنی جولاں گاہ بنایا، کشمیر میں نقشبندیت کا فیضان آپ کے ذریعے خوب پھیلا جس کے اثرات آج تک نمایاں ہیں۔ نہایت دشوار گزار راستوں سے یہ اربابِ ہمم کیسے گزرے ہوں گے آج کا سیاح جسے بہت سی سہولتیں حاصل ہیں حیران وششدر رہے، کشمیر میں فیض نقشبندیت کو عام کرنے کے بعد شاہجہاں آباد واپس لوٹ آئے اور وہیں وفات پائی مزار دہلی ہی میں ہے۔

خواجہ سید عنایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ وہ نمایاں بزرگ ہیں جن کی نسبت وادی کشمیر سے بڑی مستحکم ہے ان کے آثار بھی کشمیر میں رائج تصوف کی تعلیمات میں بڑے واضح ہیں۔ یہ الگ بات کہ آپ ترویجِ اسلام کا مشن عام کرتے ہوئے اس سرزمین سے واپس لوٹ گئے تھے۔

31 خواجہ حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ

یہ وہ نمایاں کشمیری ہیں جو سلسلہ نقشبندیت کے اکابر میں شامل ہوئے۔ بارہ مولہ (سری نگر) کے رہنے والے تھے، حضرت خواجہ عنایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ جب کشمیر تشریف لائے تھے تو ان کے دست حق پرست پر بیعت کی حسب روایت نقشبندی اور قادری سلسلے میں اجازت ملی مگر آپ کا فیضِ نقشبندیت ہی عام ہوا۔ عالمِ دین بھی تھے اور حافظ قرآن مجید بھی تھے اس لئے رشد وہدایت کا منبع بنے، آپ خلافت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اس لئے علوم ظاہرہ کی تدریس کے علاوہ علوم باطنیہؒ کی بھی مشق کراتے تھے اس طرح آپ کا سلسلہ خوب پھیلا، خطۂ کشمیر میں روحانیت کے فروغ میں آپ کا نام ہمیشہ مرکز توجہ رہے گا اس لئے بھی کہ اب کشمیر نقشبندی فیضان سے مہکنے لگا تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے اکابر اس خطۂ جنت نظیر میں اسی سلسلے میں پیدا ہوئے۔ یہ سلسلہ اب تک روحانیت کے سلاسل میں نمایاں تر ہے۔ آپ کا مزار بارہ مولہ کشمیر میں ہے۔

خواجہ حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسلاف کی طرح وادی کشمیر کو ہدایت کی روشنی دینے میں مصروف رہے یہ الگ بات کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح وادی کو چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ اسی وادی میں ہمیشہ کے لئے رہ گئے۔ یہ شاید پہلے بزرگ ہیں جن کا مقبرہ بھی وادی کشمیر میں ہے۔

32 خواجہ عبدالصبور رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ عبدالصبور رحمۃ اللہ علیہ سری نگر کشمیر کے رہنے والے ہیں، وہاں ہی درسی علوم پڑھے اور پھر حضرت خواجہ حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں آگئے اس قدر وابستگی کا مظاہرہ کیا کہ خلافت سے نوازے گئے چاروں سلاسل میں صاحب اجازت تھے مگر جو سلسلہ شناخت بنا وہ سلسلہ نقشبندیہ ہے، کشمیر میں آپ کی محنت وریاضت سے معرفت کا نور عام ہوا اور لوگ جوق در جوق حلقہ عقیدت میں آنے لگے 1164ھ میں سری نگر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ مزار اب بھی مرجع خلائق ہے۔

خواجہ عبدالصبور رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کی زرخیز آبادی کے رہنے والے تھے اور آپ نے عمر بھر قیام بھی یہیں کیا یہ علاقہ آباد وشاداب تھا اور کشمیر کا مرکزی حصہ تھا اس لئے آپ کو ایک وسیع حلقہ ملا اور لاتعداد متوسلین آپ کے حلقہ بگوش ہوئے۔ اس طویل قیام کا اثر یہ تھا کہ نقشبندیت کا فیضان بہت عام ہوا چاروں طرف سے لوگ حاضر ہوتے اور سلوکِ نقشبندیت سے فیض یاب ہوتے۔ حتّٰی کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی مکمل وادی کا بیشتر حصہ نقشبندی طرزِ سلوک سے آشنا ہے۔

33 خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ

آپ ضلع مانسہرہ ہزارہ کے قصبہ مانگلی کے رہنے والے تھے بچپن سے ہی علوم ومعارف کا شوق فراواں تھا۔ جب درسیات سے فارغ ہوئے تو باطنی تربیت کے مراکز کی تلاش میں نکلے، عقیدت کا خلوص اور تلاش کی صداقت خواجہ عبدالصبور رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر لے گئی، حاضری دی، دل نے تصدیق کی کہ یہی وہ منزل تھی جس کی تلاش تھی، شیخ طریقت نے نہ صرف یہ کہ دامن پکڑا بلکہ مرکز نگاہ بنا دیا۔ پھر تو تبلیغ دین کے مشن پر روانہ ہوئے اور اس قدر توانائی دکھائی کہ کشمیر کے علاوہ ضلع ہزارہ بھی آپ کی برکات سے جگمگا اٹھا، کئی متوسلین درجہ خلافت تک پہنچے اور نامور ہوئے۔ 24 محرم 1198ھ میں وفات ہوئی اور مانسہرہ کے قریب مانگلی شریف جوان کا وطن مالوف تھا میں دفن ہوئے۔ مزار آج تک مرجع خلائق ہے اور اہل علاقہ کی نظر میں مرکز فیضان ہے۔ حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں خواجہ عبدالغفور رحمۃ اللہ علیہ خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ محمد رفیق رحمۃ اللہ علیہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان میں خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے بلند ہے کہ آپ کا فیضان بہت ہے۔

34/35 خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے مگر بعض روایات کے مطابق حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلیفہ حضرت خواجہ عبدالغفور رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یافتہ تھے اگرچہ نسبت حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھی اسی بنا پر موہڑہ شریف کے شجرہ میں آپ کا نام حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد درج کیا جاتا ہے جبکہ نیریاں شریف کے شجرہ میں آپ کا نام خواجہ عبدالغفور رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ آپ بلاواسطہ یا بالواسطہ حضرت خواجہ گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ کرنا (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ چاروں سلاسل تصوف میں بھی انتساب حاصل ہے مگر شہرت اور دوام سلسلہ نقشبندیہ کے حوالے سے ہے۔ صاحب کشف وکرامت تھے۔ کشمیر کے دشوار گزار علاقے میں ہدایت کا پیغام پہنچاتے رہے، کنڈل شاہی سے اٹھمقام کی جانب دس بارہ میل کے فاصلے پر پلنگ بازار سے پہاڑ کی چوٹی کے بائیں ہاتھ مڑ جائیں تو تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر کھٹے پیراں کا علاقہ ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ مگر دشوار گزار ہے، یہاں حضرت خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پروقار ہے۔ اس جگہ کو کیتھل شریف کہتے ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ ولی کن کن علاقوں میں دین کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ علاقے کے لوگوں کے ہاں آپ کا بڑا احترام ہے اور بڑی حکایتیں ہیں اگرچہ معلومات نہ ہونے کے برابر مگر یہ سب کو یاد ہے کہ یہ صاحب قبر حضرت سلطان الملوک رحمۃ اللہ علیہ کے مشائخ

میں سے ہیں۔ عقیدت مندوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بھارت کی طرف سے جب یہاں
بمباری ہوئی تھی تو لوگ اس مزار کی پناہ میں آگئے تھے کہ وہاں کوئی گولہ نہیں پھٹا،
عقیدت آشنا لوگ ایسی کئی خوشگوار حکایتیں سناتے ہیں۔ مزار اگرچہ اتنا آباد نہیں ہے
مگر عقیدت کا ہالہ ضرور ہے۔ اٹھمقام کی لوگوں کے دلوں میں عقیدت اسی مزار کی وجہ
سے ہے یہ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے اور ضلع مظفر آباد کی تحصیل ہے۔ 78 سال کی عمر
میں 1236ھ کی 15 شعبان کو وصال فرمایا۔

خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس سلسلہ تصوف میں بڑا نمایاں ہے کہ آپ کا
فیضان آج تک جاری ہے۔ لوگ آپ کے مزار پر اکثر حاضری دیتے ہیں اور اس
مردِ بزرگ کے مزارِ انور پر اپنی عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ خواجہ
عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہر سوانح نگار نے کیا ہے اور آپ کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا
ہے۔ مزار پر عوام کا ہجوم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ علاقہ بھر کے عقیدت مندوں
کے ہاں آپ کا فیضان جاری ہے۔

36 حضرت خواجہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

تحصیل اٹھمقام کی ایک مشہور بستی کٹیاں کے رہنے والے تھے۔ خاندان
اپنے علاقے میں بہت نیک نام تھا خصوصیت سے والد گرامی حضرت میاں
عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت تو دور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی صاحب کرامت بزرگ
تھے۔ حلقہ اثر بڑا وسیع تھا۔ ہزاروں لوگ عقیدت رکھتے تھے اور نسبت ارادت سے
منسلک تھے۔ خود حضرت خواجہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا فیض عام تھا۔ شریعت مطہرہ کے مبلغ
اور سلوک کی منزلیں طے کرانے والے بزرگ تھے۔ خالص نقشبندی طرز سلوک کے
حامل تھے اس لئے قرب و جوار کے لوگ انتہائی عقیدت مند تھے ایک مدت تک
نشرِ حسنات کا سلسلہ جاری رہا، آخر کٹھ پیراں میں وفات پائی اور اٹھمقام کے بڑے
قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار اُسی احاطہ میں ہے جس میں آپ کے پیر و مرشد
حضرت خواجہ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ محو استراحت ہیں۔

خواجہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ایک حامی شریعت بزرگ تھے جن کے ہر ہر عمل سے
شریعت کی اتباع کا درس ملتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل ہر نقشبندی بزرگ کے
ہاں نمایاں تھا۔ ان کے نزدیک تصوف، شریعت کی پاسداری کا نام تھا صرف مجاہدوں
اور ریاضتوں کا نام نہ تھا۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جو اندازِ تصوف پختہ ہوا تھا وہ ان سب
بزرگوں کے ہاں معتبر تھا۔ خواجہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی متبع شریعت بزرگ تھے۔

37 حضرت خواجہ سلطان محمد ملوک رحمۃ اللہ علیہ

آپ حضرت خواجہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں ۔جنجاٹھ میں پیدا ہوئے اور وہاں ہی زندگی گزاری، والد گرامی سے خلافت پائی اور خلق خدا کی دستگیری پر مامور ہوئے۔ گھرانہ ایک مدت سے فیض بخشی کی شہرت رکھتا تھا اس لئے گردونواح کے لوگ خصوصیت سے دامن کرم میں آئے اور ایک سلسلہ رشد وہدایت جاری ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اخلاف بھی اسلاف کی طرح نیک نام دیئے اس لئے سلسلہ نقشبندیہ کا مرکز قرار پائے ۔کیاں شریف جہاں آپ کے نامور صاحبزادے خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن ہے سے مشرق کی جانب پہاڑ کی دوسری جانب حضرت سلطان محمد ملوک رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے ۔راستہ دشوار گزار ہے اور دوتین گھنٹے میں طے ہوتا ہے یہ بھی کہ چڑھائی ہے اور گھنا جنگل ہے۔ جنجاٹھ ہی میں مزار ہے، مسجد ومزار اکٹھا ہے اور لکڑی کا بنا ہوا ہے جگہ بھی زیادہ وسیع نہیں ہے۔ چالیس کے قریب نمازی سما سکتے ہیں کنڈل شاہی بازار وہاں سے قدموں کے نیچے نظر آتا ہے۔ مزار اب بھی زیارت گاہ ہے اور لوگ دور دور سے حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ سلطان محمد ملوک رحمۃ اللہ علیہ کا دربار اب بھی زیارت گاہ ہے کہ اسی دربار سے نقشبندی سلسلے کے وہ مردِ قلندر وابستہ ہے جن کی ذات نقشبندیت کا سرمایہ ہے۔

38 حضرت خواجہ نظام الدین کیانوی رحمۃ اللہ علیہ

(م 1313ھ)

حضرت خواجہ نظام الدین کیانوی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ کے وہ نمایاں شیخ ہیں جن کا فیضان اس قدر ہمہ گیر ہے کہ شرق وغرب میں نمایاں ہے۔ تصوف کے مختلف گھرانے اس آستانے سے منور ہوئے ،خلفاء کی ایک کثیر تعداد نے اس درگاہ سے فیض پا کر زاویے قائم کئے اور اصلاح وخیر کا پیغام دیا۔

حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ سلاطین مغلیہ سے خاندانی تعلق رکھتے تھے۔ حسنات کا تسلسل نسل در نسل آرہا تھا۔ والد گرامی سلطان محمد ملوک رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے اکابر صوفیاء میں سے تھے للّٰہیت کا مرکز تھے کہ ایک جہان ٹلہ رہا تھا پاکیزگی، صالحیت اور تقویٰ شعاری اسلاف سے ورثے میں ملی تھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نظام الدین کیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں ہی نشرِ خیر کا جوہر موجود تھا، کشمیر کی وادی میں اٹھمقام کے دشوار گزار مقام کے مضافات میں کٹیاں ایک بستی تھی جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ منصۂ شہود پر آئے بس پھر کیا تھا ایک گمنام مقام تاریخ کے صفحات پر روشن ہو گیا اور کیانوی نسبت ایک فخر بن گئی، درسیات کی تعلیم اپنے بزرگوں سے لی۔ گھرانہ چونکہ مصدرِ علم تھا اس لئے جلد ہی علوم وفنون میں اعلیٰ ذوق حاصل کرلیا، پھر دیگر مکاتب ومراکز پر حاضر ہونے لگے، درسیات میں مہارت پر یہی حوالہ کافی ہے کہ اُس دور کے ایک نامور عالم دین جو معقولات ومنقولات میں سند شمار ہوتے تھے یعنی

حضرت مولانا محمد علی مکھڈوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہم درس بھی تھے اور ہم سبق بھی، اس گھرانے کا امتیاز صرف علم وفن کی مہارت ہی نہ تھی۔ سلوک ومعرفت میں کامل دستگاہ بھی تھی۔ کشمیر کے بزرگ بلا امتیاز تمام سلاسل سے کسب فیض پر یقین رکھتے تھے آپ نے بھی ایسا ہی کیا ہر چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے مگر ڈیرا نقشبندی آب زلال پر لگایا۔ اس سلسلہ تصوف کو شروع ہی سے چٹانوں کو موم کرنے کا ہنر سکھایا گیا تھا۔ سلسلہ در سلسلہ یہ دریائے معرفت چٹانوں کو عبور کرتا رہا اور کوہستانی ندی کی طرح خرام کرتا رہا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات سے ان گنت چشمۂ ہائے فیض جاری ہوئے۔ کوئی میدان میں بہا تو کوئی ریگستان میں مگر اس چشمہ فیض کو خارا شگافی کا منصب سونپا گیا تھا جو باحسن طریق نبھایا گیا۔

حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطنِ مالوف سے علم ومعرفت کی کشید سے فارغ ہوئے تو افقِ نظر دوسرے علاقوں کی طرف اٹھا۔ خواجہ نور محمد تراہی رحمۃ اللہ علیہ جو ایک مسلکِ حسنات کے سرخیل تھے اور چورہ شریف کی عظمت کا حوالہ ہیں سے بھی مصاحبت رہی۔ مولانا محمد علی مکھڈوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی زمانہ طالب علمی کا تعلق پھر سے استوار کیا۔ اور اُس دور کے چشتیہ کے امام شاہ سلمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت پر بھی حاضری دی اور ایک مدت تک حاضر رہے۔ چشتی گھرانے سے اس حاضر باش وجود کو نقشبندی قرار دے کر صوفیاء نقشبند کے حوالے نہ کیا بلکہ اپنے سلسلہ طریقت میں قبول کیا، اور خلافت بھی عطا کی۔

حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی متجسس طبیعت ابھی تک مطمئن نہ ہوئی تھی ظرف ہی اتنا بڑا تھا کہ چشمے دامن میں اترتے گئے مگر تڑپ باقی رہی۔ یہ مضطرب طبیعت بیرون

ملک لے گئی حجاز مقدس جو متلاشیان راہ استقامت کا ملجاء وماویٰ ہے ہر صاحب دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے چنانچہ راہی حجاز ہوگئے وہاں سے سرزمین شام چلے گئے کہ یہی خطہ دعاؤں کا مرکز رہا تھا سیلانی طبیعت مزید رخت سفر پر مجبور کر رہی تھی۔ افریقہ سامنے جولاں گاہ تھا کہ وہاں مصر بھی ہے جو علمی حوالوں میں معتبر نام رکھتا تھا۔ وہاں نقشبندیہ کے اکابر سے ملے اور انفاس کی مشق کا درس لیا۔ یہ حیرت ضرور ہوئی کہ چند معمولی اختلافات کے باوجود نقشبندیت کی روش ایک تھی۔ اس اطمینان کے ساتھ واپس لوٹے کہ سلوک کی جو روش اپنا رکھی تھی اُسے عالمگیر مقبولیت حاصل تھی۔ واپسی پر مختلف خاندانوں کے مسند نشینوں سے ملاقات رہی آخر ایک جذب وکیف میں مست بزرگ نے کشمیر کی راہ دکھائی۔ وہاں خواجہ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ اثر میں رہے اور ریاضت ومجاہدے کی کئی منزلیں طے کیں۔ منگلدار میں چالیس روز کا چلّہ کیا جس سے روحانیت کے سب بند دروازے کھل گئے کیاں شریف وہاں سے قریب ہی ایک بستی تھی اس لئے اپنے آبائی مرکز کو مستقل ٹھکانہ بنا لیا بس پھر کیا تھا کیان کی بستی روحانی شرافت کا نشان بن گئی۔ لوگ جوق در جوق حاضر ہونے لگے اور ایک مرکز تصوف آباد ہوگیا۔ یہی مقام شناخت بنا اور یہی مرکز نقشبندیت کے فروغ کا ذریعہ قرار پایا۔

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت کیاں شریف منبع رشد وہدایت بنا شب وروز فیض کا دریا بہا اور دور دور سے متلاشیان حق آستانے پر حاضر ہونے لگے بعض کی استعداد اس قدر نمایاں ہوئی کہ خلفاء شمار ہوئے۔ تقریباً ستائیس خلفاء کا ذکر ملتا ہے جو کشمیر کی وادی سے لے کر صوبہ پختون خواہ اور صوبہ پنجاب تک پھیلتے چلے گئے کہا جاسکتا ہے کیان کا مرکزِ تصوف شمالی ہند میں نقشبندیت کا نشان بن گیا تھا،

کوہستان، بالاکوٹ، ہزارہ، ایبٹ آباد، ہری پور حتّٰی کہ مقبوضہ کشمیر کے دور دراز علاقوں میں اسی خانقاہ کا فیض پہنچا مزار اقدس پر گنبد بنانے کا خیال پیر علاؤالدین صدیقی مدظلہ کو آیا تھا مگر صاحب مزار نے اس ارادے کو ترک کرنے کا اشارہ دیا چنانچہ مزار بلا گنبد ہی ہے۔ حضرت خواجہ محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ جو برگزیدہ خلفاء میں سے ہیں نے مزار کے قریب پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے پہاڑ کاٹ کر تقریباً ڈھائی کیلومیٹر نہر نکالی تھی جو آج بھی موجود ہے اور حسب سابق رواں دواں ہے۔ اس سے اردگرد کے دیہات بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ نہر کے علاوہ بھی کئی آثار موجود ہیں جو زائرین کے لئے راحت قلب ونظر کا سامان کرتے ہیں۔

حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ اتباع شریعت کا نادر نمونہ تھے۔ زہد وتقویٰ طبیعت کا میلان تھا۔ یہ صاحب کشف وکرامت بزرگ صاحب علم بھی تھے اس طرح نقشبندی سلوک کا مظہر تھے اس قدر علومرتبت اور جاذبیت کے باوجود محنت کش تھے کھیتی باڑی کرتے اور رزق حلال کی تلاش میں مشغول رہتے، یہی ان بزرگوں کا امتیاز تھا جس کو دام ملنا چاہیے آپ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج کے مطابق شریعت مطہرہ کو اپنانے پر زور دیتے تھے آپ کے بعض ارشادات یہ ہیں۔

☼ ریاضت ومجاہدہ سے پہلے شریعت مطہرہ کے احکام سے آگہی چاہیے۔

☼ رزق حلال کی تلاش کو جزوعبادت بنانا چاہیے۔

☼ شریعت مطہرہ پر استقامت کے لئے ائمہ اربعہ کی راہنمائی لازم ہے۔

☼ صحابہ کرام اہل بیت اطہار اور آئمہ مجتہدین کے راستے کو مضبوطی سے اختیار کرنا چاہیے۔

☼ طریقت کے ہر سالک کے لئے لازم ہے کہ وہ

☼ شریعت پر ثابت قدم ہو۔ اس کے لئے علم شریعت سے بہرہ مند ہو۔

☼ صالحین کی صحبت کو لازم رکھے اور ریاضت ومجاہدے میں ان سے راہنمائی لیتا رہے۔

☼ شرک وبدعت اور خواہشات نفسانی سے اجتناب کو لازم پکڑے۔

غرضیکہ ہمہ تن صاحب شریعت سالک بنے تاکہ اس راہ کی مشکلات آسان ہوں۔

الحمدللہ آپ کا فیض اب تک جاری ہے اور درگاہ زیارت گاہ خاص وعام ہے، متعدد درگاہیں اس درگاہ کی شاخیں ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید قائم ہوتی جائیں گی۔

یہ آفتاب علم وحکمت ایک مدت تک جہان کو سلوک ومعرفت کی روشنی عطا کرتا رہا اور آخر 8 صفر المظفر 1313ھ کو کیاں شریف میں نقش دوام چھوڑ کر تہہ خاک آسودہ ہوگیا۔ مزار آج بھی مرجع خلائق ہے اور کرم بخشیوں کا پیغام ہے۔

39۔ حضرت خواجہ محمد قاسم صادق موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ

(م 1362ھ)

عصر حاضر میں تصوف کا وقار اور علم روحانیت کا تاجدار اگر کسی فرد واحد کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ بلاشبہ خواجہ محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک مسند ارشاد کی تابانی آپ کی وجہ سے ہی قائم رہی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب علم معرفت سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ امت مسلمہ زوال کی زد پر تھی اور مغربی سامراج اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا یہ وہی دن تھے جبکہ ملت اسلامیہ کی آخری کروٹ بھی بے توفیق ہو گئی تھی، قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ سلطنت دہلی پر عفریت کا سایہ تھا اور قومی خودداری پس پا ہو رہی تھی۔ علم کدے ویران ہو رہے تھے اور خانقاہیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ ایسے ہمہ جہتی زوال کا دور دورہ تھا کہ الامان والحفیظ۔ تاریخ برصغیر کا ہوش مند قاری مضطرب تھا کہ سنورنے کی امید بھی ٹوٹ رہی تھی۔ مسلم امت کے ایمان کی اساس یعنی حب رسول ﷺ پر شب خون مارا جا رہا تھا ہندو ماورائیت نے عقائد کا گھیرا تنگ کر دیا تھا بد قسمتی سے علمی مراکز سے علم مصطفوی ﷺ کے حوالے سے شبہات اٹھائے جا رہے تھے، دردمند دل پکار رہے تھے کہ

وہ حبیب پیارا تو عمر بھر کرے فیض و جود ہی سربسر
ارے تجھ کو کھائے تپ سقر ترے دل میں کس سے بخار ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس دور کے چند علماء دین اگر حفاظتی دیوار کا کام نہ

دیتے تو حصارِ ملت ریزہ ریزہ ہو چکا ہوتا اور یہ بھی صداقت ہے کہ اگر عقلی، فکری اور عملی زوال کا راستہ چند اصحاب سجادہ نہ روکتے تو انحطاط امڈ کے آتا یہ صاحبان علم اور یہ حاملین صداقت ہی وہ راہنما تھے جن کی ہمت و توانائی نے یہ سیل بلا روکا ہے ان میں جو نام عزیمت کا کوہ وقار بنے اُن میں اگر فاضل بریلوی حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کا وجود ایک غنیمت ہے تو ان میں پیر جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ اللہ بخش رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ حیدر شاہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ فقیر محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد دیگر صاحبان اثر وجود شامل تھے تو ان میں حضرت خواجہ محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی درخشندگی کا استعارہ تھا یہ تھے وہ مردانِ حق آگاہ جن کی مساعی جمیلہ سے انحطاط کا سفر تمام ہوا اور ملت اسلامیہ پھر سے جادہ عروج پر گامزن ہوئی۔

حضرت باواجی محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ اُس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو ایران کا تاجدار خاندان تھا کیانی نسل ایک مدت تک رموز مملکت سے آشنا رہی تھی اور جب سریر آرائے سلطنت نہ رہی تو تجارت کا معزز پیشہ سامنے تھا۔ تجارتی سفر میں ہی اس خاندان کی ایک شاخ برصغیر آ گئی تھی اور کوہسار مری میں سکونت اختیار کر لی تھی یہی وہ مقام تھا جہاں اس مہاجر گھرانے کے ہاں ایک صاحبزادہ خیر و برکت کا پیغام لایا تھا، چونکہ خاندانی روایات سے یہ خاندان قدرے کٹا ہوا تھا اس لئے تاریخ پیدائش کا بالضبط حساب نہ رکھ سکا۔ قیاس اور قیافے سے مختلف تاریخ ہائے ولادت روایت ہو گئی ہیں یہ بہرحال کسی سوانح نگار کا منصب ہے کہ وہ قرائن و حقائق کے تمام زائچے مرتب کرے اور درست تاریخ پیدائش کا سراغ لگائے، دربار موہڑوی کی

روایت کے مطابق یہ لمحہ جانفزا 1820ء کے 14 فروری کا تھا جو قمری شمار سے 1237ھ ہے۔ وہ دور چونکہ مقامی جنتری کے حوالے سے محفوظ رہا تھا اس لئے بکرمی حساب سے 1876 کی دو پھاگن تھی۔

حضرت باوا جی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نوعمری ہی میں تھے کہ والد گرامی حضرت محمد جیون رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تھا اور نومولود پر ابتدائے عمر ہی میں یتیمی کا سایہ منڈلانے لگا تھا ایک غریب الوطن گھرانہ جب یتیمی کے کرب کے نیچے آجائے تو زمانے کی روش کیا ہوتی ہے؟ ذریعہ معاش بھی مضطرب ہوجائے اور کفالت کا اہتمام کرنے والا بھی کوئی نہ ہو تو ہر لمحہ کس قدر دشوار ہوتا ہے؟ مگر حوصلہ مند ماں نے ہمت نہ ہاری، نومولود کا حقِ زیست بھی دیا اور اُس کے جذبات کی پرورش بھی کی، یہ عجب معاملہ تھا کہ نومولود ہوش سنبھالتے ہی بارگاہِ علم میں حاضر ہونا چاہتا تھا، عصر حاضر کی سہولیات پیش نظر رہیں اور پھر بھی بے علمی کا بہتا ہوا سیلاب دکھائی دے تو اُس بیوہ ماں کے کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ایک طرف شکم کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف ذہنی وقلبی داعیات ہیں۔ ماں نے کیا کیا وہی جو اس کے سامنے اُسوہ تھا۔ حضرت غوثِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر بھی یہ وقت آیا تھا۔ معیشت کی گھٹن تھی مگر ماں نے علم کی بارگاہ میں لختِ جگر کو پیش کر دیا تھا اور تڑپتی ہوئی مامتا قربان کر دی تھی۔ اب تاریخ پھر اپنے آپ کو دوہرا رہی تھی ماں نے کوہسار کے کربناک دن قبول کر لئے مگر نونہال کو علم کی بارگاہ کی نذر کر دیا۔ جو خود بن پڑا گھر پر کیا مگر جب درسگاہ کی ضرورت محسوس کی تو دیکھا کہ ایک ہونہار کو کونسی مسند علم زیب دیتی ہے۔ فیصلہ شعوری سطح پر کیا۔ جذبات کو آڑے نہ آنے دیا اور برخوردار کو دہلی روانہ کر دیا کہ دہلی میں مرجھائی ہوئی شوکت کا آخری نشان تھا۔

حضرت باوا جی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں کے مراکزِ علم میں گم ہوگئے ایک استاد سے کسب علم کیا تو دوسرا موجود تھا ایک مدرسہ علم سے فارغ ہوئے تو دوسرا خوش آمدید کہہ رہا تھا بس پھر کیا تھا حصول علم کی لگن تھی اور مسند علم بچھی تھی یہ تڑپ ایک دو سالوں میں مکمل ہونے والی نہ تھی۔ اسے تو ایک لمبا ریاض چاہیے تھا سال گزرتے گئے، دامنِ علم بھرتا گیا مگر پیاس نہ بجھی کہ یہی ارشاد نبوت تھا کہ دو طالب کبھی سیراب نہیں ہوتے۔ طالب علم اور طالب مال، یہاں تو ورثہ نبوت کی بات تھی۔ پیاسا بھی جنم جنم کا پیاسا تھا۔ طلبِ علم میں ایسا انہماک ہوا کہ گردشِ ایام کی رفتار ہی بھول گئی۔ روایت ہے کہ سترہ سال سے زائد عرصہ بارگاہِ علم میں حاضر رہے جبکہ عمومی روایت یہ ہے کہ یہ دورانیہ اکیس سال پر محیط ہے۔ کیا پڑھا ہوگا؟ کس کس کی بارگاہ میں حاضری دی ہوگی اور اپنے قلوب واذہان کو کس قدر بالیدہ کر لیا ہوگا۔ لائقِ اعتماد استاد بن کر واپس آئے۔ علم کی متعدد شاخوں پر کمند ڈالی اور تبحر علمی سے سیراب ہو کر وطن لوٹے، یہ سرمایہ علم ایک امانت تھا کہ علم کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایمانداری سے حاصل کیا جاتا ہے اور دیانتداری سے قوم کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ سستی و کاہلی نہ حصول علم میں روا ہے اور نہ نشر علم میں۔

حضرت باوا جی رحمۃ اللہ علیہ نے واپس لوٹتے ہی مسندِ علم بچھائی۔ وطن مالوف کے قریب ضلع راولپنڈی میں جگیوٹ کے مقام پر ایک ادارہ قائم کر لیا۔ جہاں درسیات کی تعلیم دینے لگے۔ علم جب گداز بن جائے اور معلومات جب مشاہدے کی صورت لینے لگیں تو علم اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ یہی اصحابِ معرفت کا دستور رہا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ علمی ثروت سے اس قدر مالا مال تھے کہ عصرِ موجودہ ہی نہیں بعد کے

ادوار بھی اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ مکتبِ علم کے صدر مدرس تو تھے ہی علوم معرفت کے شناور ہوئے تو حجۃ الاسلام کہلائے۔ علم کی معراج ہی معرفت ہے۔ حضرت قاسم موہڑوی بھی اسی شاہراہ کے راہی تھے۔ نظر کتاب پر ہوتی سامنے طلبہ دست بستہ حاضر ہوتے مگر اندر کا وجدان کسی راہبر کی تلاش کی تحریک دیتا رہتا۔ جہاں سے روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی نظر آتی ادھر کا ہی رُخ کر لیتے۔ عزلت نشینی کی لق ودق وادی سے بھی گزرے۔ مجاہدوں کو بھی وسیلہ بنایا۔ ریاضت کی منزلیں بھی طے کیں مگر اطمینان حاصل نہ تھا۔ اسی اثنا میں کہ تلاش جاری تھی خبر ملی کہ راولپنڈی کے مضافات میں کلیام شریف بھی ایک نشان منزل ہے۔ شوق فراواں کے ساتھ حاضر ہوگئے۔ وہاں باواجی کلیامی رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ تھا۔ طلب صادق لئے حاضر دربار تھے مگر یہ صاحب آستانہ عجیب بے نیاز بزرگ تھے۔ نہ مریدوں کی تعداد کی خواہش نہ عقیدت مندوں کے جھرمٹ کی تمنا۔ حق گو اور راہبر صادق تھے۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ تمہارے لئے میرے ہاں کچھ نہیں۔ تو جس سرمستی میں گرفتار ہے اس کا میرے پاس مداوا نہیں، ہاں مگر ایک آستانہ بتائے دیتا ہوں وہاں حاضر ہو جاؤ تمہاری سب حاجتوں کی کفالت اُسی آستانے پر ہوگی۔ یہ جواب بے نیازی کا غماز تھا اور راہِ حق کے شناوروں کا دستور رہا تھا کہ آنے والے کا کوئی وقت ضائع نہ کیا جائے اور حرص کی آڑ میں آستانے پر قیام پر مجبور نہ کیا جائے۔ اللہ اللہ کس قدر للھیت تھی اور کتنا بے پناہ دستگیری کا اہتمام تھا۔ کیا اس عصر بے توفیق میں ایسے آستانے موجود ہیں جو اپنے در پر آئے ہوؤں کو کسی اور در کا غلام بنا دیں، اس طرح تو فہرستِ متوسلین میں کمی آجائے گی مگر یہ اکابران مادی خواہشوں سے بے نیاز تھے اس لئے آگے روانہ کر دیا۔

اس راہنمائی کے عمل سے عیاں ہوتا ہے کہ صاحب مسند عرفانِ ذات کے جوہر سے فیض یاب ہے اور اپنی صلاحیتوں سے آشنا ہے اور یہ بھی کہ ہر آنے والے کے مرتبے و مقام سے بھی آگاہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ درست راہنمائی کا سلیقہ بھی جانتا ہے یہ وجہ تھی کہ باواجی کلیامی رحمۃ اللہ علیہ نے جستجو کا درست رُخ متعین کر دیا فرمایا کہ جس کی تم کو تڑپ ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ وہاں کشمیر چلے جاؤ ایک آستانے کی خبر دیتا ہوں جہاں سے تمہیں جوہر مراد دستیاب ہوگا۔ حیرت ہے کہ اپنی مجبوری کے اظہار میں بھی کس قدر باخبری تھی۔ بس پھر کیا تھا حضرت قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ دشوار گزار راستوں کو عبور کرتے ہوئے منزل مراد کی جانب روانہ ہوگئے۔ شوق جب حاصلِ زیست بن جائے تو دشواریاں راہ نہیں کاٹتیں۔ سمندِ طبع خود راہنما ہوتا ہے اور ایسے عشاق کے لئے منزلیں خود استقبال کرتی ہیں۔

مسافت طویل تھی اور سنگ لاخ بھی تھی مگر راہرو شوق اٹھکیلیاں بھرتا گیا کئی دن سفر کی بے تابی میں گزرے مگر پائے فقیر لنگ نیست کے مصداق قدم کہیں نہ رُکے اور آخر کیاں شریف کی روح پرور سرزمین تھی اور ایک بلند ہمت دیوانہ تھا۔ نیلم وادی کا حسن بھی دیکھا۔ ضلع مظفر آباد کی تحصیل اٹھمقام سے بھی گزرے آخر کنڈل شاہی کا خطہ سامنے تھا، دیدار کو لپکے تو خواجہ نظام الدین کیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نورانی سرکار تھی یوں تھا جیسے

بہار آگئی جیسے بہار کے نزدیک

مرشد کریم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک والہ وشیدا طلب گار کو دیکھا تو پکارا اٹھے۔

''جس مرد کی تلاش تھی وہ آ گیا''

ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ایسا ہی استقبالیہ جملہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی ارشاد فرمایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وارثانِ مسند ارادت ہمہ وقت ان افراد کے متلاشی ہوتے ہیں جو ان کا مشن آگے لے کر چلیں ان کے ہاں خاندانی وراثت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ یہ دراصل وارثانِ علم نبوت ہوتے ہیں اس لئے درہم و دینار کے طلب گار نہیں ہوتے۔

حضرت محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ دربار کیان شریف میں حاضر ہی ہوئے تھے کہ نظرِ انتخاب میں آ گئے۔ بیعت ہوئے اور انوارِ معرفت سے منور کر دیئے گئے۔ یہ عطا تو بے بدل تھی مگر اس کا شکرانہ بڑا کڑا تھا۔ چلہ کشی کا حکم ہوا تو مسلسل ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی نوازش اپنی قیمت مانگتی ہے اور معرفت کی راہ تو مجاہدوں سے اٹی پڑی ہے۔ یہ تو مسلسل ریاضت ہے اگرچہ بعض نام نہاد اصحابِ مسند اسے آسائشوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سچ ہے اور۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

چند روز کے مجاہدوں کے بعد حکم ملا کہ مری پہاڑ کے ڈھلوان کے ایک پر خطر مقام پر ایک پتھر ہے وہ تمہارے لئے قیام کی جگہ ہے اس پر بیٹھو اور چالیس روز تک چلہ کشی کرو۔ موذی حشرات کا مسکن اور بے سہارا ایک مرد درویش جسے مرشدِ کامل نے اس مشقت کے قابل گردانا ہے۔ یہ انسانی بستی نہ تھی۔ سیہاں دی پڑی تھی پس ہر خوف سے بے نیاز ہو جاؤ اور ہر خطرے کو بھول جاؤ یہ توکل کی پہلی منزل تھی اور یہ سلوک کے راستے کا پہلا پڑاؤ تھا۔ یہ جگہ اس قدر راس آئی کہ عزم صمیم نے ہر خطرے

کو پسپا کر دیا۔ جہاں حشرات بستے تھے انسان آنے جانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بستی آباد ہو گئی سچ کہا تھا کسی شاعر نے کہ

جہاں جہاں سے وہ گزرے جہاں جہاں ٹھہرے
وہی مقام محبت کی جلوہ گاہ بنے

پھر کیا تھا، بچھا ہوا پتھر مسند بنا اور مسلسل اسّی سال تک حضرت قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ رہا۔ ایسے واقعات انسان کو یقین دلاتے ہیں کہ ازل سے ہی یہ دستور نافذ رہا ہے کہ جہاں وفا شعار بستر جما لیتے ہیں وہ مقام زیارت گاہ خاص و عام ہو جاتا ہے۔ ''وادِ غیر ذی زرع'' کی نوید ایسے ہی لمحات کے لئے ہے اور ''وارزقھم من الثمرات'' کی دعا ایسی وادیوں کے لئے ہی ہے۔ آج معلوم دنیا کے جغرافیے پر نظر ڈال لیجئے کتنی بستیاں ایسے ہی وحدت آشنا بزرگوں کا فیضان ہیں موہڑہ شریف ایک بستی نہیں، آبادیوں کے تسلسل کا نام ہے۔ ابھی تو نیریاں شریف کو پر بہار بننا ہے۔

موہڑہ شریف کی بستی آباد ہوئی تو خورد و نوش کا کوئی انتظام نہ تھا مگر یہ بھی اہتمام قدرت کا تھا کہ جلد ہی قریب کے ایک صاحب ثروت کو توفیق ملی نمبر دار فضل خاں مرحوم کا نام جب تک موہڑہ شریف کا لنگر جاری ہے لیا جاتا رہے گا کہ قانون یہی ہے ''الفضل للمتقدم'' پیش قدمی کرنے والا ہی صاحب فضیلت ہوتا ہے۔ موہڑہ شریف آباد ہو گیا مگر فیض رساں بہتا ہوا دریا تھا جو موہڑہ شریف سے کیاں شریف تک لگاتار جولانی میں رہتا، خوراک، لباس، معاشرتی سہولتیں اور نقد خدمت یہ ہر سال کا معاملہ تھا یہ حقیقت ہے کہ حضرت باوا جی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی طویل العمری کے باوجود اپنے پیر خانے سے تعلق قائم رکھا اور اپنے آپ کو حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک درویش ہی خیال کیا۔

موہڑہ شریف آہستہ آہستہ مرکز نگاہ بننے لگا۔ جہاں عقیدت مندوں کی محبتیں نچھاور ہوتی تھیں وہیں تصوف اور سلسلہ صوفیاء کے ناقدین بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ نت نئے فتنے اٹھائے جاتے رہے۔ بات بات پر کفر و شرک کے فتوے داغے جانے لگے۔ جب ان معاندانہ رویوں سے درگاہ کی مقبولیت پر کوئی داغ نہ لگ سکا تو مناظروں کی مسندیں بچھائی جانے لگیں۔ ایسی مخالفانہ روش کا سرخیل ایک ہی ہوتا ہے جو نت نئے فتنے اٹھاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرب و جوار سے ہی نہیں دور دور سے ہم خیال علماء کو اکٹھا کیا گیا۔ حضرت کیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کوشش کی کہ یہ فتنہ دب جائے وضاحتی خط بھی لکھا اور لاوا شریف کے سجادہ نشین کے ہاتھ روانہ کیا مگر معاندت کا زعم بڑا پر آشوب ہوتا ہے دعویدارانِ مسند علم اکٹھے ہو گئے اور موہڑہ شریف آ گئے حیرت ہے کہ جس کے خلاف یہ سارا ہنگامہ بپا ہے کھانا اُسی کے ہاں سے آتا ہے۔ آخر کار مناظرہ کا منظر سج گیا۔ کلمہ طیبہ کے پرچم مریدوں کے ہاتھ میں تھے اور حضرت خواجہ محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ قیادت کر رہے تھے۔ سوال و جواب کچھ اس طرح کے تھے۔

فرمایا کس لئے لایا گیا ہوں اور تم کس لئے آئے ہو۔

بولے کہ شیطانی جھنڈا اکھاڑنے کے لئے

اعتراض ہوا کہ سلسلہ بیعت شرک و بدعت ہے۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ فرمایا

''جو آدمی ہمارے پاس آتا ہے ہم اُسے کلمہ شریف پڑھاتے ہیں پھر درود شریف اس کے بعد سابقہ گناہوں سے توبہ کراتے ہیں اور آئندہ گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسم ذات کا ذکر کراتے ہیں کہ سانس اندر جائے تو اللہ اور جب باہر

آئے تو ''ھو'' کہلواتے ہیں۔ تاکہ کوئی سانس ذکر کے بغیر نہ رہ جائے۔ تفصیلاً ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

ان میں جو چیز شریعت کے خلاف ہے آپ ہمیں بتا دیں ہم چھوڑ دیں گے۔

یہ طرزِ استدلال صوفیاء کا شیوہ ہے کہ ان کے ہاں ہٹ دھرمی نہیں ہوتی۔ حقیقت پسندانہ طریق عمل ہوتا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ اس قدر واضح اور غیر بہم گفتگو کے بعد معاندانہ روش ترک کر دی جاتی مگر بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ وہ لوگ جو دور دور سے مدعو کئے گئے تھے کہ انہیں اپنی بات کے لئے بطور دلیل بلوایا گیا تھا اُن میں سے اکثر نے حقیقت محسوس کر لی اور حضرت خواجہ محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی صداقت شعاری اور راست بازی کے قائل ہو گئے بلکہ اکثر نے تو آپ کی عظمت کا اعتراف کر لیا اور بیعت ہو گئے اس طرح یہ فساد رفع ہو گیا اور درویش حق پرست کی حقانیت آشکار ہو گئی مگر وہ فتنہ پرداز جو اس ہنگامے کا محرک تھا اور جس کی دعوت پر یہ لوگ آئے تھے، خود سری دکھانے لگا، بد قسمتی یہ ہوئی کہ اُس نے اپنے معاونین کا بھی کہا نہ مانا اور بغیر کسی اعتراف کے واپس لوٹ گیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ دشمنی کا ایسا خمار قدرت کو پسند نہیں آتا۔ اُس پر رات گراں گزری۔ کرب ناک حالت میں واپس لوٹا اور شہتوت کے اس درخت کے سامنے سجدے کرنے لگا جس پر کلمہ طیبہ کے جھنڈے آویزاں تھے اسی پر بس نہ ہوئی اندوہناک حالت میں گھر لوٹا اور آتش انتقام اور حسرتِ ناتمام کی اذیت سے تڑپتا رہا اور جان دے دی۔ حق کا بول بالا ہوا اور نفرتوں کی رسوائی ہوئی۔ موہڑہ شریف کا یہ آستانہ آج تک آباد ہے۔

اولاد:

حضرت باباجی ؒ کو اللہ تعالیٰ نے سات بیٹے عطا فرمائے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

پیر نظیر احمد ؒ۔ پیر نصیر الدین ؒ۔ پیر خواجہ محمد زاہد خاں ؒ، پیر خان صاحب ؒ۔ خواجہ شاہ بادشاہ ؒ جو دس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ پیر محمد محراب خاں ؒ۔ پیر محمد مہر اسب خان ؒ۔ پیر محمد دراب خان مدظلہ۔

وفات:

13 ذی القعدہ 1362ھ مطابق 20 نومبر 1943ء جمعۃ المبارک کی مبارک ساعتوں میں یہ مرد قلندر اس جہان فانی سے راہی ملک بقا ہوا۔ عمر مبارک 123 سال کے قریب تھی تقریباً اسی سال رشد و ہدایت کا یہ آفتاب موہڑہ شریف کے روحانی افق پر جلوہ ریز رہا۔ نماز جنازہ آپ کے خلیفہ پیر امام علی شاہ ؒ بنگالی شریف نے پڑھائی اور موہڑہ شریف میں ہی دفن ہوئے۔ مزار آج تک فیض بخشی کا نشان ہے۔

حضرت باباجی ؒ کے نظر کرم سے بہت سے آستانے آباد ہوئے اور دین متین کی تبلیغ کے مرکز بنے۔ خلفاء کرام نے حضرت باواجی ؒ کے مشن کو جاری رکھا جس سے ایک خلق ہدایت کا سامان پاتی رہی، ان خلفاء کرام میں بہت سے نامور بزرگ ہوئے، نمایاں تر خلیفہ حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی ؒ ہیں جن کا فیض برصغیر کی حدود سے بہت باہر تک پھیل چکا ہے۔ آپ کا ہم تفصیلی تذکرہ کریں گے۔ آپ کے علاوہ چند نامور بزرگ یہ ہیں۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ ایرانی ؒ۔ (م 27 دسمبر 1986ء سندھ)

پیر سید امام علی شاہ ؒ بنگالی شریف

پیر سید اکبر شاہ بخاری ؒ پشاور

پیر عبدالمجید نقشبندی ؒ رام پور

پیر شاہ صاحب المعروف زندہ پیر گھمکول شریف کوہاٹ

پیر غلام محمد ؒ ملکانی شریف داؤد۔ سندھ

اور بہت سے دیگر اکابر۔

حضرت باواجی محمد قاسم ؒ کے ملفوظات کا رنگ اور انداز خالصۃً نقشبندی طریق سلوک کے مطابق ہے شریعت کی پیروی مسلک بھی تھا اور زندگی بھر کا معمول بھی، اسم ذات یعنی ''اللہ ھو'' کا ذکر خود بھی کرتے اور اس کی تلقین بھی فرماتے آپ کا ایک قول نہ صرف یہ کہ منفرد ہے بلکہ اچھوتا بھی ہے۔ فرماتے۔

صبح تین قسم کی ہوتی ہے۔ صبح کاذب، صبح صادق ان کو تو عوام جانتے ہیں اور مانوس ہیں مگر ایک صبح، عشاق کی بھی ہوتی ہے جسے صبح عشاق کہا جاتا ہے یہ غروب آفتاب سے صبح صادق تک ہے۔ یہ دورانیہ خالص عمل اور عبادت کا ہے اور دعویٰ عشق رکھنے والے ان لمحات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

غرضیکہ حضرت باواجی محمد قاسم صادق موہڑوی ؒ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کے مشن کو ثبات حاصل ہے اور جن کی تعلیم ہر دور میں متلاشیان نور وحدت کے لئے راہنما رہی ہے کہ

''ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما''

40۔ حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

(م 1395ھ)

غزنی افغانستان کے دارالحکومت کابل سے ایک سو پینتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم شہر ہے جس کا ذکر ماورائے تاریخ کے دور میں بھی ملتا ہے حتّٰکہ بدھ مت کے عروج کے دور میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بھی جغرافیہ دان اس کا ذکر کرتے ہیں حتّٰکہ کسی دور میں بھی یہ علاقہ ارباب تاریخ وسیر نے نظر انداز نہیں کیا مگر اس علاقے کو شہرت عام محمود غزنوی (م 421ھ 1030ء) کے عہد سے حاصل ہوئی۔ سبکتگین کا دور حکومت ہی اس خطے کو تاریخی عظمتوں سے ہم کنار کر گیا تھا۔ جبکہ محمود غزنوی کی مسلسل تگ وتاز نے اس علاقے کا نام کامیابی وسرخروی کا متبادل بنا دیا تھا۔ محمود تاریخ عالم میں ایسے نقوش چھوڑ گیا کہ غزنوی نسبت ہی معتبر قرار پائی۔ ماوراء النھر کا علاقہ ہو یا برصغیر کا شمالی حصہ محمود کی ایسی جولاں گاہ بنا کہ آج تک اُس کا نام فتح ونصرت کا نشان سمجھا جاتا ہے محمود غزنوی کی شجاعت ودلاوری تو ضرب المثل تھی ہی اُس کا تقویٰ ودینداری بھی اپنی مثال آپ تھا۔ حضرت ابوالحسن الخرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت کی نسبت اور اُن کے زیب تن لبادے سے کسب نصرت آج بھی تذکرہ نگاروں کے لئے محبوب قصہ ہے۔ یہ اس مقام کی قسمت تھی کہ ایک شہرہ آفاق نام سے یہ سرزمین منسوب ہوگئی کہ جب علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنی عظمتِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں تو اس جانب اشارہ کرتے ہیں اور حسرت آمیز لہجے میں کہتے ہیں کہ

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

آیئے اسی غزنوی تڑپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے نیریاں شریف کا رخ کرتے ہیں۔

نیریاں شریف جو ہزار ہا قافلہ ہائے شوق کی منزل مقصود ہے ایک صدی پہلے کوئی معروف بستی نہ تھی۔ کشمیر کے نوکیلے پتھروں سے گھری ہوئی یہ بکھری بکھری آبادی چند گھروں پر مشتمل تھی جو ''ڈنا پوٹھی امیر خان'' کہلاتی تھی۔ نہ وہاں وسائل دستیاب تھے اور نہ سفر کی کوئی سہولت، جسے آنا تھا پتھروں پر چل کر آنا تھا اور ہانپتے ہوئے آنا تھا۔ کشمیر کی بیشتر آبادیاں مجلسی حسن سے بھی بے نیاز تھیں اور ہمسائیگی کی طمانیت سے بھی محروم تھیں مگر قدرت کا فیصلہ تہہ در تہہ ہوتا ہے۔ منظور یہی تھا کہ اہل اللہ کا مسکن آباد وشاداب نہیں ہوا کرتا بلکہ ہمہ وقت ''وادٍ غیر ذی زرع'' کا منظر پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ پروردگار سے لولگانے والے سماج کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ اُن کی حالت تو اکثر ایسی ہی ہوتی ہے کہ

اب چراغ اپنا تہہ دامن جلالیتا ہوں میں
جب بھی تنہائی ملے محفل جمالیتا ہوں میں
نغمہ دل دل ہی دل میں گنگنا لیتا ہوں میں
دل ہی دل میں رقص کرلیتا ہوں گالیتا ہوں میں

ایک فرد جب انجمن بن جائے تو رعنائیاں بہاریں دینے لگتی ہیں۔ ایسا ہی واقعہ ڈنا پوٹھی امیر خان کے ساتھ ہوا گمنامی میں لپٹی ہوئی سرزمین اس قدر معروف

ہوئی کہ وطن عزیز میں ہی نہیں دیارِ غیر میں بھی جذب کا سامان بنی۔ یہ سب کس کے قدموں سے ہوا ذرا اُس وجود مسعود کی روداد زندگانی پڑھئے۔

ولادت:

غزنی کا ایک دیندار گھرانہ جس کی روایت میں للھیت کی شمع روشن تھی۔ غزنی کی مضافاتی بستی ''مہان'' کا رہائشی تھا۔ تقویٰ شعاری اور حسنات شماری کا ہالہ اس گھرانے پر ضوفگن تھا۔ ملک محمد اکبر خاں رحمۃ اللہ علیہ معاشرتی وقار بھی رکھتے تھے کہ جاگیردار تھے اور اپنے علاقے کے نمایاں افراد میں سے تھے مگر اس کے ساتھ اُن کا دینی حوالہ اورزیادہ معتبر تھا۔ احترام بہر طور حاصل تھا۔ افغانی روایات کے مطابق کمال خیل قبیلے سے تعلق تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کمال اس خاندان کی اساس تھا۔ نسبی اعتبار سے ارباب سلوک سے تعلق تھا اور کئی نامور اہل عظمت شجرہ نسب کی زینت بنے تھے۔ اسلاف کے حالات اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ حسناتِ دین و دنیا کی اساس رزق حلال پر تھی زمیندار گھرانہ تھا، وسیع اراضی کی ملکیت حاصل تھی باقی صاحب نیریاں شریف کا اپنا بیان ہے کہ

''غزنی وگردیز میں جائداد، زمین وکھیتی باڑی کا اسی قدر وسیع رقبہ تھا کہ اگر ایک گھڑسوار علی الصبح نکلتا، تو دوپہر تک بمشکل ہی ساری زمین کا چکر لگا سکتا تھا''۔1

قدرت کو شاید اس سے زیادہ وسعت عطا کرنا مقصود تھا کہ جو گھرانہ غزنی کے گرد دوپہر تک کے سفر کو وسعت خیال کر رہا تھا اُس کی جولان گاہ برصغیر ہی نہیں یورپ اور امریکہ بھی ہے۔

صاحب ثروت اور صاحبِ کرامت اس گھرانے میں 1902ء کا سال سعادتوں کا ابر بہار بن کر آیا کہ اس سال اس گھرانے میں ایک بابرکت وجود کا اضافہ ہوا۔ سعادت مندی سے فیض یاب یہ گھرانہ جسے شرفِ خدمتِ خواجگان کا اعزاز حاصل رہا تھا نے نومولود کا نام۔ غلام محی الدین رکھا کہ آنے والا ہر بچہ محی الدین کا غلام ثابت ہوا۔

مراحل تربیت:

ماحول پاکیزہ ہو اور پاکدامنی کا سایہ تنا ہوا ہو تو سعادت کی راہیں کھلنے لگتی ہیں ابھی کم سن ہی تھے کہ نیک نام ماموں حضرت مولانا گل محمد رحمۃ اللہ علیہ کی علمی سرپرستی میں آگئے، درسیات کی مروج ترتیب کے مطابق قرآن مجید ناظرہ سے سفرِ علم کا آغاز کیا حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مسلمان بچوں کی تعلیم کی ابتداء قرآن مجید سے ہونی چاہیے اس لئے کہ بچے کو شائستہ انسان بننا ہے اور قرآن مجید کتاب انسانیت ہے فارسی کا ماحول تھا کہ یہی معاشرتی زبان تھی اس لئے یہ بھی درسیات کی تمہید میں شامل تھی۔ استاد مشفق ہو اور ماحول بھی ہو تو تربیت کے مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو ملتے تو فرماتے کہ گواہ رہنا یہ میرا ماموں ہے اور انسان کو اپنے ماموں کی رعایت رکھنی چاہیے بعد کی زندگی اس ابتدائی تربیت کے حسن کا وہ خوشگوار نتیجہ ہے جو ایک ہونہار نوخیز کو لاکھوں انسانوں کا راہبر بنا گیا۔

تربیت کے ابتدائی ایام گزرے تو دیگر علمی مراکز کی طرف توجہ ہوئی۔

زرمت قریب ہی تھا اور وہاں ایک معیاری مدرسہ تھا وہاں حاضر ہوئے اور کسبِ حسنات کا سامان کرتے رہے، افقِ علم اور وسیع ہوا تو گردیز کے معروف مقام لوگر چلے آئے، مدرسے سے مدرسے کا سفر عیاں کرتا ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش طبیعت کا جوہر تھی درسیات کی بنیادی کتابیں پڑھ لیں مگر طبیعت کی جولانی علم سے واردات کی طرف کھینچنے لگی، اتنا علم حاصل ہو گیا تھا کہ معلومات قابل اعتماد ہو گئی تھیں پھر منزل مشاہدہ ٹھہرا، درسیات کی مروجہ تقسیم کے مطابق سندِ فراغت تو نہ پائی مگر درونِ دل ایک ہنگام ضرور بپا ہو گیا۔ جذب کی دنیا آباد ہونے لگی اور راہبر کامل کی تلاش مضطرب کر گئی طلب صادق ہو تو درست راہنمائی بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ اشارے ملنے لگے کہ پنجاب میں اس اضطراب کا مداوا ہے مزید راہنمائی کے لئے حضرت یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بھی حاضری دی کہ صلحاء کے مزار بھی عشاق کے لئے راہبری کا وسیلہ بنتے ہیں اس لئے تو شکیب نے کہا تھا (کچھ تغیر کے ساتھ)

یوں بے سبب تو کوئی انہیں چومتا نہیں
کچھ تو ہے پتھروں میں خدوخال کی طرح

طبیعت کی جولانی تلاش حق میں کہیں سے کہیں لئے پھری، خاندانی پیشہ زراعت وتجارت تھا نگاہ بلند ہو تو زراعت عجز کی پرورش کرتی ہے اور تقسیم برکات کا وسیلہ بنتی ہے اور تجارت تجربات کے ایسے ایسے رُخ کھولتی ہے کہ نظر وسعت آشنا ہو جاتی ہے۔ یہ وسعت آشنائی خواجہ غلام محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کو بائیس سال کی عمر میں افغانستان کی محدودیت سے برصغیر کی وسعتوں میں لے آئی۔ یہ ترکِ وطن تو کسی کی تلاش میں تھا مگر بظاہر بہانہ تجارت تھا شمالی پنجاب کی سطح مرتفع، افغانستان سے ہم

رنگ تھی اس لئے ماحول کی اجنبیت نے راہ نہیں کاٹی۔ تجارتی اسفار دور ونزدیک کے مرکزی مقامات سے متعارف کرا گئے۔ تجارت کا پیشہ ہمہ سفر کا متقاضی ہوتا ہے اور تجارت کی ساکھ کردار کی عظمت سے قائم رہتی ہے۔ افغانستان کا ایک پاکیزہ کردار تاجر جہاں جہاں بھی گیا لوگوں کو متوجہ کرتا گیا یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزنی کا یہ تاجر بظاہر خرید وفروخت میں منہمک ہے مگر در پردہ کسی ایسی تجارت کا متلاشی ہے جو زندگی بھر کا سودا کر دے۔ قرآن مجید میں ارشاد پروردگار ہے کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾

(النور:37)

"وہ مرد جنہیں تجارت اور خرید وفروخت ذکر الٰہی سے غافل نہیں کرتی، وہ نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے ہیں اور وہ ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جب دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی"۔

یہ غفلت اس لئے نہیں ہوتی کہ ایسے مردانِ پاکباز اپنے ہر ہر عمل میں ایسے نفع بخش رویّے اپناتے ہیں کہ جن میں نقصان نہیں ہوتا اس لئے ایسے صالحیتِ پسند افراد کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ

يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (فاطر:29)

"وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو خسارہ والی نہیں ہے"۔

مردانِ باصفا اسی تجارت کی طلب رکھتے ہیں اور قریہ قریہ، بستی بستی اخلاص کی یہی جنس بے بہا فروخت کرتے پھرتے ہیں۔ خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سفر بھی اسی

مقصد کے لئے تھا۔ خوشحال گھرانہ، آسودہ ماحول، تقویٰ کا احرام باندھے ہوئے جوان اس سفر نصیب پر نکلا تھا۔ بظاہر معیشت کا سامان کرتا تھا مگر بباطن آخرت کی کامرانیوں کی تلاش تھی۔ کامیاب ارض شناس، سطح زمین سے ہی اندر کے خزانوں کو بھانپنے لگتا ہے کہ اُسے یہ ضروری حسِ لطافت حاصل ہوتی ہے۔ اکتشافاتِ زمین کا ماہر اُسی جگہ ڈیرے ڈالتا ہے جہاں اُسے حصولِ مدعا کی امید ہوتی ہے۔ اہل سلوک کا سفر بھی بامقصد اور نیل مراد کا حامل ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ متاعِ حسنات کا یہ خریدار وادیوں اور چوٹیوں کا سفر کرتا رہا۔ سفر کا رُخ متعین نہ تھا مگر مقصود واضح تھا چہار جانب کا سفر تھا مگر

''آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اسی گردش میں ایک قافلے سے رابطہ ہوا۔ ارادہ سفر دریافت کیا تو بتایا گیا کہ یہ راہروان شوق موہڑہ شریف کا ارادہ باندھے ہوئے ہیں کہ وہاں ایک مردِ قلندر فروکش ہے جو سب کا مطلوب ہے یہ جماعت اس لئے سرگرم سفر ہے کہ موہڑہ شریف میں عرس کی تقریب ہے اور ان متوسلین کو اس روح پرور اجتماع میں شرکت کرنا ہے یہ اطلاع جانفزا تھی۔ عقیدت کی ایک لہر وجود میں گردش کرنے لگی۔ معیت تو اُس وقت امکان میں نہ تھی۔ غائبانہ حاضری کا فیصلہ کرلیا۔ اُن مسافروں میں ایک آشنا بلور خان بھی تھا۔ اُس کے سامنے کچھ نقدی پیش کردی کہ یہ امانت صاحب امانت کو پہنچادی جائے، ہدیہ پیش کیا اور عرض کیا۔

''میری طرف سے حضرت باباجی صاحب کی خدمت میں یہ نذرانہ عقیدت پیش کرکے عرض کرنا کہ غزنی کا ایک مسافر آپ کی خدمت میں عاجزانہ سلام عرض

کرتا ہے''۔2

بلور خان اپنے قافلے کے ساتھ حاضر دربار ہوا۔ مگر پہلی فرصت میں یہ نذرانہ پیش نہ کرسکا۔ حضرت باباجی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایک امانت تمہارے پاس تھی تو نے پہنچائی نہیں ہے۔ بلور خاں اس کوتاہی پر نادم ہوا اور نذرانہ پیش کردیا مگر حضرت باباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بصد اشتیاق فرمایا۔

''بیٹا واپس جاکر کہنا مجھے تیرے نذرانے کی ضرورت نہیں بلکہ تیری ضرورت ہے''۔3

یہ پیغام ایک مہمیز تھا مگر یہ تو ایک بہانہ تھا دراصل تو شوق کے اپنے پر ہوتے ہیں۔ شوق و وصل گلے مل چکے تھے اور دعوت تو بذاتِ خود دی جاچکی تھی۔

موہڑہ شریف کی حاضری:

یہ روحانی رابطہ اور یہ دعوتِ محبت، شوقِ خوابیدہ کو بیدار کرگئی، اپنے ہم سفر پیر محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حاضری کا فیصلہ کرلیا گیا، عرس کا روح پرور سماں تھا کہ یہ راہروانِ شوق وادی پونچھ سے پیدل ہی چل پڑے مسافت طویل بھی تھی اور صبر آزما بھی مگر یہ قافلہ شوق رواں دواں رہا، اللہ اللہ یقین کی وادی تک موانعات کی کس قدر روح فرسا مسافت ہوتی ہے مگر یہاں تو معاملہ عجیب تھا کہ

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

آخر وہ منزل آگئی جو منزل مراد تھی، دربار نقشبندیہ میں حاضر ہوگئے، عرس

کی تقریبات میں شریک ہوئے، روح شاداب ہوگئی تڑپ کو مہمیز لگی اور عقیدت کو معراج نصیب ہوئی۔ اب طالب ومطلوب آمنے سامنے تھے۔ غیریت کا حجاب اٹھ گیا تھا، قیام مختصر تھا کہ عرس پر ہی حاضری تھی مگر یہ حاضری دائمی موانست کا پیش خیمہ بنی، تجارتی قافلہ اپنی آخری منزل پر تھا۔ اب زندگی بھر کی بیع ہوئی تھی۔ سلسلہ نقشبندیہ کے مطابق ارادت مندوں کی صف میں شامل ہوگئے۔ بیعت کا پیمان باندھا اور رخصت ہوگئے مرشد کریم نے الوداع کیا اور حسب حال پیش گوئی فرمائی کہ

''جاؤ بیٹا! تمہاری دکان خوب چلے گی۔ مشرق ومغرب والے اس دکان سے سودا خریدیں گے''۔4

چندروز بعد ہی یہ دعا تعبیر بن کر سامنے آگئی۔ کاروبار خوب چلا اور نفع بڑھتا ہی گیا۔

دوسرے سال عرس پر حاضر ہوئے، نذرانہ پیش کیا پھر دعاؤں سے نوازے گئے واپس لوٹے تو یہ امید مستحکم تھی کہ اس بار نفع کی شرح زیادہ ہوجائے گی مگر معاملہ الٹ نکلا۔ جو کام بھی کیا، بجائے نفع کے نقصان ہی ہوا۔ گھاٹا اس قدر تیزی سے نفوذ کرتا گیا کہ ساری رقم اسی خسارے میں چلی گئی۔ فرماتے ہیں کہ کہاں اس قدر خطیر متاعِ تجارت اور کہاں صرف ساڑھے تین سو روپے۔ حالات کی ناسازگاری اور معاملات کی الٹی روش نے مجبور کردیا کہ یہ تگ ودو چھوڑ دی جائے۔ اور واپس غزنی چلا جائے۔ فیصلہ ہوچکا تو آخری بار زیارت کے لئے موہڑہ شریف کا راستہ لیا۔ نقصان کا بھی دکھ تھا اور ناکام لوٹنے کا بھی قلق تھا۔ حاضر ہوگئے رقم کی بے ثباتی کے گرداب میں تھے کہ حضرت باباجی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ بیٹا لنگر میں کچھ ضرورت ہے جو ہے وہ

بھی شامل کردو۔ ایک اضطراب آمیز قلق ہوا مگر نہ کہنے کی عادت نہ تھی جو تھا پیش کردیا اگرچہ اس محرومی پر قدرے پریشان بھی ہوئے۔ یہ مادی پریشانی صفائے قلب کی تمہید ہوتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، کسی نے دربار میں اطلاع کردی۔ بلایا اور بالاصرار بلایا اور فرمایا یہ رقم کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو تیرے لئے خزانہ بھرا ہے۔ یہ کہا اور نم دیدہ عاشق صادق کو سینے سے لگالیا بس پھر کیا تھا قلب پریشان کو وہ منزل مل گئی جو آسودگی کا منبع اور راحتوں کا گہوارا تھی۔

موہڑہ شریف میں قیام:

موہڑہ شریف طالب صادق کے لئے مرکز سکون بنا واپسی کا خیال بھی دل سے نکلا اور ہمہ وقت لنگر خانے کی خدمت کو شعار بنالیا۔ بارہ سال کا عرصہ اسی خدمت میں گزرا۔ تنہائیوں میں وطن بھی یاد آتا رہا۔ رشتہ دار احباب بھی بے قرار کرتے رہے مگر یہاں تو عزم بالجزم تھا، کہیں خیال بھی آیا تو مرشد کریم رحمۃ اللہ علیہ نے دستِ تسلی سے یہ خیال بھی جھٹک دیا۔ یہ عزلت نشینی کی مشق تھی کہ جہاں ہر خیال غیر مٹنے لگتا ہے انسان جب ایسا خاندان چھوڑ کر آئے جو معاشرتی وقار کا حامل ہو۔ ایسی جائیداد چھوڑے جو آسائشوں کی نوید ہو اور ایسے ماحول سے کٹ جائے جہاں چاروں طرف احترام ہی احترام ہو، تو یہ نعمتیں کبھی کبھی شب خون مارتی ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا مگر ''تبتل اِلَیہ تبتیلا'' کی منزل کے راہی ان واہموں سے کنارہ کشی ہوجاتے ہیں اس لئے ایسے خیالات بھٹکاتے نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ یاد آیا کہ جوانی میں گھر چھوڑا تھا۔ ایسے جوان رعنا کے حوالے

سے ماں باپ کے بہت ارمان ہوتے ہیں۔ اس لئے چچازاد سے نسبت طے ہو چکی تھی اور افغان روایت کے مطابق یہ نسبت معاشرتی حصار ہوتی ہے کہ نکاح اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے یہ خیال آتے ہی عرض گزار ہوئے کہ اپنے لئے نہ سہی ایک زندگی منتظر ہے اُس کے حقوق ہیں اس لئے اتنی اجازت دے دیجئے کہ معاشرتی مجبوری نبھا سکوں مگر یہاں تو معاملہ ہی اور تھا نسبتوں کا ہر بندھن توڑ دیا تھا ہاں نسبتیں خود کبھی آئیں گی۔ یہی ہوا کہ کچھ عرصہ بعد خاندان کے تمام نمایاں افراد غزنی سے چلے اور موہڑہ شریف آ گئے۔ یہ سارا قافلہ برادر اصغر جناب محمد دراب خان ؒ جو پیر ثانی کے نام سے معروف ہوئے کی قیادت میں موہڑہ شریف آ گیا اور حسبِ روایت نکاح ہوا اور معاشرتی بندھن کا آغاز ہوا، اس طرح یہ خاندان ہمیشہ کے لئے موہڑہ شریف کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

موہڑہ شریف کا قیام لنگر خانے کی خدمت میں گزرا۔ خدمت گاری کا انہماک کبھی کبھی ایک خلش کا بھی باعث بنتا کہ اتنا عرصہ حاضر دربار ہوئے ہو گیا مگر گوہر مقصود حاصل نہیں ہوا۔ افغان خاندان اور کوہستانی بودوباش اپنے اندر ایک جذبہ انا ضرور رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے ہی نہیں کہا تھا کہ

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی　　یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

تاریخ گواہ ہے کہ بندہ صحرائی وحدت آشنا ہوتا ہے کہ اُس کا مشاہدہ نیچے بچھی ہوئی ریت کی وحدت آشنائی دیکھتا ہے یا آسمان پر پھیلا ہوا نیلگوں صحرا، یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ وحدت پرست ہوتے ہیں۔ اور توحید مست رہتے ہیں جبکہ مرد کہستانی پتھروں کے کناروں پر رہنے کا عادی ہوتا ہے اس لئے مشقت طلب اور

ہمہ محتاط ہوتا ہے، خارزاروں کے خطرات اس کے اندر حزم کا جوہر پیدا کر دیتے ہیں ہمارے ممدوح بھی انہیں پتھروں پر چلنے کے عادی تھے اس لئے ہر قدم احتیاط کا پہلو پیش نظر رکھتے اور قدم بڑھانے سے پہلے قدم رکھنے کے مقام کا مشاہدہ کرتے تھے یہی دور بینی اُن کے اندر کئی سوال اٹھا رہی تھی کہ یہ سفر کس لئے؟ اور اگر مقصود یاد دلا دیا گیا ہے تو وہ زیر قدم کیوں نہیں اس کشمکش میں یہ عادت بنا لی کہ لنگر تیار کر کے تقسیم کی اجازت طلب کی جاتی۔ اس طلب میں اپنا مدعا بھی بیان کر دیتے کہ ہر مسافر کو اُس کا مقسوم لنگر مل رہا ہے تو یہ مسافر اپنے مقسوم سے کب تک محروم رہے گا، بشارت تو دی جا چکی تھی اس کے عملاً حصول کا لمحہ کونسا ہے۔ عرضداشت ہر روز پیش کر دی جاتی مگر نتیجہ کا انتظار رہتا۔ چار سال کا طویل عرصہ اسی نامہ و پیام میں گزرا۔ طلب جب حد سے بڑھ گئی تو ایک روز بلایا اور ارشاد فرمایا۔

”گلاب کے پھول کے شگوفہ کو چاقو سے ادھیڑو تو خوشبو زیادہ دیتا ہے یا کہ جب وہ اپنے وقت پر خود بخود کھلے تو خوشبو یا مہک زیادہ ہوتی ہے“۔

جواب میں خاموشی تھی، دوبارہ سوال کیا پھر سہ بارہ پوچھا آخر جواب تھا کہ وہ خود ہی کھلے تو خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ بس یہی لمحہ تلقین تھا فرمایا۔

”پھر تم مجھے روزانہ کیوں تنگ کرتے ہو“۔[5]

یہی سارے اضطراب کا جواب تھا جس کو سنتے ہی دل و دماغ کے وسوسے دور ہو گئے اور ہر خیال رد ہو گیا پھر آٹھ سال کا عرصہ اسی انتظار میں گزرا کہ یہ پھول کب خود بخود کھل اٹھے۔ یہ دورانیہ امتحان تھا اور رویوں کی آزمائش تھی مرید باصفا نے اس تمام عرصہ درِ مرشد کی صیانت کو برقرار رکھا۔ مسجد کا سا ادب دیا اور پیر خانے کے ہر گوشے کو طہارتوں کا امین بنایا۔

خلافت:

بارہ سال کی مسلسل محنت وخلوص کا حاصل وہ خلافت تھی جو درِ مرشد سے حاصل ہوگئی۔ یہ اعلان تھا کہ مرید اب مراد بننے کی صلاحیت پا چکا ہے اور پیرخانے کی طرح اس کا درِ فیض بھی وا ہو چکا ہے۔ خلافت کی منزلت آپ کے ساتھ پیر محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حاصل ہوئی کہ یہ دیرینہ ہم سفر مستقل ہم عناں رہے۔ پیر ثانی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ کافی دیر بعد رفیق کار بنے تھے مگر جب دریا جولانی پر ہو تو نوازنے میں تاخیر نہیں ہوتی۔ مقصود حاصل ہو چکا تھا اس لئے محسوس کیا کہ سفر منزل تک آگیا ہے۔ اب واپس جانا چاہیے کہ متعدد لواحقین منتظر تھے مگر تقدیر کا فیصلہ سب ارادوں پر نافذ ہو جایا کرتا ہے۔ واپسی کی اجازت نہ ملی بلکہ مستقل کی نشاندہی کر دی گئی، آخر اُس بستی کا بھی حق تھا جو مدت سے کرم کی امید لئے ہوئے تھی۔ تراڑکھل کے نواح میں ڈنا پوتھی امیر خان کی قسمت جاگی اور صاحبزادے بلکہ متوقع جانشین حضرت پیر زاہد خان رحمۃ اللہ علیہ کو حکم ملا کہ ان تینوں ہم سفر ساتھیوں کو ڈنا پوتھی امیر خاں، چھوڑ آئیں۔ یہ مقام اُس دور میں ایک پہاڑی جنگل تھا جہاں آبادی بے موسمی فصل کی طرح تھی سنگلاخ زمین جس کے سینے پر خودرو جھاڑیوں کا قبضہ تھا وہاں چند جھاڑیاں کٹوا کر ایک جھونپڑا بنا دیا گیا۔ ایک بے آبادسی مسجد سجدہ گاہ بنی اور پیر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرشد کریم کے ارشاد کے مطابق وہاں تینوں کو ٹھہرنے کا اشارہ دیا۔ یہ جگہ کیوں منتخب ہوئی، کیا اس کی بے ترتیبی کسی ترتیب کی متلاشی تھی یا یہاں سطحِ ارض کا یہی تقاضا تھا، تصور کیجئے صاحبزادہ کس قدر دیدہ ور تھا کہ بٹھاتے ہوئے کہا تو ہوگا کہ یہاں قیام کرلو کہ

سطحِ ارض کا پایا ہے معتبر میں نے

نیریاں شریف کی قسمت:

یہ سرزمین جو ہر مسافر کی آبلہ پائی سے خراج وصول کرتی رہی تھی اب چشمانِ عشاق کا سرمہ بن گئی تھی، ایک ویرانہ اتنا دلکش قرار پایا کہ ویران دلوں کے لئے وجہ سکون بنا، گردونواح سے ہی نہیں دور و نزدیک سے متلاشانِ علم ومعرفت اس ویرانے سے اس قدر مانوس ہوئے کہ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ یہ مقام محبتوں کا امین بن گیا۔ دن رات قافلے روانہ ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ پتھر نشانِ منزل بننے لگے۔ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اطمینان ووثوق سے کہتے ہوں گے۔

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ویرانوں کو آباد کرنے والوں کے شب و روز بڑی مشکل اور انتہائی عسرت سے گزرتے ہیں قدموں سے چشمے نہ پھوٹیں تو حلق ایک ایک قطرہ آب کوثر کو ترستے ہیں حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی جدوجہد کی طویل داستان ہے۔ جوان ہوئے تھے تو ہر موجود آسائش کو قربان کر دیا تھا اور پر تعیش زندگی کو مسافرت کی کلفت سے بدل لیا تھا۔ منزل یقین ہویدا ہونے لگی تھی تو مجاہدوں کا تسلسل تھا۔ موہڑہ شریف کی زندگی سراپا خدمت تھی اور پھر نیریاں شریف کا ٹھکانہ مصائب ومشکلات کا ایک تنگ گھیرا تھا۔ ریاضت ومجاہدہ اضطراری ہو یا اختیاری ہر وقت محیط رہا۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ منزل آئی کہ کہا جا سکتا ہے۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (الم نشرح)

کہ بے شک تنگ دستی کے ساتھ فراخ دستی بھی ہے۔

قرآن مجید میں یہ خوشخبری دو مرتبہ دوہرائی گئی یہ صرف تکرار کا مرحلہ نہ تھا الْعُسْرِ کو دونوں مرتبہ ال کے ساتھ ذکر کیا کہ اسے خصوص عطا کیا گیا اور قانون یہ ہے کہ معرفہ جب تکرار لے تو مراد ایک ہی وجود ہوتا ہے مگر جب نکرہ تکرار لے جیسا کہ ان آیات میں ہوا تو مراد دو مختلف وجود مراد ہوتے ہیں۔ بشارت یہ تھی کہ تنگ دستوں سے نہ گھبراؤ ان کے بعد آسائشیں آتی ہیں اور یہ بھی یقین رہے کہ ایک تنگ دستی کا انعام دو بار آسائش ہوتی ہے۔ انسان صابر ہو اور توکل کی منزل پر ہو تو سہولتیں موسلا دھار بارش کی طرح برستی ہیں، شرط یہ ہے کہ بھروسہ یقین کی حد تک ہو، یہی نیریاں کی سرزمین پر ہوا کہ کہاں دشوار گزار رستے اور کہاں سفر کی یہ آسانیاں، کہاں بوند بوند پانی کی محتاجی اور کہاں فیض کے بہتے ہوئے دریا کہ قرب وجوار والے بھی سیراب ہو جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایات ہیں صرف عجز کی وابستگی چاہیے۔ نیریاں شریف کے پہاڑ ہر آنے والے کو دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں کہ جہاں جہالت کا ڈیرا تھا آج وہاں علم کے دھارے بہہ رہے ہیں۔ یہ وہ کرامت ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں آتی۔

معمولات:

حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک پروقار شخصیت کے حامل تھے۔ چہرہ کشادہ اور رخشندہ تھا کہ ہر آنے والا جاذبیت محسوس کرتا تھا۔ زائرین بلا کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے حاضر ہو جاتے۔ ہر حاجت پیش کی جاتی اور ہر کسی کے لئے دربار ایزدی

میں دستِ سوال دراز ہو جاتا۔ ہر نیا آنے والا اپنائیت محسوس کرتا، طبیعت میں سادگی تھی مگر اس سادگی میں بھی وقار تھا۔ سنت مطہرہ کی پاسداری کا شدت سے التزام تھا۔ گفتگو سادہ، عام فہم اور اصطلاحی حوالوں سے خالی ہوتی تھی مگر ایک ایک لفظ گوش حق نیوش کے لئے امرت کا قطرہ ہوتا تھا۔ ذوق ہی فراواں نہ ہوتا حسن سماعت بھی معطر ہوئی۔ گفتگو کا عمومی موضوع ذکر واذکار تھا۔ فرائض پر مداومت، سنن کی حفاظت اور نوافل پر مواظبت پر زور رہتا اور ارادت کے تمام پہلوؤں کی ہمنوائی کا درس دیا جاتا، طبیعت میں درشتی نہ تھی بلکہ عجز تھا، مخالف بھی آجائے تو استقبال کرتے تھے اور اخلاقِ کریمانہ کا اظہار فرماتے۔

علماء کی قدر وقیمت کا جتنا خیال اس دربار میں رکھا جاتا تھا وہ اپنی مثال تھا، نقشبندیت کے جملہ لوازم پر مداومت تھی۔ اس مسلک صدّیقیت کی طہارت کا بہت خیال تھا۔ طریقت کو شریعت سے الگ یا ماوریٰ نہ جانتے تھے بلکہ اس حوالے سے مجددی طرز سلوک کے پابند تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کے دل وجان سے معترف تھے اور بعض نام نہاد صوفیاء کے اس خیال کی شدت سے تردید کرتے تھے کہ ولی اپنے مدارج میں صحابی سے بھی بالا ہو سکتا ہے صف مقبولاں میں صحابی سے بڑھ کر کوئی مقام نہ تھا صحابہ کی حرمت کو جزو ایمان سمجھتے تھے، دعوت ارشاد میں اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا یہ ارشاد ربانی معمولات دعوت کی اساس تھا کہ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل:125)

کہ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور حسین تر نصیحت سے بلائیے۔

یہ اصول بھی ہمیشہ راہنما رہا کہ

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ (المائدۃ:67)

وہ پہنچایئے جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے آپ کے رب سے

حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات پر غور کیا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ تبلیغ حدود تنزیل میں ہے یہی وجہ تھی کہ علم کی فرضیت کے قائل تھے اور اہل علم کو برتر مقام دیتے تھے مگر یہ ضرور ہے کہ آپ کی کوشش یہی رہی کہ علم صرف معلومات کے حصول کا ذریعہ ہی نہ رہے بلکہ اسے واردات بن جانا چاہیے کہ علم وہی معتبر ہے جو مشاہدہ بن جائے یہ بھی خیال رہتا تھا کہ علم کی نفع بخشی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ علم شرفِ انسانیت ہے مگر یہ نفع رسانی کا ذریعہ بھی ہے کہ مقصود انسانوں کی بھلائی اور خیر خواہی ہے۔

نیریاں شریف کا مرکز حقیقتاً مرکز علم تھا۔ نشرِ علم تصوف کی اساس ہے۔ یہ رُخ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے دور سے ہی متعین ہو گیا تھا اور آج اس مرکز پر ایستادہ ایک جامعہ اسی نشرِ خیر کا عملی اظہار ہے۔ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کیونکہ ایسے علاقے میں قیام پذیر تھے جہاں آمدورفت کی مشکلات بہت تھیں اس لئے آپ نے اس کا ازالہ یوں کیا کہ مختلف مقامات کے دورے کرنے شروع کیے۔ کشمیر تو اساسی ہدف تھا مگر یہ سیل علم و معرفت کشمیر تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ پنجاب، پختون خواہ حتّٰی کہ سندھ و بلوچستان تک ممتد ہوتا گیا۔ جہاں چند متلاشیان علم کا اجتماع دیکھا وہاں ہی درس و تدریس کی مسند بچھادی اور جن متوسلین میں صلاحیتِ کار دیکھی اُنہیں خلافت و اجازت سے بھی نوازا تا کہ اُن کی مساعی میں اجازت کی قوت شامل ہو جائے اسی طرح بہت سے ایسے مراکز قائم ہوئے جنہیں نیریاں شریف کی شاخیں کہا جا سکتا ہے۔

عنایات شیخ:

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کریم حضرت بابا جی محمد قاسم موہڑدی رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات کا عمر بھر تذکرہ کرتے رہے۔ جب بھی کوئی سالک حاضر ہوتا اور راہنمائی کا طلب گار ہوتا تو کوشش کرتے کہ اپنے شیخ کریم رحمۃ اللہ علیہ کے احوال کے بیان سے راہ مستقیم کی وضاحت کریں تاکہ مقصود بھی حاصل ہو جائے اور ادعائے نفس کی بھی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ اپنے معمولات کو بھی وجہ شرف نہ گردانتے بلکہ اپنے شیخ کی عنایات شمار کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے سارے امتیازات کو شیخ کریم کی عطا خیال فرماتے ایک مرتبہ اس حوالے سے بڑا واضح ذکر فرمایا۔ خلافت کی سرفرازی کا ذکر کرتے ہوئے سراپا سپاس بن کر یوں اظہار فرمایا کہ جب سے خلافت عطا ہوئی ہے تین عنایات خصوصیت سے شامل حال ہو گئی ہیں۔

ایک یہ کہ اس نسبت نے اس قدر پاک وصاف کر دیا ہے کہ بے وضو رہنے کا کوئی موقعہ نہیں آیا۔ بتقاضائے بشریت جب بھی بے وضو ہونے کا لمحہ آیا تو فوراً وضو کر لیا یوں ساری زندگی باوضو ہو گئی ہے اس تسلسل میں نہ بیماری کے سبب انقطاع آیا اور نہ کسی عدم دستیابی ماء نے راہ کاٹی یہ طہارت شیخ کریم کا فیضان ہے۔

دوسرا فیضان یہ ہے کہ کبھی نماز قضا نہیں ہوئی۔ نماز پر مداومت اور عبادت کا ہر لمحہ شوق عبدیت کا اعتراف ہوتا ہے۔ نماز ہی وہ عبادت ہے جس میں ہمہ سپردگی ہوتی ہے ایک دیندار شاعر کا کہنا ہے کہ

جب ہاتھ اٹھائے باندھ کے نیت تو یوں سمجھو
دونوں جہاں سے ہاتھ اٹھایا نماز میں

ماسوی اللہ سے دست کش ہونا اور واجب الوجود کے حضور حاضر ہو جانا ہی علمِ سلوک کی اساس ہے۔ حدیث جبرئیل علیہ السلام میں بھی اسی جانب اشارہ ہے کہ عبادت، مشاہدے کا وسیلہ بن جائے۔ یہ عادت جس قدر استوار ہوتی ہے اُسی قدر حرز جان بن جاتی ہے۔ استقامت کی حد یہ ہوتی ہے کہ غیر شعوری کیفیات میں بھی حضوری کا پیمان نہ ٹوٹے، حضرت خواجہ محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ پر ایسے لمحے بھی آئے جبکہ ضرورت قضا کی تھی مگر آپ کا اصرار ادا کا ہی رہا۔ مرض الموت کے جانگسل لمحے بھی اسی اطاعت کا مظہر رہے۔ آپریشن کے ناگزیر مراحل ہوں یا نیم بے ہوشی کے ایام۔ آپ کا شعوری اصرار یہی رہا کہ نماز قضا نہ ہو اور ادا بھی اس صورت میں ہو کہ باوضو ہوں ایسی ہی استقامت ولایت کا نشان ہوتی ہے۔

نسبت کا فیضان پاکیزگی کے روپ میں ظاہری وضو تک ہی محدود نہ تھا غسل وارد ہونے کی طبعی صورت بھی پیدا نہ ہوئی کہ طہارت پورے وجود کی شناخت بن گئی تھی۔

نسبتِ شیخ نے قلب و ذہن کو ہی پاکیزگی عطا نہیں کی تھی ظاہری وجود بھی طہارت آشنا ہو گیا تھا ایسی نسبت پر کیوں نہ ناز ہو کہ یہی تطہیر جسم و روح کا سامان ہوتی ہے، ایسی ہی کیفیات جزو اعمال بن جائیں تو عبادت کا ہر لمحہ بندہ مومن کی معراج بنتا ہے فرمایا کہ

''اولیاء کرام کی نماز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد گرامی الصَّلوٰۃ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن کی صحیح تفسیر ہوتی ہے جب وہ نماز کے ذریعے آلائش دنیوی سے باہر آ کر احکم الحاکمین کی بارگاہ میں رسائی پاتے ہیں تو پھر وہ کلمات کے معانی و مطالب

کی گہرائیوں میں پہنچ کر اپنے رب سے ہم کلام ہوتے ہیں اُس وقت ان پر رب تعالیٰ کی عظمت و جبروت کی ہیبت سے خشوع و خضوع کا وہ عالم طاری ہوتا ہے کہ وہ چشم بصیرت سے ذات باری کے جلووں کے مشاہدہ کی دولت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ 6

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس رشد و ہدایت کا ایک جانفزا سلسلہ ہوتی تھی۔ کسی قرآنی آیت یا کسی قرآنی واقعہ کی تشریح یوں فرماتے کہ ظاہری کلمات کی مراد تک پہنچنے میں مدد ملتی تھی اور یہ وضاحت اس قدر آسان اور دلپذیر لفظوں میں ہوتی کہ ہر سامع اپنی اپنی سطح ذہنی کے مطابق فیض یاب ہوتا تھا یہ بعد والوں کی محرومی قسمت ہے کہ کوئی ہمہ باخبر وقائع نگار جلو میں نہ رہا ورنہ ایک بصیرت افروز کتاب سامنے آجاتی۔ پھر بھی مولانا ریاض صمدانی صاحب کا شکریہ کہ حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پاک کے چند پہلو سامنے آگئے ہیں۔ ان گزارشات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر قرآن و حدیث اور ملفوظات اولیاء پر بڑی وسیع ہے۔ گفتگو میں جہاں عرفانی تشریحات کی جلوہ گری ہے وہاں علمی و فنی نکات کی تابناکیاں بھی موجود ہیں مثلاً قرآن مجید میں بیان کردہ واقعہ ہر مفسر کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ کفر کی عقل پسندی اس سے انکاری تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمان کامل کے باوجود عملاً اطمینان قلب کے خواستگار ہوئے تو چار پرندوں کے ٹکڑے چار پہاڑوں پر رکھنے کا ارشاد ہوا کہ دیکھنا وہ آپ کی آواز پر کس طرح لپک لپک

کرآئیں گے یہی صورت قیامت کے روز ہوگی۔ یہ چار پرندے کبوتر، کوا، مرغ اور مور تھے۔ اہل نظر کے ہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ ان پرندوں کا انتخاب کن وجوہ کی بنیاد پر ہوا۔ علماء تفسیر نے اس کی توجیہہ پیش کی کہ ان چاروں کا انتخاب اُن کی عادات کی وجہ سے ہوا مثلاً کبوتر مانوس پرندہ ہے اس کو ذبح کرنے سے مقصود یہ تھا کہ بندہ خلق کے علائق کو ذبح کردے اور وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا کی منزل کا راہی بنے، مرغ شہوت کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے اس لئے اسے ذبح کرنا دراصل ہوائے نفسانیہ کو ترک کرنا ہے کوا حرص کا نمائندہ ہے اس کو ذبح کرنا دراصل حرص کو کاٹنا ہے، مور خوبصورتی کا نمائندہ ہے کہ اُسے اس خوبصورتی پر ناز بھی ہے اس کو ذبح کرنا دراصل دنیاوی زیب وزینت سے کنارہ کش ہونا ہے۔ یہ چاروں صفات ذمیمہ تھیں جن کو مٹادینا ایمان کی پختگی کا ذریعہ ہے۔ ایسی حکایات کا دلنشین انداز میں بیان تصوف آموزی کی تحریک بنتا ہے جو صوفیاء کی محافل کا مقصود ہوتا ہے۔

ایسے ہی کئی واقعات اور متعدد روایات حضرت خواجہ محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کی زینت بنتے تھے اور متوسلین کی اصلاح کا کام دیتے تھے۔

تصوف کے سلک مروارید کی اساس بیعت ہے یقیناً یہ اصلاحِ احوال کی طرف عملی اقدام ہے مگر اس عقیدت مندی سے بعض نام نہاد صوفیوں نے دنیاداری کا بھی کام لیا ہے اس لئے ہر شیخ کی ذمہ داری ہے کہ بیعت کو پیری مریدی کو راستی کے حصار میں رکھے کہ

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نہ باید داد دست

جتنا یہ نفع رساں طریقہ حیات ہے اتنا ہی پُر خطر بھی ہے۔ اولیاء کاملین اس

حوالے سے ہمیشہ محتاط رہے ہیں اور اس تعلقِ ارادت کی حدود کو مستحکم کرتے رہے ہیں خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اصلاح کے مشن پر تھے اس لئے اس راستے کی نزاکتوں کو جانتے تھے فرماتے ہیں۔

''بیعت کا معنیٰ ہے بیع ہونا یعنی بیچنا، فروخت کرنا، مرید وہ ہے جس نے اپنا ارادہ اپنی مرضی خدا اور رسول کے لئے مرشد کے ہاتھ بیچ دی ہو''۔ 7

پھر فرمایا کہ

''کامل پیر خدا تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک وسیلہ ہوتا ہے کیونکہ کامل پیر علم باطنی وعلم ظاہری اور سرار الٰہی سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ 8

''فقر'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ فقیری کیا ہے؟ فرمایا فقیری ودرویشی یہ ہے کہ اگر فقیر کے ہاتھ میں تمام کائنات کی دولت، مال وزر آجائے تو سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر ڈالے۔ 9

اسے ہی فقر اختیاری کہتے ہیں جبکہ گداو مفلس فقر اضطراری کا اسیر ہے یہی وہ حد فاصل ہے جو فقر کا دعویٰ کرنے والوں کا امتحان ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے   روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

بد قسمتی یہ ہے کہ یہ اصطلاحات جو ذہنی وقلبی معراج کی نشاندہی کرتی تھیں آج ایک رسم بن گئی ہیں۔

نقشبندیہ طرز سلوک اس بارے میں بہت محتاط ہے اور خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اسی سلوک کے داعی تھے۔ آپ کے بیان کردہ اصول تصوف حرف بحرف وہی ہیں

جونقشبندیہ کے امام شاہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے متعین فرمادیئے تھے آپ اپنی اصولوں کا پرچار کرتے رہے کہ

ہوش دردم، نظر برقدم، سفر در وطن اور خلوت درانجمن

کے اصولی مراحل ہی ایک صوفی کامل کا سرمایہ حیات ہیں۔آپ ان کا تذکرہ اجمالی طور پر نہ کرتے تھے ان کے تمام پہلوؤں کو واضح فرماتے تھے بلکہ جو اصول ضمناً روایت ہوئے ہیں اُن کی بھی تاکید فرماتے تھے کہ

یادکرد۔بازگشت۔نگہداشت۔یادداشت

وقوفِ زمانی۔وقوفِ عددی اور وقوفِ قلبی

پیشِ نظر رہیں اس طرز ہدایت سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک نقشبندی مراحل سلوک کی کس قدر اہمیت تھی، یہی اہمیت وہ مریدین پر بھی واضح کرتے رہتے تھے۔

غور کیا جائے تو اس ساری ریاضت کا مقصود ایک ایسا ایمان دار تیار کرنا ہے جس کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے الٰہی میں خرچ ہو۔اس سلسلے میں آپ کی راہنمائی اتنی جامع تھی کہ ہر راہرو شوق منزل آشنا ہو جاتا تھا۔ ہر مجاہدے اور ہر ریاضت کا مطلوب رضائے الٰہی قرار پاتی تھی۔ یہاں تک کہ حصولِ علم کو بھی اسی معیار سے پرکھا جاتا تھا۔ بڑا واضح فیصلہ فرمایا کہ

"علم تلاش حق تعالیٰ کے لئے ہے نہ کہ طلب دنیا کے لئے افسوس ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم حاصل کر کے خدا تعالیٰ کی تلاش وجستجو نہیں کرتے"۔10

یہ تھیں وہ تعلیمات جو نیریاں شریف کی نئی ابھرتی ہوئی بستی کی شناخت

بنیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قافلہ در قافلہ لوگ حاضر خدمت ہوتے رہے اور دامن مراد بھر کر لوٹتے رہے۔ نیریاں شریف کا امتیاز ہی یہ رہا کہ یہاں دین حق کی تعلیم دی جاتی رہی۔علم کی بارگاہ میں مثلاً متلاشیان علم کو پاکیزہ خیالات کے جلو میں پیش کیا جاتا رہا۔ علم کی سطوت قائم رہی اور کسی ذاتی انا کی بنا پر علم پر بے یقینی کا سایہ نہ پڑا۔یہی تصوف کے مراکز کا مطلوب ہوتا ہے۔ اور یہی دین حق کی اشاعت کا طریقہ رہا ہے۔ حتّکہ ایسے لوگ بھی آئے جو ایسے آستانوں کے قائل نہ تھے، بعض میں فکری اختلاف تھا اور بعض شخصی انا کے حصار میں تھے مگر دربار غزنوی میں کسی کو دھتکارا نہیں گیا۔ کسی قسم کا تحکمانہ رویہ اپنایا نہیں گیا۔ اگر علمی مغالطہ سدراہ بنا تو علمی وجاہت سے جواب دیا اور اگر حرص وآز نے پنجے گاڑے تو رفعِ حرص کا سامان کیا، لنگر سب کے لئے تھا کوئی قائل ہو یا متردد، درِغزنوی سب کے لئے کھلا تھا۔ حیرت ہے کہ صرف چھتیس سال کے قلیل عرصے میں علاقے کی بھی قسمت بدلی اور متلاشیانِ علم ومعرفت کی بھی تقدیر جاگی اور دیکھتے ہی دیکھتے نیریاں شریف کی درگاہ صدیوں پرانی بارگاہوں کی صف میں کھڑی ہوگئی۔

کرامات:

صوفیاء کے تذکروں کا یہ لازمی جزو سمجھا جاتا ہے کہ مختلف نوعیت کی کرامات کا ذکر کیا جائے۔ یقیناً کرامت ایک اعزاز ہے جو بارگاہِ صمدیت سے مقربینِ بارگاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ شرف ہے جو نسبت کی استواری اور بے لوث خدمات کا انعام ہے۔ مرتبے اور مقام کے مطابق یہ عزت عطا کی جاتی ہے۔ یہ اظہار ہوتا ہے کہ سالک

کس حد تک مقبول بارگاہ ہے۔ یہ اطاعت کی مداومت اور اتباع کی ہمہ گیری کا نشان ہے۔ اولیاء کرام علیہم السلام سے ایسے واقعات کا ظہور ہوا ہے جو پذیرائی کی دلیل ہوتے ہیں۔ نبی کا معجزہ بے پناہ تعلق اور لامحدود قدرت کا مظہر ہوتا ہے۔ معجزہ صداقت نبوت کی دلیل اور متردد ذہنوں کی تسخیر کا ذریعہ ہے اس لئے معجزہ کا اظہار ہوتا ہے جبکہ کرامت صرف اعزاز ہے اس کا اظہار بھی ضروری نہیں ہوتا مگر کسی حد تک صدقِ کردار کا نشان ضرور ہے۔ اولیاء کاملین کرامات کی کثرت کو ولایت کی شرط نہیں گردانتے بلکہ ولایت کو اتباعِ سنت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بھلا اس سے بڑا شرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ بندہ مومن سیرتِ رسول ﷺ کی صورت لے لے۔ ایک بشر کا افضل البشر ﷺ کی عادات وخصائل کا حامل ہونا سب سے بڑا انعام ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس تباع میں سب سے سبقت لے گئے تھے اس لئے اولیاء کے سردار بنے مگر ان سے کرامات کا ظہور یوں نہیں ہوا جو آج علامتِ ولایت قرار پایا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے کسی ولی کا ذکر کیا اور اُن کی کرامات کی فہرست گنوادی تو فرمایا برتن چھوٹا ہوتو اچھل جایا کرتا ہے یعنی یہ پے در پے کرامات معرفت کا بحر ذخار ہونے کی دلیل نہیں ہیں۔

نبی اکرم ﷺ سے متعدد معجزات ظاہر ہوئے کہ اثبات نبوت مقصود تھا مگر بایں ہمہ قوت کے آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جو عقل وفہم کو تسخیر کرتا ہے اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کے وجود ہیں جو آپ نے اپنی زیر تربیت تیار کئے تھے، حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس سے کم وبیش وجود معجزے ہی تو تھے کہ ایک ایک وجود صداقتِ نبوت کا شاہد تھا۔ اسی

طرح اولیاء اللہ کے متبعین درحقیقت وہ بکھری ہوئی کرامات ہوتی ہیں جن سے اردگرد جگمگا اٹھتا ہے۔

خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی متعدد کرامات روایت ہوئی ہیں جن کا ظہور موقع ومحل کے مطابق ہوتا رہا۔ کہیں بارانِ رحمت کا نزول ہے تو کہیں چشم کشائی کی داستانیں ہیں، کہیں فراہمی آب کے لئے خشک کنوؤں کا اچھل پڑنا ہے۔ تو کہیں حوادث سے امان کی نوید ہے، اگر کہیں لاعلاج مرض سے نجات کا مرحلہ ہے تو کہیں مرض کفروشرک سے رہائی کی منزل ہے۔ بے شمار واقعات متوسلین کے حافظوں میں محفوظ ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ حیات محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ میں مولانا ریاض ہمدانی صاحب نے کیا ہے۔

ان انفرادی کرامات کے علاوہ لائق توجہ وہ کرامات ہیں جو دلوں کو تسخیر کررہی ہیں، ان کی جلوہ گری ایک ایک فرد کی زندگی میں محو جمال ہے اور خلفاء ومتبعین کے سیرت وکردار سے نمایاں ہے۔ آیئے ان کرامات کا جائزہ لیں۔

اولاد:

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے تہتر سالہ حیات ظاہرہ میں تین شادیاں ہوئیں۔ نیریاں شریف کے مقامی احباب میں پہلی شادی ہوئی۔ افغانستان سے منسوب چچازاد سے دوسری اور چکوال پنجاب کے ایک دیندار گھرانے میں تیسری ان تینوں شادیوں سے صاحبزادیوں کے علاوہ سات صاحبزادے پیدا ہوئے جو سب کے سب اپنے والد گرامی کے مشن کا تسلسل قرار پائے۔ تفصیل کچھ یوں ہے۔

پیر نظام الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ:

سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ تقویٰ شعار اور عبادت گزار تھے۔
اپنے والد گرامی کے تبلیغی و توسیعی عزائم میں ہمہ وقت معاون تھے پاکبازی کی شہرت
کے ساتھ دنیا میں رہے اور محبتوں کے جلو میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہو گئے۔

پیر علاؤ الدین صدیقی مدّظلہ

آپ اپنے والد محترم کے مسند نشین ہیں اور سلسلہ کی ترویج و اشاعت کی
کفالت کر رہے ہیں۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

صاحبزادہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ

نہایت فعال خلف الرشید تھے۔ متعدد تبلیغی دوروں پر اپنی صلاحیت منواتے
رہے۔ ابھی پوری جولانی کے ساتھ سرگرم عمل تھے کہ ایک ٹریفک حادثہ میں راہی ملک
عدم ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

صاحبزادہ فضل ربانی مدّظلہ:

دعوت وعزیمت کا حسین پیکر ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ درسیات
کی تعلیم بھیرہ سے حاصل کی ہے۔ خوش الحان بھی ہیں اور خوش گفتار بھی۔ شعر و سخن سے
بھی دلچسپی ہے واحدی تخلص کرتے ہیں۔ تبلیغی دوروں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی
ہیں۔ امید ہے خاندانِ نیروی کا سرمایہ ثابت ہوں گے۔

صاحبزادہ شیر ربانی مدّظلہ:

خوش جمال بھی ہیں اور خوش خصال بھی، ایک قابل اعتماد مقرر ہیں کہ لفظ اُن

کے آگے بچھے بچھے جاتے ہیں، محفلوں میں ذوق سے سنے جاتے ہیں۔ ادیبانہ لہجہ
رکھتے ہیں۔

صاحبزادہ غلام ربانی مدّظلہ:

ایک محنت کش اور پاکباز انسان ہیں نیریاں شریف کے متوسلین کے ساتھ
حسنِ سلوک کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔

صاحبزادہ شمس العارفین مدّظلہ:

بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں اور اپنی والدہ کے واحد کے لختِ جگر
ہیں۔ شعلہ بیان مقرر ہیں نیریاں شریف میں منعقد ہونے والی محفلوں کے مایہ ناز
نقیب ہیں۔ جوش وولولہ کے باوجود نفس مضمون کی ہر جہت پر قابو رکھتے ہیں۔ نہایت
درجہ کے ملنسار ہیں اور خانقاہی نظام کے نمائندہ ہیں۔

خلفاء کرام:

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کریم کا سارو یہ
اپنایا تھا کہ جہاں رشد وہدایت کی بساط بچھانا مقصود ہوتا وہاں اپنا نمائندہ مقرر
کر دیتے۔ یہ ضرور ملحوظ رہا کہ خلفاء کا انتخاب صلاحیت کی بنیاد پر ہو، اس معاملے
میں آپ کا رویہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی طرح محتاط تھا۔ حضرت
باباجی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرید خاص اور بہت سی صلاحتیں رکھنے والے خدمت گار کو حضرت
خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش کے باوجود خلافت عطا نہ کی فرمایا خلافت کی
تین بنیادی شرائط ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص، اس مرید میں عمل کی بھی کمی نہیں۔ اخلاص

کی بھی فراوانی ہے مگر علم مطلوبہ معیار کا نہیں اس لئے خلافت عطا نہیں کی جاتی، ثابت ہوا کہ ان حضرات کے ہاں خلافت صرف خدمت گاری اور قرب کی بنیاد پر نہیں دی جاتی تھی اور نہ ہی سفارش کے زیر اثر، اگرچہ سفارش کرنے والے کس قدر عالی مقام ہوں خلافت ذاتی اوصاف میں پختگی اور صلاحیت کار کی عمدہ توفیق کی بنا پر عطا کی جاتی ہے۔

حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خلافت کو داد و دہش کا وسیلہ نہیں بنایا۔ جس میں صلاحیت دیکھی اور نشرِ حسنات کی ذمہ داری نبھانے کا ملکہ دیکھا، خلافت عطا کر دی آپ کے نزدیک خلافت، مسند کی شہرت کا وسیلہ نہ تھی۔ دعوت وارشاد کی ذمہ داری کا نام تھا۔ اس احتیاط کے باوصف چند متوسلین کو خلافت کے منصب سے نوازا۔ گردش ایام نے اس انتخاب کو اس قدر برمحل پایا کہ یہ نوخیز مسندِ ارشاد اس قدر فیض رساں ثابت ہوئی کہ بڑی بڑی درگاہیں بھی مدمقابل نہ آسکیں۔ مولانا ریاض احمد صمدانی جنہیں سب سے پہلا وقائع نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سترسٹھ ایسے اسماء درج کرتے ہیں جو خلافت کے اہل قرار پائے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مفتی ہدایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

جو مرکز نیریاں شریف میں افتاء کے شعبہ کے نگران تھے۔ لائق اعتماد عالم دین تھے ان پر حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس قدر اعتماد تھا کہ اپنے صاحبزادگاں کی علمی کفالت ان کے سپرد کی تھی۔

حضرت فیض محمد رحمۃ اللہ علیہ

ابتدائی خلفاء میں سے تھے آستانہ عالیہ کی بڑی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت پیر غلام حسین رحمۃ اللہ علیہ

بہت نوخیزی میں دامن کرم کا سایہ نصیب ہوا تھا، پنڈی ضلع کوٹلی کے رہنے والے تھے یہ شرف آپ کو حاصل ہے کہ قیام پاکستان سے بہت پہلے در کرم پر آ گئے تھے۔

حضرت سید محبوب شاہ رحمۃ اللہ علیہ

نیریاں شریف میں طویل عرصہ گزارا اور وہاں ہی وفات پائی۔

ان نمایاں خلفاء کے علاوہ چند معروف نام یہ ہیں۔

حضرت محمد امیر خان رحمۃ اللہ علیہ

جناب پیر غلام محمد صاحب

اقبال نگر ضلع ساہیوال، اقبال نگر اب نیریاں شریف کا ذیلی صدر مقام ہے۔
کشمیر و پنجاب میں یہ سلسلہ خوب پھیلا اور اب تو کوئی دین کا ذوق رکھنے والا نیریاں شریف سے نا آشنا نہیں ہے۔ برصغیر کے علاوہ برطانیہ میں اس سلسلے کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی کہ اس میں اصحاب علم کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

شیخ نذیر احمد مدینہ منورہ

ڈاکٹر سید محمد الغزالی ٹنڈو جام سندھ

پیر عبداللطیف صاحب لاہور

خلیفہ عبدالمجید صدیقی صاحب کراچی

صاحبزادہ غلام جیلانی صاحب برطانیہ

حافظ تصدق حسین صاحب بولٹن برطانیہ

حاجی عبدالرحمن صاحب برطانیہ

خلیفہ مقصود احمد صاحب برطانیہ

حاجی نذیر احمد صاحب برطانیہ اور خلیفہ ریاض احمد صمدانی صاحب مولف کتاب حیات محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ غرضیکہ خلفاء کرام کا اک جہان آباد ہے اور سب اپنی اپنی بساط کے مطابق آستانے کی نیک نامی کا باعث بن رہے ہیں۔

وفات:

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے تہتر برس کی عمر پائی۔ نہایت خوشگوار، محنت پسندانہ ماحول میں نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ نیریاں شریف کو آباد کرنے پر خرچ کیا۔ متوسلین کے ہاں جانے پر بھی تیار رہے۔ قریب والوں کو بھی نوازا اور دور والوں کو بھی محروم نہیں رکھا۔ سفر و حضر میں نشر خیر کا مشن جاری رہا۔ لاکھوں انسانوں کو راستی کا خوگر بنایا۔ شریعت اسلامیہ کی پاسداری کا درس وعظ و نصیحت کے ذریعے بھی دیا اور عملاً بھی ایک روشن نمونہ پیش کیا۔ اس مختصر سے عرصے میں ریاضت و مجاہدے کی کٹھن راہوں سے بھی گزرے اور ”بلغ ما انزل الیك“ کے فرمان کو اُسوہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیم کرتے ہوئے پوری دلجمعی اور مکمل خلوص سے بھی اپنایا۔ شب و روز کی یہ مشقت اور روز روز کا یہ سفر آخر جسمانی توانائیوں کو کھانے لگا۔ اضمحلال پورے وجود پر طاری ہو گیا مگر جب تک توانائی کی آخری رمق بھی باقی رہی پیہم رواں دواں رہے آخر وہ منزل قریب آنے لگی جو ہر جاندار کا مقدر ہوتی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ لمحہ واپسی کا فیصلہ تو حیات بخشی کے ساتھ بلکہ پہلے کر دیا گیا تھا کہ

ارشاد یہی ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ کہ وہ عظمتوں والا رب جس کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے اُس نے ہی موت اور حیات کو پیدا کیا ہے۔ موت کی تخلیق کا ذکر حیات کی تخلیق سے پہلے کیوں ہوا۔ اہل معرفت اسے جانتے ہیں۔ یہ پیغام تھا انسان کو کہ موت کو عدم محض نہ جانے۔ یہ حیات کی طرح کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ تاریخ کے صفحات واضح کر رہے ہیں کہ بعض لوگ حیات کا لبادہ اوڑھتے ہیں مگر زندہ نہیں ہوتے، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ یعنی تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ سے حی سے صاحب ایمان مراد لیا ہے اور میّت سے صاحب کفر، کتنے جیتے ہیں مگر جی نہیں رہے ہوتے اور کتنے مرتے ہیں مگر مرے ہوئے نہیں ہوتے۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے

جس نے زندگی و موت کا راز پالیا ہے۔ وہ زندہ ہی زندہ ہے کیا مزارات پر بے پایاں ہجوم صاحب قبر کی زندگی کا اعلان نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اس راز حیات و ممات سے آگاہ تھے۔ اس لئے جب جون 1974ء کو نقاہت ڈیرے ڈالنے لگی تو حوصلہ نہ ہارا۔ احباب و صاحبزادگان کے اصرار پر راولپنڈی منتقل کر دیئے گئے۔ یہ سفر علاج لواحقین کے اصرار پر ہوا۔ پہلے سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال مری روڈ میں زیر علاج رہے پھر ملٹری ہسپتال میں داخل کئے گئے علاج قابل اعتماد ہاتھوں میں تھا مگر ڈاکٹر یا حکیم بیماری کا علاج کرتے ہیں موت کا نہیں۔ لمحہ آخر قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا، صاحبزادگان ہمہ وقت حاضر خدمت تھے مگر جسے جانشین بننا تھا اور مسند خیر کو سنبھالا تھا وہ برطانیہ میں تھے۔ اطلاع دی گئی واپس آئے تو وہ بھی دن رات تیمارداری کا فرض نبھانے لگے۔ بار بار نیم بے ہوشی طاری

ہوجاتی۔ یہ پیغام تھی کہ اب سفرِ آخرت کے دن قریب آرہے ہیں۔

دورانِ مرض اس قدر استقامت دکھائی کہ یہ کسی مردِ حق آگاہ کا ہی منصب تھا معالجوں نے آپریشن تجویز کیا جس میں مصنوعی بے ہوشی بھی لازم تھی۔ جب یہ خبر دی گئی تو درویش خدامست کا فرمانا تھا۔

''جب سے میرے پیر و مرشد حضرت باباجی موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے خلافت سے نوازا ہے اُس وقت سے آج تک نہ تو میری کوئی نماز قضا ہوئی ہے اور نہ میں کبھی بے وضو رہا ہوں۔ آپریشن سے عمر بھر کے ان معمولات میں فرق آئے گا، نمازیں قضا ہوں گی اور وضو سے محروم رہنا پڑے گا اور یہ مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں''۔ 11

مگر جب اپنے قابلِ اعتماد خلف الرشید جناب پیر علاؤالدین صدیقی مدظلہ نے حالات کی نزاکت گوش گزار کی تو بادلِ نخواستہ آپریشن کی اجازت دے دی، آپریشن کامیاب رہا کچھ آرام کا وقفہ آیا مگر چند ماہ بعد مرض کا پھر سے حملہ ہوگیا اور دوبارہ ہسپتال میں داخل کردیئے گئے۔

بیماری کی خبر ہر عقیدت مند کو پہنچ رہی تھی۔ سعادت مندوں کے قافلے دور دور سے ہسپتال آنے لگے۔ حتّٰی کہ اکابرامت بھی عیادت کو آئے، ان میں چورہ شریف کے حضرت غلام نقشبند رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے اور شرقپور شریف کے میاں جمیل احمد مدظلہ کے علاوہ پیر خانے کے مسند نشین حضرت پیر زاہد خاں رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب پیر خانے کے مسند نشین کو نیم باز آنکھوں سے دیکھا تو بہزار دقت اٹھنے کی کوشش کی اور یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

''سنتے تھے کہ کعبہ شریف مقبولانِ الٰہی کی زیارت کو خود آتا ہے آج اپنی

آنکھوں سے یہ منظر بھی دیکھ لیا''۔ 12

بیماری تو ایک بہانہ ہوتی ہے۔ زندگی کا دورانیہ مقرر ہے۔ پروردگارِ عالم جتنی ساعتیں عطا کرتا ہے انہی کا حساب لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی کمرہ امتحان میں بلا مقصد بیٹھنا نہیں چاہتا۔ وقت ختم ہوتے ہیں اُس چوگردے سے بھاگ اٹھتا ہے جہاں آزمایا جارہا ہو۔ اہل معرفت زندگی کو بھی امانت سمجھ کر گزارتے ہیں اور جب اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوجائیں تو واپس جانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ کامیابی کا یقین رکھنے والے تو مسکراتے ہوئے راہی ملک بقا ہوتے ہیں۔ یہی حال خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا آپ کامیاب اور بھرپور زندگی گزار کر حاضر دربار ہونے کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ کسی نے خوب کہا تھا کہ

وَلَدَتْكَ اُمُّكَ ابْنَ آدَمَ بَاكِيًا وَالنَّاسُ حَوْلَكَ يَضْحَكُوْنَ سُرُوْرًا

فَاجْهَدْ لِنَفْسِكَ اَنْ تَكُوْنَ اِذَا بَكَوْا فِيْ يَوْمِ مَوْتِكَ ضَاحِكًا مَسْرُوْرًا

کہ اے ابن آدم تجھے تیری ماں نے جب جنم دیا تھا تو تو رو رہا تھا جبکہ تیرے ارد گرد لوگ خوشی سے ہنس رہے تھے یعنی تیرا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ پس اب اپنے آپ کو اس مشقت سے گزار کہ جب تیری موت کا دن آئے تو یہ سب رو رہے ہوں مگر تو مسرور و مطمئن ہو کر ہنستا ہوا جا رہا ہو۔

حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی فرحان و شادان گروہ کا حصہ تھے کہ چاروں جانب آہوں اور سسکیوں کا کہرام تھا مگر آپ کا وجود مطمئن تھا، اس قدر سکون کہ لمحہ آخر میں بھی شریعت کی پاسداری کا خیال دامنگیر تھا۔ علامہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ

نشانِ مردِ مومن باتو گویم چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ سب کے لبوں پر التجائیں تھیں۔ لمحہ لمحہ شمار ہو رہا تھا، کیا عجیب منظر تھا کہ چہیتی اولاد دم بخود ہو کر چاروں طرف حاضر ہے۔ خلفاء کی بڑی تعداد اللہ شافی اللہ کافی کے زمزمے لبوں پر سجائے مزید لمحات کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ وہ بھی حاضر ہیں جن کی عقیدتوں کا مرکز صاحب فراش ہے اور وہ بھی موجود ہیں جن کے فیضان کی زندہ شہادت سامنے ہے۔ جب محسوس ہو گیا کہ اب سفرِ دوام کا لمحہ آیا ہی چاہتا ہے تو فیصلہ کر لیا گیا کہ اس مقدس روح کو اُن فضاؤں میں منتقل کر دیا جائے جن کی ساری بہار انہیں کے دم قدم سے ہے۔ سواریوں کا انتظام کیا گیا اور وہ مردِ درویش جس کی محنت کا سب ثمر تھا چھ اپریل 1975ء کو اپنے مرکز کی طرف روانہ ہوا۔ آخری سانسیں اُسی سرزمین کا حق تھیں جس کی ہوائیں اطاعت شعاری کی مہکار سے عطر بیز تھیں، چند روز کشمکش میں گزرے، شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ مشتاق آنکھیں سیراب ہو جائیں۔

آخر وہ لمحہ موعود آ گیا 28 ربیع الاول 1395ھ بمطابق 11 اپریل 1975ء کے جمعۃ المبارک کی مبارک ساعتوں میں نیریاں شریف کا موسّس، نیریاں شریف کی خاک کو سرمہ عقیدت بنائے ابدی نیند سو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر ہوا کے دوش پر اڑی اور کشمیر ہی نہیں پورے پاکستان میں یوں پھیلا کہ ہر آنکھ اشک بار ہو گئی۔ مشتاقانِ دید کا ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ تدفین اتوار کی سہ پہر تک موخر کر دی گئی، نمازِ جنازہ مسند نشین موہڑہ شریف پیر خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی تقریباً تین روز جسم منیر زیارت کے لئے موجود رہا بالآخر مقررہ جگہ جو اتفاق سے طے پا چکی تھی میں

سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اور غزنی کا ایک تاجر نیک نفسی، خوش خصالی اور تقویٰ آشنائی کے پرچم لہراتا ہوا مرشد غزنوی کے رتبہ عالی پر فائز ہو گیا۔ مزار زیارت گاہ بنا اور غیر معروف پہاڑی کا یوں جھومر بنا کر اُسے شہرتِ عام کا حامل قرار دیا گیا۔ اب بھی بقائے دوام کا سہرا وہاں سجا ہے اور زائرین کا اژدہام مسلسل جاری ہے۔

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی مستعار حیات کا ہر ثانیہ آنے والوں کو زندگی کے رموز سمجھا رہا ہے کہ کہاں غزنی کا ایک مسافر اور کہاں دائمی قرار کا نشان، یہ پیغام ہے ہر آنے والے کے لئے کہ زندگی کی سوغات صالحیت کی خیرات ہے آؤ اور اس مردِ قلندر سے زندہ رہنے کا سلیقہ پاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہر زائر کو اسی نیک روش پر چلنے کی توفیق عنائت فرمائے آمین۔

خوش قسمتی یہ ہے کہ نیریاں شریف ایک مردِ باصفا کی ہی حکایت دلپذیر نہیں، نشر خیر کا ایک تسلسل ہے جواب بھی پیر علاؤالدین صدیقی مدظلہ کی قیادت میں سفرِ سعادت پر رواں دواں ہے۔

حوالہ جات

1 حیات محی الدین غزنوی ص:201

2 حیات محی الدین غزنوی ص:194

3 حوالہ سابق ص:195

4 حوالہ مذکورہ ص:197

5 حوالہ مذکورہ ص:204

6 حیات محی الدین غزنوی ص:271

7 حوالہ مذکورہ ص:292

8 حوالہ مذکورہ ص:285

9 حوالہ مذکورہ ص:302

10 حوالہ مذکورہ ص:235

11 حوالہ مذکورہ ص:294

12 حوالہ مذکورہ ص:296

41۔حضرت پیر محمد علاؤالدین صدیقی مدّظلہ العالی

سلسلہ نقشبندیہ کے تذکار کا خاتمہ ہم اُس وجود پر کر رہے ہیں جو اس تحریر کا محرک بنا تھا۔ پیر محمد علاؤالدین صدیقی مدظلہ کی ذات سے اس دور کے متوسلین کو وہ اعتماد حاصل ہوتا ہے جو اسلاف کے کارناموں پر یقین کا باعث ہے۔ اگر اس دورِ انحطاط میں ہی ایسے راہنما موجود ہیں تو گذشتہ صدیوں کے اکابر کیسے ہوں گے؟ اسلاف کے تذکروں سے بعد میں آنے والے اپنا بھرم قائم رکھتے ہیں اور اپنی نیک نامی سے اُن کے وقار کی دلیل بنتے ہیں۔ یہی نیک نفسی اور خوش معاملگی کا تسلسل ہوتا ہے۔ پیر صاحب کو سلسلہ تصوف کی عظمت اپنے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی۔ گلستانِ روحانیت میں یہ ایک نوزائیدہ شاخ ہے کہ اس کی جڑیں ماضی بعید تک پھیلی ہوئی نہیں ہیں۔ بلاشبہ گھرانہ حسنات کی کفالت کرتا آ رہا تھا اور دینی اقدار کی پرورش اس خاندان کا امتیاز رہا تھا مگر مسند نشینی کی میراث نہ تھی ایک مردِ خوش اطوار نے ایک تعلق کو اپنی شناخت بنایا اور

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کا ثبات حاصل کیا، تاریخ تصوف میں ایسی کم مثالیں ملتی ہیں کہ پہلا قدم ہی عظمت نشان بن گیا ہو اور یہ بھی کہ ایسی عظمت کا اعتراف اس تیزی سے ہوا ہو، اس پر یہ گھرانہ جتنا بھی ناز کرے کم ہے مگر اس کا دوام اس عظمت کی حفاظت میں پنہاں ہے، حالات کی چال گواہی دے رہی ہے کہ یہ سفرِ خیر یقیناً سفر نصیب ہوگا۔

حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی محنت آپ کی حیات ظاہرہ میں ہی ثمر بار ہوگئی تھی، نیریاں شریف کے جنگل نما خطے میں جو شجر حسنات حضرت بابا جی محمد قاسم موہڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے کاشت کیا تھا وہ تقدس میں بوئے جانے والے شجر نخیل کی طرح تاریخ کا جزو بن کر ہی زندہ نہیں رہا بلکہ اپنی لہلہاتی شاخوں کے حوالے سے اب بھی پر بہار ہے۔ تاریخ کے سینے میں رفعتوں کے کئی ایسے نشان دفن ہیں کہ صرف یادگار ہیں۔ کھلے اور مرجھا گئے صرف یاد چھوڑ گئے، عظمتوں کی کاشت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غنچہ آسا ہی ہوں کہ بکھر جائیں، خوش قسمت ہوتا ہے وہ سلسلہ جو پوری آب و تاب سے پھیلے اور پھیلتا ہی جائے۔ نیریاں شریف کی شاخ تصوف نے پر بہار رہنے کا حوصلہ پالیا ہے، خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کو تابدار بنایا اپنی نسل میں بھی سدا بہار رہنے کا جوہر ودیعت کر دیا، نیکی کبھی بھی تنہا نہیں رہتی اس کی مہکار گردونواح کو عطر بیز ضرور کرتی ہے نیریاں شریف کے شجر حسنات کے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ پیر علاؤالدین صدیقی مدظلہ کے کندھے پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی، سب کی نظریں ایک وجود پر تھیں کہ اس خاندان کی روحانی وسعت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ معتقدین و متوسلین کو اک سلک جواہر میں پروئے رکھنا بھی آپ کی ذمہ داری تھی پیر صاحب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذمہ داری نبھانے کا حوصلہ بھی دیا تھا اور نشر خیر کا سلیقہ بھی عطا کیا تھا۔ یہ کوئی تاریخ کے دھندلکوں میں اٹی ہوئی داستان نہیں۔ لاکھوں انسانوں کا مشاہدہ ہے کہ حضرت پیر صاحب نے کس ہوش مندی اور کس عزم کے ساتھ شجر غزنوی کی آبیاری کی ہے کہ آج یہ سلسلہ تصوف نقشبندیت کا ایک معتبر حوالہ ہے جہاں مجددی ایقان پرورش پاتا ہے۔

حضرت پیر صاحب کو قدرت نے نیریاں شریف سے ایسی نسبت عطا کی کہ 1938ء میں جب آپ پیدا ہوئے تو یہ خاندان نیریاں شریف میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ والدہ ماجدہ کشمیر سے ہی تعلق رکھتی تھیں اور یہ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی اہلیہ تھیں، آپ صاحبزادگان میں سے دوسرے تھے کہ پیر نظام الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے بیٹے تھے۔ عمروں کا زیادہ تفاوت نہ تھا اس لئے ابتدائی مشاغل میں ہم عناں رہے، تعلیم کا سلسلہ بھی اکٹھے ہی شروع کیا اور مقامی سکول سے ہی ابتداء کی، حیرت ہے کہ یہ افغان مہاجر خاندان تعلیم کے بارے میں کس قدر محتاط تھا کہ موجود ذرائع کی کم دستیابی کے باوجود سلسلہ تعلیم موخر نہ ہونے دیا۔ حضرت خواجہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ ذوق ابتداء سے ہی ودیعت ہوا تھا۔ حالات کی ناسازگاری کے باوجود مروجہ تعلیم کا ادارہ قائم کر دیا جہاں قرب و جوار کے طلبہ جو علمی پیش رفت سے آشنا نہ تھے جوق در جوق آنے لگے۔ یوں اشاعتِ علم کا سلسلہ جاری ہوگیا، اس گھرانے کا مزاج دنیاوی تعلیم کا زیادہ شائق نہ تھا۔ نوشت و خواند کی منزل کا ہدف دینی تعلیم ہی تھا۔ اس لئے جونہی حرف شناسی کا جوہر پیدا ہوگیا اور ضروری اسباق پڑھ لئے تو مقصود کی جانب رُخ ہوگیا۔

تعلیم:

دینی درسیات میں مہارت کے لئے جامعہ رحمانیہ ہری پور کے اساتذہ مولانا فضل الرحمن حافظ محمد یوسف اور مولانا غلام محمود صاحبان سے استفادہ کا فیصلہ کر لیا گیا کہ ان اساتذہ کی شہرت تھی اور دور دور سے تلامذہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے

قرآن فہمی کے جذبے نے وزیر آباد کا سفر کرایا جہاں ابو الحقائق مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی مسند علم بچھی تھی اور قرآنی علوم کے متلاشی طالب علم دور دور سے وزیر آباد کا رُخ کر رہے تھے پیر صاحب کا تو مشن ہی یہی تھا کہ ہر اُس در پر دستک دی جائے جہاں کوئی فیض رساں صاحب علم موجود ہو، چنانچہ وزیر آباد آگئے اور دورہ قرآن میں شریک ہوگئے۔ باخبر سامع پیر صاحب کے ارشادات میں بعض اوقات مولانا ہزاروی مرحوم کی آواز سنتا ہے۔ وہی بااعتماد لہجہ، وہی استخراج مسائل کی سطوت اور وہی سامعین کو اپنی گرفت میں لے لینے کی قوت، وزیر آباد میں ترجمہ قرآن پڑھا کہ وہاں لفظ لفظ پر عقیدت کا پہرہ تھا اور حرف حرف کی حرمت کا احساس تھا۔ تفسیری نکات سے بہرہ ور ہوئے کہ کس طرح قرآن مجید کے حرف حرف سے عظمتِ رسالت ہویدا ہوتی ہے۔ یہ طرز استدلال آج بھی پیر صاحب کے ہر جملے سے عیاں ہے۔

قرآن مجید کے اسرار سے فیض یافتہ یہ طالب علم لائل پور کا راہی ہوا کہ وہاں علم کو وقار عطا ہوتا تھا۔ قرآن اگر الٰہی فرامین کا مجموعہ ہے تو حدیث ان فرامین کی عملی تطبیق کی حکایت ہے۔ حدیث کے مطالعہ کے بغیر قرآن مجید کی علمی تعبیر سامنے نہیں آتی اور قرآن مجید ایک ضابطہ حیات کی صورت نہیں لیتا۔ لائل پور میں درس حدیث کا منصب حضرت شیخ الحدیث مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا۔ حضرت شیخ الحدیث کا طرز تدریس حروف والفاظ سے لغوی و معجمی آشنائی پر ہی کفایت نہ کرتا تھا بلکہ ہر ہر کلمہ کے ورے ذاتِ رسالت کی موجودگی کا احساس دلاتا تھا یہاں حدیث پڑھائی ہی نہ جاتی تھی۔ اس کا وجدان عطا کیا جاتا تھا۔ پیر صاحب اس وجدان کے متلاشی تھے اس

لئے لائل پور (اب فیصل آباد) آگئے۔ مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ یہ استفادہ دراصل حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی حاضری کی تمہید تھی مولانا حافظ احسان الحق رحمۃ اللہ علیہ مولانا سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ سے کسبِ فیض کر ہی رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حلقہ درس میں بلالیا حالانکہ تیاری کے مراحل مکمل طور پر طے نہ ہوئے تھے۔ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی کیمیا گر نظر نے بھانپ لیا تھا کہ اس طالب علم کو مزید تیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تیز رو طالب علم اب اختتامی تربیت کا مستحق ہو چکا ہے۔

جامعہ رضویہ فیصل آباد کے علمی ماحول نے مشکل اسباق اس تیزی سے ازبر کرائے کہ دورہ حدیث سے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھل جانے کا ذوق فراواں ہوگیا، حضرت پیر صاحب کا منتہی علم، قرب کی منزلوں سے آشنا ہوتا جارہا تھا کہ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا علمی فیضان احاطہ کئے ہوئے تھا۔ دارس و مدرّس مطمئن تھے کہ منزلِ مراد قریب آتی جارہی ہے۔ آخر دستارِ فضیلت سجادی گئی۔ یہ دستار رسمی نہ تھی۔ حقیقتاً دستارِ عظمت تھی۔ واپس لوٹے تو وہ نہیں تھے جو جامعہ رضویہ میں آئے تھے ایک بدلی ہوئی شخصیت ایک مکمل نیا وجود جس کے دامن میں علم کی خیرات بھی تھی اور حسنات کی سوغات بھی۔

تکمیل علم کے بعد نیریاں شریف تشریف لائے، والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ جو رفعتِ علم چاہتے تھے حاصل ہو چکی تھی، ایک ایسا جوان سامنے تھا جو ترویج خیر کا عزم لئے ہوئے تھا اور اس عزم میں صلاحیت بھی نمایاں تھی حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق کہ خلافت کے لئے تین شرائط ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے

ہر جانب صلاحیتوں کی جولانی دیکھی تو خلافت سے نواز دیا۔ یہ مستقبل کے کارہائے
نمایاں کی تمہید تھی۔ پیر صاحب نے خلافت کو اعزاز سے زیادہ ذمہ داری سمجھا اور
ہمہ تن اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کمربستہ ہو گئے، نیریاں شریف کے باسیوں
پر ہی نہیں، کشمیر و پاکستان کے اطراف میں خلافت کا یہ فیضان پھیلتا چلا گیا حتّٰی کہ برصغیر
کے باہر ممالک غیر میں بھی اس کے اثرات نظر آنے لگے، یورپ کا سفر پیر صاحب
کا ہمیشہ سے معمول رہا کہ مشکل مراحل سے گزرنا آپ کو زیادہ پسند تھا اور یہ کہ یورپ
کا نا آشنا ماحول متقاضی تھا کہ وہاں دینِ حق کی روشنی عام کی جائے، یہ یقیناً دشوار گزار
مرحلہ تھا کہ مادی آسودگیوں میں غرقاب انسان روحانی عظمتوں سے بے بہرہ ہوتے
ہیں مگر یہی تو وہ کام ہے کہ مردانِ خیر کو کرنا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ آیا کہ۔

مرد باید کہ ہراساں نہ شود

پیر صاحب اسی عزم بلند کے ساتھ ہر مشکل سے ٹکرانے کا حوصلہ پا کر
میدان تبلیغ میں اُترے۔ کشمیر کی وادی کو تو مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپ نے
اسی کو مرکز بنایا اور اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 1966ء کا سال وہ انقلابی دورانیہ ہے کہ آپ
لندن کی سرزمین کو اپنی جولاں گاہ بنانے کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ برطانیہ
میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بس چکی تھی۔ حصول رزق کے متعدد ذرائع دریافت
ہو چکے تھے۔ مالی معاملات سے ذرا فراغت ہوئی تو عاقبت کی فکر بھی ہونے لگی۔
مسجدیں تعمیر ہونے لگیں، دینی اجتماع منعقد ہونے لگے، تبلیغی ضرورت کے تحت
مبلغین وواعظین کی ایک کثیر تعداد برطانیہ کو مسکن بنانے لگی مگر

ظرف کی تشنہ لبی محتاجِ ساقی تھی ابھی

یہی احتیاج پیر صدیقی مدظلہ کو برطانیہ لے آئی۔ راہنمائی کا سلیقہ حاصل تھا
اور حالات کے تقاضوں سے بھی باخبری تھی بہت جلد پذیرائی ملی، شہر شہر اجتماع
ہونے لگے اور ایک مربوط سلسلہ رشد قائم ہو گیا ایک مضبوط حلقہ اس مشن کی ترویج میں
ہم راہ ہوا اور برطانیہ کے قریہ قریہ سے خوش آمدی دعوت نامے ملنے لگے۔ نیریاں شریف
کا سلسلہ مائل بہ عروج تھا کہ خبر ملی حضرت خواجہ غلام محی الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت
بہت ناساز ہے اور اضمحلال بڑی تیزی سے جسم میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ جب
اطلاعات تشویش ناک حدوں کو چھونے لگیں تو آپ نے واپس آنے کا فیصلہ
کر لیا۔ اگست 1974ء کو نیریاں شریف آ گئے۔ والد گرامی کی ناسازی طبع اندوہناک
ہوتی جا رہی تھی چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا کہ راولپنڈی لے جایا جائے اور ملٹری یا سول
ہسپتال میں علاج کرایا جائے۔ یہ سب اہتمام پیر صاحب کی نگرانی میں ہوا۔ ملٹری
ہسپتال میں جتنے روز بھی قیام رہا آپ اپنے والد گرامی اور مرشد کریم کے پہلو
میں رہے مگر تقدیر کا فیصلہ نافذ ہو چکا تھا۔ تقریباً چھ سات ماہ کی کشمکش کے بعد حضرت
قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کی روح آسمان کی بلندیوں کی جانب پرواز کر گئی
یہ 11 اپریل 1975 دوپہر کا سماں تھا کہ نیریاں شریف کا راہنمائے اول اپنا مشن مکمل
کر کے تہہ خاک آسودہ ہو گیا۔

حضرت پیر صاحب کو خلافت تو مل چکی تھی اب مسند نشینی کا مرحلہ تھا سات
برادران تھے اور سات ہی چچا زاد اس طویل کہکشاں سے کسی ایک کو یہ منصب سنبھالنا
تھا۔ حالات تو فیصلہ دے چکے تھے اب صرف رسم باقی تھی برادران کی نظر کا مرکز بھی
ایک تھا اور عم محترم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بھی یہ تھا کہ پیر صدیقی مدظلہ اس مسند نشینی کے حقدار ہیں

چنانچہ اتفاق واتحاد سے آپ کو مسند آرائے نیریاں شریف مقرر کر دیا گیا اس طرح ایک خانقاہ کی سربراہی بھی آپ کو ودیعت ہوئی کہ مسند کے قیام کے مقاصد وفرائض آپ پہلے سے ہی ادا کر رہے تھے۔

مسند نشینی:

حضرت پیر علاؤالدین صدیقی مدظلہ 1975ء سے نیریاں شریف کے حلقہ احباب کے صدر نشین بنے حیرت ہے کہ آپ کا تبلیغی ولولہ پہلے سے بھی فزوں تر ہوا حالانکہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ مسند نشینی فعالیت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ عقیدتوں کا ہالہ ست رو بنا دیتا ہے اور سہولتوں کی فراہمی آرام طلبی کو دعوت دیتی ہے مگر پیر صدیقی مدظلہ کے ہاں فعالیت پر جوبن آیا اور حرکت زیادہ پرخروش ہوئی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمہ جہت عمل پسندی کو فروغ ملا اور کام کرنے کی دسترس مزید جوان ہوئی، نیریاں شریف کو ظاہری طور پر بھی ایک مسند بنا دیا گیا اور روحانی برکات کی بھی فراوانی ہوئی۔ حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کا دیدہ زیب مزار زائرین کی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار پایا تو سجدہ گذاری کا ذوق مسجد کی زیبائی اور وسعت نے اور توانا کر دیا۔ اب نیریاں شریف ایک مرکز تھا جہاں سے عشاق کے قافلے پارسائی کے ہالے میں گزرتے اور دور ونزدیک کو ذوقِ بندگی عطا کرتے۔ چک بیلی خان جو ابتداء ہی سے شوقِ عبادت کا نشان تھا شب زندہ وار وجود کا روپ دھار گیا۔ اقبال نگر کا اقبال جاگا کہ

جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں

اقبال نگر سجدہ گذاروں کا ایک مضبوط پڑاؤ بن کر اب گرد ونواح کو مہکا رہا ہے۔ لالہ موسیٰ کے عقیدت مند بھی قرضِ محبت ادا کرنے میں کسی سے پیچھے

نہیں۔ گجرات، گوجرانوالہ اور لاہور نقشبندیت کے روشن نشان قرار پائے فیصل آباد تو مرکزی مقام بنا کہ یہاں ایک وسیع اور عظیم مسجد کی تعمیر آخری مراحل میں ہے۔ طلبہ وطالبات کے لئے ایک لائق فخر تعلیمی ادارہ زیر تعمیر ہے۔ ادارے کی وسعت دیکھ کر نقشبندیت کے دامنِ کرم کا پھیلاؤ یاد آتا ہے۔

یورپ میں پیر صاحب کے عملی اقدامات بہت بارآور ہو رہے ہیں پیر صاحب نے برمنگھم کے شہر کو اپنی مساعی کا مرکز بنایا۔ برطانیہ اور پھر برمنگھم کے مہنگے شہر میں 8 کنال رقبہ اور بھی مرکزی علاقے میں ایک کارِ دارد ہے جہاں ایک خوبصورت مسجد کی تعمیر پیر صاحب کی حسن جمالیات کی شہادت دیتی ہے۔ اتنا بڑا ہال کہ ہزاروں نمازی سجدہ ریز ہو سکیں پھر چاروں طرف دیدہ زیب رہائش گاہیں جو طلبہ واساتذہ کے لئے آرام گاہیں ہیں ایک بہت بڑے علمی مرکز کا نقشہ پیش کرتی ہیں، راقم الحروف کو اس ادارے میں چند روز قیام کا موقعہ میسر آیا تھا، ایک علمی فضا ہے جو چاروں طرف جلوہ فگن ہے۔ یہاں پیر صاحب کی زیر نگرانی تبلیغی وتدریسی اجتماع ہوتے ہیں جن میں حاضرین وسامعین کی تعداد برصغیر پاک وہند کے کسی کامیاب اجتماع سے کم نہیں ہوتی مزید یہ کہ حاضرین کا شوق وولولہ دیدنی ہوتا ہے وہاں حاضر ہو کر پیر صاحب کی مساعی کی کامیابی نظر نواز ہوتی ہے۔ بلاشبہ دیارِ غیر کو مانوسیت کی یہ فضا مہیا کرنا پیر صاحب کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ صرف برمنگھم پر ہی منحصر نہیں پورے برطانیہ میں علمی جمال اور صوفیانہ جلال کا روح پرور منظر ہر کہیں دکھائی دیتا ہے۔ تحریر کنندہ ایسے روحانی اجتماعات کا چشم دید گواہ ہے۔ سبحان اللہ

ایں کار از تو آید ومرداں چنیں کنند

برطانیہ کے علاوہ پیر صاحب دیگر یورپی ممالک میں بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ یورپ کا تفصیلی دورہ بھی حال ہی کی بات ہے۔ ناروے خصوصی طور پر دو مرتبہ جا چکے ہیں۔ کینڈا کا بھی دو دفعہ دورہ کر چکے ہیں امریکہ بھی دوبار گئے ہیں۔ یہ سب دورے تبلیغی تھے۔ ہر جگہ سے اللہ ہو کی صدائیں بلند ہوئی ہیں۔ ان دوروں کے اثرات کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ سال گذشتہ یورپ کے عمومی دورے کے دوران میں تقریباً بیس ہزار یورپین باشندے اور آباد کار لوگ حلقہ ارادت میں آئے ہیں پاکیزہ نفسی کی ایسی بہار آئی ہے جو بتدریج سارے یورپی ممالک کو محیط ہوتی جا رہی ہے۔

حال ہی میں پیر صاحب کا عزم جواں تعلیم بنات کی طرف متوجہ ہوا ہے دو کالج برائے خواتین پہلی پیش رفت ہے، عمارات خریدی گئی ہیں اور ماہر اساتذہ تعینات کئے گئے ہیں اور برمنگھم میں اور مانچسٹر کے قریب برنڈلے میں خواتین کے تدریسی پروگرام کا آغاز ہو چکا ہے، یہ تعجب کی بات ہے کہ برطانیہ جیسے تعلیم یافتہ ماحول میں تعلیم وتدریس کے ساتھ تہذیب نفس کا کفیل ادارہ پورے برطانیہ کی توجہ لے رہا ہے پر خلوص کاوش یوں ہی بار آور ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ خلوص ایک ایسا جوہر پارہ ہے جو اپنی روشنی سے منور رہتا ہے اُسے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نفاذِ اسلام کی کوشش:

پیر صاحب صرف مسند نشین ہی نہیں نہایت متحرک مبلغ اسلام بھی ہیں، آپ کے شب و روز ترویج اسلام اور نفاذ اسلام کی جدوجہد میں بسر ہوتے ہیں اور جب کبھی کسی جانب سے نفاذِ اسلام کی تحریک اٹھتی ہے آپ اپنے منصب اور مسند کو بھول کر پیچھے چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مشن کے ساتھ کس قدر اخلاص ہے وگرنہ بڑی سے بڑی تحریکیں بھی حصول قیادت کے افتراق کا شکار ہو کر دم

توڑ دیتی ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ کشمیر کی تاریخ کا حصہ ہے۔ دعویٰ کیا گیا کہ حکومتی سطح پر اسلام کے نفاذ کی کاوش کرنا ہے۔ کشمیر کے اکابر سیاستدان سردار عبدالقیوم خان اور سردار سکندر حیات خاں بھی اس تحریک کے دمساز تھے۔ نیریاں شریف میں عظیم اجتماعات ہوئے۔ سردار صاحبان خود تشریف لائے، تحریک کے مقاصد بیان ہوئے تو اعانت کا اعلان کیا کہا یہ گیا کہ جب وہ خود بھی اسلام کی حاکمیت کے قائل ہیں تو انکار کیسا ایک سازگار ماحول تشکیل پا گیا اور نفاذِ اسلام کی منزل قریب نظر آنے لگی، صادق الیقین مسلمان خوش تھے اور یوم نجات کا انتظار کرنے لگے تھے مگر یہ بھرپور تحریک بھی کامیاب نہ ہو سکی کہ پر خلوص اظہار ہمیشہ دل کی آواز نہیں ہوتا اور جذبے ہمیشہ صداقت شعار نہیں ہوتے۔ پیر صاحب کی شب و روز کی محنت یوں ضائع ہوئی تو صدمہ ہوا کہ تمام جدوجہد پادر ہوا ثابت ہوئی مگر یہ ناکامی مایوسی میں نہ ڈھلی، کوشش مسلسل جاری رہی۔ آل پاکستان سنی کانفرنسوں میں شرکت اسی خواب کی تعبیر کے لئے تھی۔ سچ ہے ارادے باندھنا ہی انسان کے بس میں ہے کامیابیاں تو قدرت کا انعام ہوتی ہیں۔

برداران کی تربیت:

پیر صاحب پر مسند کی ذمہ داری کے ساتھ برادران کی راہنمائی اور تربیت کا بوجھ بھی تھا، برادران میں سے زیادہ ابھی زیر تعلیم تھے۔ اُن کی تعلیم کا انتظام کر کے سرپرستی کا حق ادا کیا گیا، پھر صرف درسی تعلیم پر ہی اکتفا نہ کیا، تربیت کے مراحل میں بھی راہنمائی کی، اخلاقی راہبری اس دور کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ مسلم تہذیب وثقافت سے آگہی عصر حاضر کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ صوفیاء کا تو کردار ہی تہذیب اسلامی کے نفاذ سے واضح ہوتا ہے۔ تہذیب دراصل اُن غیر ضروری شاخوں کے کاٹنے کا نام

ہے جو ابھرتے ہوئے درخت میں اُگ آتی ہیں اور شجر کو پربہار نہیں رہنے دیتیں اسی
طرح انسان کے اعمال وکردار سے وہ غیر مناسب لاحقے جدا کرنا ایک ماہر نگران کا کام
ہوتا ہے۔ اسے ہی تہذیب کہتے ہیں ،ثقافت تنوں کو سیدھا کرنے کا نام ہے کہ
غیر مناسب جھکاؤ کسی اور کی نشوونما میں حائل نہ ہوجائے۔تہذیب اگر وجود کی راستی کی
حفاظت ہے تو ثقافت معاشرے کے نامناسب دباؤ کا سدباب کرنے کو کہتے ہیں۔
صوفیاء اپنے معتقدین کے لئے تہذیب نفس کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور معاشرتی
حسن کے قیام کا بھی۔پیر صاحب کے ذمے یہ دوہرا فریضہ تھا جو آپ نے اس احسن طریق
سے نبھایا کہ آج کردار کی پکی ہوئی فصل تربیت کے حسن کی گواہ ہے،سب برادران
نقشبندیت کے فیضان کے مظہر ہیں اور دین حق کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

محی الدین اسلامی یونیورسٹی:

پیر صاحب کا ذہنی جھکاؤ شروع ہی سے اشاعت علم وحکمت کی طرف تھا اس
لئے آپ جہاں موقعہ ملتا تدریسی وتربیتی کام کا آغاز کردیتے۔یوں بہت سے ابتدائی
ادارے معرضِ وجود میں آئے مگر یہ ادارے پیر صاحب کے عزم بلند کی تسلی کے لئے
کافی نہ تھے، خیالات کی گردش کسی بڑے منصوبے کی تحریک دے رہی تھی ،
دل ودماغ کا مجموعی فیصلہ کسی لائق التفات تعلیمی ادارے کا قیام تھا،شب وروز یہی
خیالات اُفق ذہن کا احاطہ کئے رہے حتّٰی کہ خوابوں میں بھی یہی خیالات امڈتے رہے۔
کہا جاتا ہے کہ خواب یا تو نامکمل خواہشات کی تکمیل کا اشارہ ہوتے ہیں یا آنے والے
واقعات کا پیشگی عکس ہوتے ہیں ، پیر صاحب کے ہاں دونوں صورتیں فعّال
تھیں۔نا تمام خواہش اتمام کی راہیں تلاش کررہی تھی اور مستقبل کے ارادے خوابوں

میں جگمگانے لگے تھے۔ 1980 کا سال تھا کہ یہ خواہش منہ زور ہوگئی تھی۔فرماتے
ہیں کہ ایک خواب دیکھا کہ دربار کے سامنے غیر ہموار پہاڑی پر ایک عمارت ابھرتی
ہوئی محسوس ہوئی،عمارت دیدہ زیب بھی تھی اور پرشکوہ بھی بس پھر یقین ہوگیا کہ خواب
اپنی تعبیر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زمین کا جائزہ لیا۔وسائل پر نظر ڈالی،احباب سے
مشورہ کیا اور چند سالوں کی اندرونی تب وتاب ایک یقین میں ڈھل گئی۔

1988ء میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جو
پیر صاحب کے ذہنی نقشے کے مطابق تھی۔اب کسی کی راہنمائی بھی درکار نہ تھی،خود ہی
نقشہ نویس تھے خود ہی ماہر تعمیرات ،خیال صورت مجسم میں ڈھلنے لگا اور دیکھتے ہی
دیکھتے پہاڑ کی چوٹی ایک خوبصورت عمارت کا روپ لے گئی، خیال چونکہ حدود آشنا
نہیں ہوتے اس لئے اُن کی تکمیل بھی بے کنار تھی،منزل پہ منزل تعمیر ہوتی گئی ،کشادہ
کمرے ،پربہار برآمدے یوں تعمیر ہوگئے کہ جیسے کسی ماہر تعمیرات کی نگرانی حاصل
رہی ہو۔سچی بات یہ ہے کہ صاحب خیال ہی بہتر صورت گر ہوتا ہے۔عمارت تیار
ہوگئی جو کشمیر کے بیشتر تعلیمی اداروں سے منفرد ہے،اس کی دیدہ زیبی ہی نشرِ علم کا پیغام
ہے۔یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ جس نے ایسے اداروں میں تعلیم نہ پائی ہو، جو دینی
مدارس کے فرش پر حصول علم کا جویا رہا ہو اُس کے وجدان میں ایک جدید یونیورسٹی کے
خدوخال کیسے نمایاں ہوئے۔یونیورسٹی بھی ایسی جو طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کی بھی
کفالت کرے اور رہائش کا وسیلہ بھی ہو۔

علم کدہ تو تیار ہوگیا اب مرحلہ اس کو آباد کرنے کا تھا۔پیر صاحب نے اپنی
مسندی عظمت کو اس تلاش میں حائل نہیں ہونے دیا۔ ہر اُس صاحب علم کے ہاں

گئے، تعاون وراہنمائی کی اپیل کی، یہ بھی اعتراف کیا کہ آپ ایسے اداروں کے انتظام وانصرام سے مانوس نہیں ہیں۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کی بدقسمتی ہے کہ فیصلے ماضی کے تجربات کے مطابق کئے جاتے ہیں راہیں تلاش کرنے کی ہمیں عادت نہیں، احباب نے خواہش کے اظہار کو سنا اور ناممکن قرار دے کر رد کر دیا۔ کسی نے نرسری سکول بنانے کا مشورہ دیا تو کسی نے زیادہ سے زیادہ مڈل سکول کی تاسیس کی حوصلہ افزائی کی، پیر صاحب جب بھی اس عمارت کو یونیورسٹی کہتے احباب مسکرانے لگتے اور خام خیال تصور کرتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عزم مصمم خارہ شگاف ہوتا ہے پیر صاحب کے پیش نظر یہ ارشاد ربانی تھا کہ

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ۔ (آل عمران 159)

”جب عزم کر لو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو“۔

اسی سلسلے میں راقم الحروف سے ملاقات ہوئی اور تذکرہ ہوا، میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ نیک ارادوں کے آگے بند نہیں باندھنے چاہییں، نیکی ایک قوت ہے وہ خود راستہ بنا لیتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ 1998ء میں مجھے یہ خدمت سونپی گئی۔ پیر صاحب کے جواں جذبے پر رحمت کا سایہ تھا، دو سال کی جدوجہد کا نتیجہ محی الدین اسلامی یونیورسٹی نیریاں شریف کی صورت میں سب کے لئے حیرت کا باعث بنی، اب تو ناممکن کہنے والے بھی دم بخود تھے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعمیر کے لئے محنت سے کئی گنا زیادہ عمل کے دوام کو حاصل ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ یہ کار خیر مزید وسعتوں کا سبب بنے۔

محی الدین اسلامی یونیورسٹی کی راہ میں متعدد موانعات تھے، دور دراز علاقہ، سربلند پہاڑی آنے جانے کی مشکلات، اساتذہ کی فراہمی کی مشکل مگر ہمت جواں ہو تو

مشکلات راہ نہیں کاٹتیں، محکمانہ منظوری اور خاص طور پر پارلیمنٹ کا تعاون اس قدر دشوار ہوتا ہے کہ کئی کئی سال اس تمہیدی کاوش پر لگ جاتے ہیں مگر یہاں تو سارے دستور ہی بدل گئے، طلبہ کی ایک بڑی تعداد دور دراز کے علاقوں سے حصول علم کے لئے حاضر ہو گئی، اساتذہ بھی مل گئے اور یونیورسٹی پوری آب و تاب کے ساتھ دیگر یونیورسٹیوں کی صف میں شامل ہو گئی۔

محی الدین میڈیکل کالج میر پور:

یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی پیر صاحب کا فعال ذہن کسی اور کارنامے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ذہنی آسودگی اور تربیتی استحکام کے ساتھ توانا جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے میڈیکل کالج قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا، یہ مرحلہ دشوار تھا کہ اس کے لئے ایسی جگہ درکار تھی جو آمد و رفت کے لئے زیادہ پیچیدہ نہ ہو، میر پور ایک جدید شہر ہے وہاں کی آبادی کا تعلق برطانیہ سے نہایت گہرا ہے اس لئے علمی پیش رفت اور خصوصاً جدید تعلیم کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ میر پور سے متصل زمین خریدی گئی جو میڈیکل کالج کی تمام ضرورتوں کی کفالت کر سکے، تعمیراتی نقشوں پر وقت ضائع نہ کیا گیا۔ دو چار کالجوں کا جائزہ لیا گیا۔ وادی کشمیر میڈیکل کالج سے خالی تھی اس لئے پنجاب کے میڈیکل اداروں سے راہنمائی لی گئی اور ایک یادگار رات سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ عمارت کی تعمیر شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دیدہ زیب عمارت تیار ہو گئی جو جملہ ضرورتوں کے لئے کفالت کرتی ہے، اساتذہ کی دستیابی مشکل کام تھا مگر معاوضوں کی دلکشی نے یہ مرحلہ آسان کر دیا، مقصود مالی مفادات نہ تھے، تعلیمی سہولت تھی اس لئے ہر مرحلہ آسان ہوتا گیا۔ الحمد للہ داخلے ہو چکے پی۔ایم۔ڈی۔سی کی

منظوری حاصل ہوگئی اور تدریسی عمل کا اجراء ہوگیا۔ یہ ایک اور کارنامہ تھا جو پیر صاحب کے مستحکم ارادے سے عملی شکل لے چکا اور کامیابی سے رواں دواں ہے۔

النور ٹیلی ویژن:

عصرِ جدید کے تقاضے متنوع پیش رفت کا مطالبہ کرتے ہیں، تبلیغی مساعی جدید الیکٹرونک آلات کی مدد سے دو آتشہ ہوجاتی ہے اور خیر کا پیغام لمحوں میں جغرافیائی حد بندیاں عبور کر لیتا ہے۔ ٹیلی ویژن آج کے دور کا مضبوط میڈیا ہے جس کی آواز بیک وقت پوری دنیا کو محیط ہوجاتی ہے۔ پیر صاحب کا ہمہ متحرک ذہن ہر دستیاب ذریعہ کو نشرِ حسنات کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے اس لئے اس تجویز کو پذیرائی حاصل ہوئی کہ محی الدین ٹرسٹ کا ایک ٹیلی ویژن چینل ہونا چاہیے، تجویز ارادے میں ڈھلی اور حکومتی اداروں کو متوجہ کر لیا گیا۔ محنت تو ہوئی کہ مرحلہ آسان نہ تھا مگر کامیابی نصیب ہوئی اور النور ٹیلی ویژن کا برمنگھم سے اجراء ہوگیا، النور کی نشریات کا دائرہ پھیلتا چلا گیا اور بہت جلد ایک سو ستر ممالک کے سامعین و ناظرین النور ٹیلی ویژن سے نورِ علم و حکمت حاصل کرنے لگے پروگراموں کا تنوع اس تیزی سے بڑھا کہ ناظرین ہمہ وقت اسی کے ہو رہے، پھر حضرت پیر صاحب کے اپنے ارشادات جن میں امتیازی شان درس مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل رہی یوں گوش گذار اور نظر نواز ہوئے کہ النور کا فیضان گھر گھر اُترنے لگا۔

مثنوی کا درس درحقیقت روحانیت کا پیغام ہے جس نے مشرق و مغرب کو متاثر کیا ہے پیر صاحب کا اندازِ تدریس خلوص کے جذبوں میں ڈھلا ہوا ہے اپنے اور مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی سچی آواز کا پرتو ہے اس لئے بہت مقبول ہے سماعتوں کو بھی جھنجھوڑ

رہا ہے اور دلوں میں بھی انقلاب پیدا کر رہا ہے۔

مضامین و موضوعات کی کثرت کے ساتھ ذریعہ اظہار میں بھی تنوع رہا، عربی، اردو، پشتو، گوجروی، انگریزی، گجراتی، بنگالی کے علاوہ بھی بعض علاقائی زبان اظہار کی کفالت کرنے لگیں ماہر قلمکار، جید علماء دین اور معروف دانش ور، النور کی بہار کے ذمہ دار ہیں، النور کی نشریات نے پیر صاحب سے رابطوں کو ہمہ وقت مضبوط رکھا، دینی معلومات، ثقافتی پیش رفت اور اجتماعی میلانات کو اس خوبصورتی سے صفحہ سکرین پر نمودار ہوتے دیکھ کر ناظرین میں قلبی موانست اور ذہنی ہم آہنگی کی آبیاری ہوئی ہے اور عقیدت مندوں کو اپنے مرشد کے حضور حاضر رہنے کی سعادت ملی ہے، یہ مواصلاتی رابطہ روز بروز مستحکم ہو رہا ہے اور خیر کی مہک عام ہوتی جا رہی ہے۔

نقشبندیت کی اشاعت:

پیر صاحب نقشبندی سلسلے کے مسند نشین ہیں یہ نہ خاندانی جبر کا نتیجہ ہے اور نہ کسی مسند کی حاشیہ برداری کا ثمر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیر صاحب اپنے ذہنی جھکاؤ اور قلبی تعلق کی بنا پر نقشبندی ہیں، معمولاتِ زندگی دیکھ لیجئے یا معاشرتی رویے پرکھ لیجئے، ہر معمول سے اور ہر رویے سے نقشبندیت آشکار ہوگی، نقشبندی اکابر سے آپ کی والہانہ محبت ہر میلان سے نمایاں ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے محبوب اکابر میں سے ہیں، اُن کا ذکر آجائے تو پرمسرت جنبش پورے جسم پر چھا جاتی ہے، ایک وارفتگی کا سماں ذکر مجدد کا لازمی نتیجہ ہے۔ متوسلین کو راہنمائی عطا کرنا ہو تو حوالہ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا مرغوب ترین حوالہ ہے، تمام سلاسل اولیاء کے عقیدت مند ہیں مگر سلسلہ نقشبندیہ کے غلام ہیں، یہی وجہ ہے کہ اوراد و وظائف کی تلقین سے بڑھ کر شریعت

مطہرہ کی متابعت پر زور دیتے ہیں، آداب شریعت کی پابندی نے انہیں نقشبندیت کا شیدا بنادیا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عقیدت مندانہ وارفتگی تو نام سے عیاں ہے، گفتگو کسی موضوع پر ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر ناگزیر ہے۔ یہ وابستگی کا دوام ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک حرف بھی برداشت نہیں ہے۔ حال ہی میں برطانیہ کی فضاؤں میں تفضیلیت کا خمار اٹھا اور ایک تسلیم شدہ مسئلہ کو معرضِ فساد بنانے کی سعی کی گئی، حیرت ہوتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے فیصلے بھی ذاتی پسند وناپسند کا ہدف بن گئے ہیں، اس فسادِ فکری میں پیر صاحب کی استقامت دیدنی تھی اور ہے، نہ کوئی مصلحت آڑے آئی اور نہ کوئی خلجان سدراہ بنا، افضل البشر بعد الانبیاء ہونے کا یقین اس قدر راسخ تھا کہ اس چوبائی حملے کا پوری جرأت اور ایمان دارانہ اعتماد کے ساتھ مقابلہ کیا حتّٰی کہ حق کا روشن چہرہ روشن تر ہوگیا ایک مسند نشین صاحب سجادہ کی یہ استقامت سب کے لئے مشعلِ راہ ہے، پیر صاحب اس نعرہ مستانہ پر تبریک کے مستحق ہیں کہ عقائد ویقین کے اعتماد کو حوصلہ ملا ہے، النور ٹی وی نے اس حوالے سے شاندار خدمات انجام دی ہیں جس نے پیر صاحب کے ٹی۔ وی چینل کے اجراء کے فیصلے کی توثیق کی ہے۔ راہنمائے قوم کا یہ منصب ہوتا ہے کہ وہ قوم کی صحیح دستگیری کرے۔ پیر صاحب نے اپنے منصب کا حق ادا کر دیا ہے جس پر آپ تحسین کے مستحق ہیں۔

اولاد:

پیر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ بیٹے

دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم پر بھی تسلی بخش دسترس رکھتے ہیں۔ سلطان العارفین جامعہ ازھر سے تعلیم پاچکے ہیں اور ایک باصلاحیت جوان ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ چھوٹا بیٹا نور العارفین ہے جو دینی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہے اور لائق اعتماد علمی صلاحیت کا حامل ہے۔ دونوں صاحبزادے غزنوی مشن کو آگے لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ اس دور میں مسندوں کی ضرورت ہے، جو نیریاں شریف کی مسند کو حاصل ہے۔

ارشادات:

پیر صاحب کی عمومی گفتگو بھی نصیحت افروز ہوتی ہے، آپ کا لہجہ اور آہنگ مسحور کن ہے، موضوع کوئی بھی ہو، بات کہنے اور سامع تک پہنچانے کا ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ خطبات میں توارسال معنی کا وہ اہتمام ہوتا ہے کہ سامع کسی علمی سطح کا بھی ہو گرویدہ ہوجاتا ہے، الفاظ آبشار کی طرح امڈے آتے ہیں، حکایات وروایات تجسیم کی صورت لیتی ہیں۔ درس مثنوی جو اپنی جاذبیت اور اثر آفرینی کے حوالے سے سامعین کے قلوب کو گرماتا ہے اس قدر مقبول ہوا ہے کہ النور ٹی۔ وی کی شناخت بن گیا ہے، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی اشاراتی اور تلمیحاتی گفتگو جس سلیقے سے وضاحت کے مراحل طے کر رہی ہے کہ ہر سننے والا سپاس گزار ہے۔

تبلیغی دوروں میں اجتماعات کا انعقاد ہوتا ہے اور پیر صاحب کے مواعظ حاضرین کی ساعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ ہر گفتگو کسی مقرر موضوع پر ہوتی ہے تفہیم کی ضرورت نظم ونثر کا حوالہ لیتی ہے قرآن وحدیث کا نور ہر گفتگو کا امتیاز ہوتا ہے۔ صالحین کی حکایات موقع کی مناسبت سے بیان ہوتی ہیں کبھی گفتگو اس قدر پھیل جاتی

ہے کہ احساس ہونے لگتا ہے کہ موضوع کے دائرے سے نکل گئ ہے مگر سامعین کو حیرت ہوتی ہے جب اچانک پیر صاحب موضوع پر پہنچ جاتے ہیں اس سے یہ یقین آتا ہے کہ لفظوں نے بہکایا نہیں، پیر صاحب انہیں نہایت دانش مندی سے استعمال کررہے ہیں یہ بارہا دیکھا کہ بیان کا زور بے قابو نہیں ہوا، حقیقت یہ ہے کہ پیر صاحب جو کہنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہتا ہے ۔یہی کسی مقرر کی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ راستوں کی بھول بھلیوں میں گھر کا راستہ نہ بھولے۔

پیر صاحب کا زورِ کلام اور اندازِ گفتگو سماعتوں کے لئے ایک نایاب سرمایہ ہے اس کا درست ادراک وہی کر سکے گا جو آپ کی محفل میں حاضر ہوا ہو۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مادری زبان پشتو ہے مگر اردو اس سلیقے سے بولتے ہیں کہ اہل زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ بعض احباب نے آپ کے ارشادات کو جمع کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ بہتر ہوتا کہ ایک قلمکار شب و روز ساتھ دیتا کہ گفتگو کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا تو اُن اصحاب تک بھی یہ روشنی پہنچ جاتی جو موجود نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر اس حوالے سے کام ہونا تھا نہ ہو سکا۔ تلافی مافات کا اب بھی موقعہ ہے کہ یہ ایک مسند نشین کی گفتگو ہی نہیں نصیحت افروزی کے استعارے بھی ہیں۔

ذوق کی تسکین کے لئے چند ارشادات جو انیس صاحب نے مجھے کئے ہیں درج کئے جا رہے ہیں تا کہ فرمودات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

☼ جب علم و عمل مل جائیں تو علم جذبے دیتا ہے، عمل نشانِ منزل کا پتہ دیتا ہے اور جب تقویٰ نشۂ صبح گاہی دے تو محبوب کی بارگاہ سے آواز آتی ہے "اُدن منی" میرے قریب ہو جاؤ۔

اگر چاہتے ہو کہ شکر کی توفیق ملے تو اپنے سے کمزور پر نظر رکھو، جھونپڑی میں رہنے والوں پر نظر رکھو گے تو شکر کی توفیق نصیب ہوگی اور ارشاد یہ ہے کہ

لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ ۔ (ابراھیم: 7)

شکر سے نعمتوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

☼ ایک سوٹ کے بجائے دس سوٹ سلواؤ مگر پہننے کے بعد نظر عطا کرنے والے پر ہی رہنی چاہیے جو مال بندے اور بندہ نواز کے درمیان حجاب بنے اس سے غربت بدرجہا بہتر ہے جو بھوک تو دیتی ہے مگر دوزخ کی آگ تو نہیں دیتی۔

☼ تصوف اسلام کی روح ہے، نماز کو ہی لیجئے، اچھی طرح وضو کرو، صاف ستھرا پہنو، جگہ صاف ہو اور وقت صحیح ہو، قبلہ رو ہو کر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ ناف پر باندھ لو، رکوع و سجود تمام ارکان کی تکمیل کرو یہ سب لوازمات ہیں، نیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھ رہا ہوں، ظاہری شریعت آپ کو نمازی کہے گی مگر تصوف کہتا ہے کہ جو فعل جس کے لئے ہے اُس کے تصور میں اس قدر گم ہو جاؤ کہ اس کے قلب و روح میں اُتر کر آپ کو سرور کی کیفیت عطا کر دیں، یہ سرور اور یہ قرب کی کیفیت تصوف ہے ارکان کی تکمیل شریعت ہے مگر ان کے نور و سرور کی کیفیت تک رسائی تصوف ہے۔

☼ لوازمات حیات اور مقاصد حیات میں فرق ہے۔ بیوی، بچے، مکان، کاروبار، مال و دولت، عزت و شہرت جاہ و حشمت، یہ سب لوازماتِ حیات ہیں۔ مقاصدِ حیات، وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ۔ (الذریت: 56)

میں بیان ہوئے ہیں لوگوں نے لوازماتِ حیات کو مقاصدِ حیات سمجھ لیا ہے جو ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کرتا وہ کامیاب انسان نہیں ہو سکتا، اولیاء کرام علیھم

الرحمۃ نے ہمیشہ اپنی توجہ مقاصد حیات پر مرکوز رکھی ہے لوازماتِ حیات کے لئے اتنا ہی حکم ہے کہ انسان اتنا کمائے جس سے ضروریات پوری ہوتی رہیں، محتاجی قریب نہ آئے تاکہ صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، صبر وشکر کا مطلب ہے کہ جو مل گیا صبر کرو اور جس کے پانے کی تمنا ہے اُس کے ملنے تک صبر کرو اور یہ مسئلہ وعظ وتقریر سے حل نہیں ہوتا ہاں جس کا دل اللہ کریم اپنی توفیق سے اس طرف پھیر دے یا کسی صاحبِ نظر کی نظر کے نشانے میں آجائے۔

☼ دنیا کی دوستی صرف صحت وتندرستی کی حد تک ہے، انسان محتاج ہو جائے تو دنیا ساتھ چھوڑ دیتی ہے بنیاد مضبوط ہو تو بھی قبر سے آگے رفاقت نہیں، دنیا کی رفاقت، اس کی عزت ووقار ایسا بے وفا ہے کہ انسان معذور ہو جائے تو یہ سب چیزیں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں مگر ذکر وفکر والے انسان کی معیت ایسی نعمت ہے کہ انسان معذور ہو جائے یا اس دنیا سے چلا جائے، عزت وقار پھر بھی ساتھ رہتے ہیں، قبر سے حشر کے میدان تک عزت انسان کے ساتھ رہتی ہے اس کی یہی ایک صورت ہے کہ انسان اپنا دل ودماغ اور سوچ وفکر اپنے مالک سے دور نہ لے جائے، وہ قرب کی ایسی منزل میں رہے کہ مالک سے آشنائی اوّل اور دنیا سے آشنائی درجہ دوم میں رہے۔

☼ اللہ تعالیٰ کو ماننے والوں کے دو طبقے ہیں ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود مان کر عبادت کرتے ہیں، دوسرا طبقہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور محبوب مان کر اُس کی بندگی کرتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، معبود تو وہ شجر وحجر کا بھی ہے، فضا وخلا کا بھی ہے۔ صرف معبود جان کر عبادت کرنا عام روٹین ہے۔ محبوب جان کر عبادت کرنا اور بات ہے۔ اس لئے کہ صرف معبود جان کر بندگی کرو گے تو کبھی

اطاعت کرو گے کبھی بغاوت، کبھی اپنی مرضی کرو گے اور کبھی اُس کی بات پر عمل کرو گے اور جب محبوب جان کر بندگی کرو گے تو اپنا اختیار ختم کر دو گے۔ پھر تمام اختیار آپ کے محبوب کا ہو گا، ایسے شخص کو محبوب کی ناراضگی کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے، محبت کے لئے محبوب کی ناراضگی حجاب ہے اور سب سے بڑا عذاب ہے۔ ایسے لوگ صوفیاء ہیں، اہل تصوف ہیں، تصوف کا سفر سراسر ادب ومحبت کا سفر ہے۔

یہ اور قسم کے متعدد ارشادات متوسلین کو یاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر شروع سے ہی ان ارشادات کو محفوظ کرنے کا اہتمام کر لیا جاتا تو آج اہل محبت کے سامنے ایک روشن شاہراہ ہوتی اور ہر مسئلے کا حل ہوتا، اللہ تعالیٰ پیر صاحب کو عمر دراز عطا فرمائے کہ آپ کی زندگی ایک زندگی کی بقا نہیں لاکھوں انسانوں کے دل کی دھڑکن ہے یقین ہے کہ اس مسند عالی کا فیض جاری رہے گا اور متلاشیانِ رشد وہدایت فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ معتقدین کو اس دربار سے منسلک رہ کر نقشبندیت کے فیضان سے سیراب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ بجاہ النبی الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

طریقت ادب ہی ادب ہے۔ادب کی کئی جہتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ کی نسبت سے ادب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے حوالے سے ادب، مشائخ کے حوالے سے ادب، یہ آداب اس طرح متحقق ہوتے ہیں۔

1- حق تعالیٰ کی نسبت سے ادب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں کمال بندگی کی شرط کے ساتھ اس کے احکام کی تعمیل کرے اور ماسواء سے بالکل منہ موڑ لے۔

2- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ادب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہمہ تن متابعت اور پیروی کا پابند سمجھے اور آپ کو تمام موجودات اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ سمجھے، جو کوئی ہے اور جو کچھ ہے سب کا سر آپ کے آستانِ عزت پر ہے۔

3- مشائخ کے ادب کی نسبت یہ خیال رہے کہ مشائخ کو جو مقام حاصل ہے وہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی وجہ سے .ہے اس لئے اس نسبت کو ملحوظ رکھے۔ (حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ)

''بزرگی سنت کی تابعداری پر وابستہ اور زیادتی شریعت کی بجا آوری پر منحصر ہے مثلاً دوپہر کا سونا جو اس تابعداری کے باعث واقع ہو کروڑ کروڑ شب بیداریوں سے جو اس تابعداری کے موافق نہ ہو۔ اولیٰ اور افضل ہے اور ایسے ہی عید الفطر کے دن کا کھانا جس کا شریعت نے کہا ہے۔ خلافِ شریعت دائمی روزہ رکھنے سے بہتر ہے، شارع علیہ السلام کے حکم پر چیتل کا دینا اپنی خواہش سے سونے کا پہاڑ خرچ کرنے سے بزرگ تر ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ)

Artwork: M. Shakeel Talat